ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the books before taking it out You will be responsible for damages to the book discovered while returning it

DUE DATE

Cl. No. ______ *Acc. No.* ______

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night Book **Re. 1/-** per day.

سہ ماہی

فنون

لاہور

اے ہمنفسانِ محفلِ ما
رفتید ولے نہ از دلِ ما

سچ تو یہ ہے...
ہمارا
نام ہی
ہماری کارکردگی کی
ضمانت
ہے

ٹرانسپورٹ کے مستعد اور موثر نظام سے لیس، ہمارے پیٹرول پمپ اور ذخیروں کا وسیع نیٹ ورک، ملک کے کونے کونے میں پیٹرولیم کی مصنوعات کی مسلسل فراہمی کو یقینی بناتا ہے۔

PSO

پاکستان اسٹیٹ آئل

PID - Islamabad

PARAGON

SHEIKH MUBARAK ALI
MOZ
ROA
LAHORE-PAKISTAN

Accession Number
Date

عالمی معیار کے واحد
پاکستانی لیدر مینوفیکچررز

ظہور سانچو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

پلاٹ نمبر ۴۶، سیکٹر ۷۔ اے، کورنگی انڈسٹریل ایریا
پوسٹ بکس ۵۳۶۷ کراچی
فون۔ ـــــــ ۹۰ـ۵۰۶۱۷۸۶
فیکس ـــ ۵۰۶۰۳۴۳ ـــ ۲۱ ـــ ۹۲
ٹیلیکس۔ ۲۳۸۵۴ نورپاک
کیبل : ALLAKAFI
ALLAKAFI KARACHI

Sunflo

[illegible] Limited

Introduces

SunRipe

100% Pure Orange Juice

First time ever in Pakistan ... a packful of refreshing, naturally sweet, sun-ripened orange juice. Produced with the latest technology under highest hygiene and quality control standards.

Rs.39 only

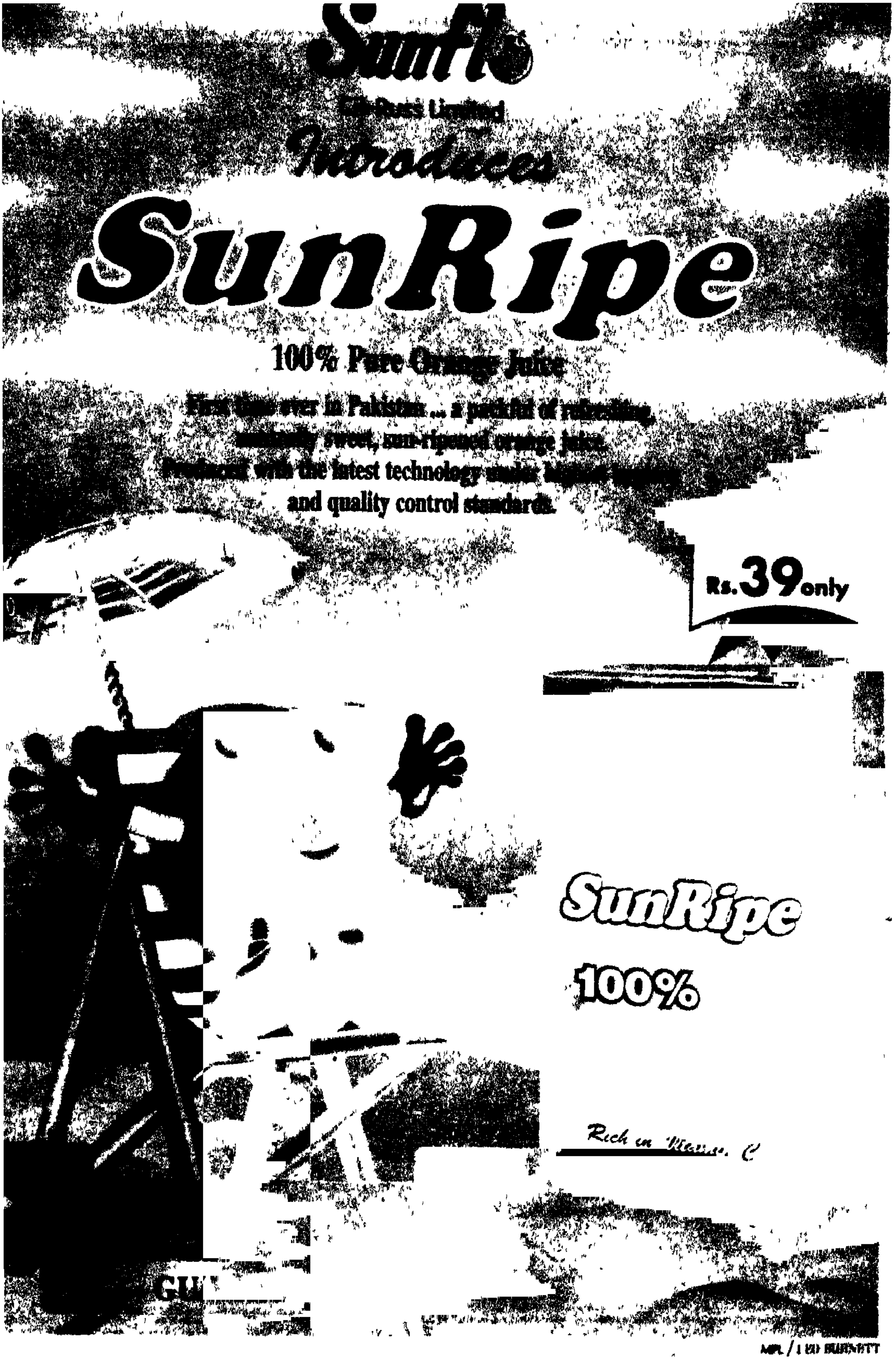
SunRipe
100%
Rich in Vitamin C
GU

MPL / LEO BURNETT

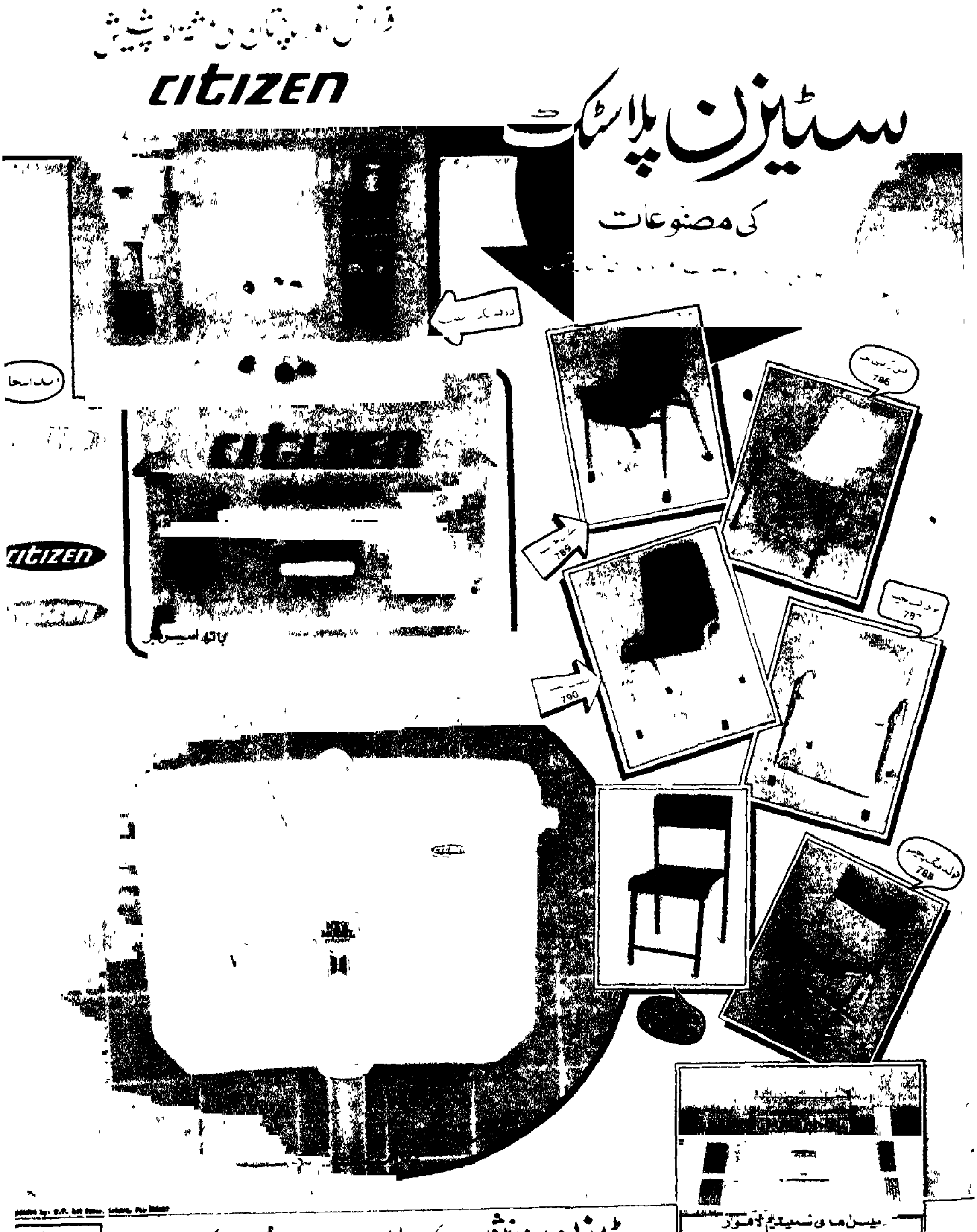
CITIZEN
سٹیزن پلاسٹک
کی مصنوعات
CITIZEN
CITIZEN
786
789
790
787
788

سٹیزن انڈسٹریل پلاسٹک انڈسٹریز جی ٹی روڈ۔ گوجرانوالہ

سٹیزن پلاسٹک سٹیل فرنیچر 17۔ میکلوڈ روڈ لاہور فون 220355 — یونس سٹیل مارکیٹ اڈا گوندلانوالہ گوجرانوالہ فون۔ 82323

اعلیٰ معیار کے حامل

انڈسٹریل ہوزز **HOSES**

اور

دیگر ربڑ کی مصنوعات

(ہوزز برائے پانی، ہوا
تیل، سٹیم اور گیس)

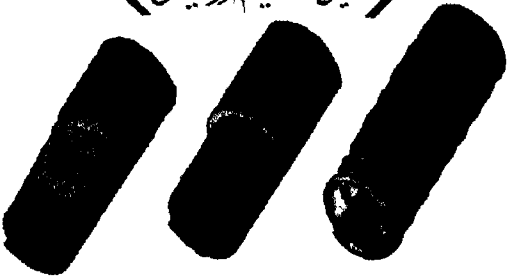

سکشن ہوزز　　ریڈیٹر ہوزز　　ڈلیوری ہوزز

دیگر مصنوعات

دروازوں اور کار کے میٹ ۔ ربڑ کورڈ رولر ۔ ٹینک اور پائپ لائننگ
ربڑ اور انسرشن شیٹ ۔ مولڈڈ مصنوعات ۔ ریڈی ایٹر ہوزز
اور سائیکل ٹائر و ٹیوب

ڈارسن

ڈارسن ربڑ ورکس

وزیرآباد پی او بکس نمبر ۵۔ فون ۲۱۷۱-۲۱۳۹۔ ٹیلیکس ۴۵۹۵۔ ہماپی کے

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۵۶۹

فون : ۶۳۱۵۷۶۳

سہ ماہی فنون لاہور

مدیر

احمد ندیم قاسمی

مدیر منتظم

منصورہ احمد

تزئین کار

مُوجد

شمارہ : ۴۶

جنوری — اپریل ۱۹۹۶ء

دستی : ۳۰۰ روپے

بذریعہ رجسٹری : ۳۵۰ روپے

ممالکِ غیر کے لیے : ۱۵۰۰ روپے

قیمت موجودہ شمارہ -/۸۰ روپے

مقامِ اشاعت : ۴۵ - اے مزنگ روڈ - لاہور

SV02 166916 2.9.96

مندرجات

حرف اوّل	ندیم	۱۰

محشر بدایونی

چہرہ تراشی کھیل نہیں ہے (محشر کی شاعری)	شبنم رومانی ،	۱۲
محشر بدایونی	حمایت علی شاعر ،	۱۴
محشر کی غزل	ندیم ،	۲۳
محشر کی غزلوں کا انتخاب		

ظہیر کاشمیری

۔۔فصل جنوں کے آتے آتے (ظہیر کی یاد میں)	صلاح الدین حیدر ،	۳۲
ظہیر کاشمیری ۔ ایک قد آور شاعر	ندیم ،	۳۵
ظہیر کی غزلوں کا انتخاب		۳۷
چراغ آخر شب ۔ ظہیر کاشمیری کی یاد میں	مشتاق شاد ،	۴۲
ظہیر کی یاد میں	احمد ظفر ،	۴۳
ظہیر کی رحلت پر	گفتار خیالی ،	۴۳
ظہیر کی نذر	احمد فقیہہ	۴۴
غزل ، ظہیر کی زمین میں	سید علی عباس جلالپوری	۴۴

پروین شاکر

پروین کی شاعری	قیصر تمکین	۴۵
پروین شاکر ۔ دی فلاور چائلڈ	پروین قادر آغا ،	۶۵
سنڈریلا نے کوچ کیا	نجم الحسن رضوی ،	۶۸
پروین ۔ تمنا کی استقامت	ندیم ،	۷۰
پروین کی غزلوں کا انتخاب		۷۳
پروین کے نام	شبنم رومانی ،	۸۷
پروین کی یاد میں	قتیل شفائی ،	۸۸
پروین کی موت پر	"انتخاب عالم" ،	۸۸
اے لب احمریں	عرفانہ عزیز ،	۸۹
سخن آباد (پروین کے لیے)	نجیب احمد ،	۹۰
پروین کے نام	شاہدہ حسن ،	۹۲
پروین کی یاد میں	احسان اکبر ،	۹۳
تاریخ وفات	محسن بھوپالی ،	۹۳
اے عمو کی بیٹی !	ناہید قاسمی ،	۹۴
پروین شاکر کی نذر	ا ۔ سنبل ،	۹۵
عجلت پسند نقاد سے	تصدق شعار ،	۹۵
پروین کے لیے	منظر حسین اختر ،	۹۶
پروین کی نذر	جاوید حیات ،	۹۶

ممتاز مفتی

ممتاز مفتی	احمد بشیر ،	۹۷
ممتاز مفتی کے خطوط ۔ ندیم کے نام		۱۰۲

احمد داؤد

احمد داؤد ۔ "لا" کا ادراک	خاور نقوی ،	۱۰۵
احمد داؤد کے لیے نوحہ	حسن عباس رضا ،	۱۰۸
احمد داؤد کے نام	نثار ترابی ،	۱۰۹

احسن احمد اشک

احسن احمد اشک سے ایک گفتگو	کنیز بتول ،	۱۱۰
غزل	احسن احمد اشک ،	۱۱۵
غزل	احسن احمد اشک ،	۱۱۵

محسن نقوی

محسن نقوی کا فن	ندیم	۱۱۶
تمھیں کیا	محسن نقوی	۱۱۸
غزل	محسن نقوی	۱۱۹

غزل	محسن نقوی ،	۱۱۹

صمد انصاری

صمد انصاری کی غزل	ندیم ،	۱۲۰
صمد انصاری کا آخری خط، ندیم کے نام		۱۲۲
غزل	صمد انصاری ،	۱۲۵
غزل	صمد انصاری ،	۱۲۵

دلدار پرویز بھٹی

کچھ دلدار پرویز بھٹی کے بارے میں	امجد اسلام امجد،	۱۲۶
دلدار کی یاد میں	ماجد صدیقی ،	۱۲۸
دلدار کے لیے ایک نظم	ایوب خاور	۱۲۹

اوپندر ناتھ اشک

غزل	اوپندر ناتھ اشک،	۱۳۰
غزل	اوپندر ناتھ اشک،	۱۳۰

سید یٰسین قدرت

اس نے مجھ سے کہا	سید یٰسین قدرت،	۱۳۱

پروفیسر احمد علی

پروفیسر احمد علی - حیات و خدمات	محمد کامران ،	۱۳۲

اختر حسین جعفری

اختر حسین جعفری کے لیے	احسان اکبر ،	۱۳۷

ایوب صابر

وہ سائباں کہاں گیا	شجاعت علی راہی،	۱۳۸

رضا ہمدانی

غزل	رضا ہمدانی	۱۳۹
رضا ہمدانی کے لیے	عبداللہ یزدانی	۱۳۹

مقالات

مجذوب فرنگی - ۵	محمد ارشاد	۱۴۰
پانچ جدید شاعر - ایک خط	ساقی فاروقی ،	۱۴۸
نیطشے اور محمد ارشاد	غلام قادر آزاد،	۱۵۲
گوپی چند نارنگ کی ساختیات شناسی	وہاب اشرفی،	۱۵۷
تحقیق و تنقید - منظر نامہ	ڈاکٹر نجیب جمال،	۱۶۵
"باعث تحریر آنکہ" - ایک جائزہ	ظفر اقبال احمد،	۱۷۴

نظمیں

حمد	احمد ندیم قاسمی،	۱۸۱
نامکمل سوانح حیات (۳)	شمس الرحمن فاروقی،	۱۸۲
مجھے اس آگ میں منڈیلا نظر آتا ہے	جان شکرئی ، ترجمہ. کشور ناہید	۱۸۷
دیوار کی بخیہ گری	رابرٹ فراسٹ، ترجمہ. کشور ناہید	۱۸۸
تماشا	توصیف تبسم ،	۱۹۰
تمہیں جانے کی جلدی تھی	ایوب خاور ،	۱۹۱
خبر ہے	گلزار ،	۱۹۲
کون مصلوب کرے	یحییٰ خالد ،	۱۹۲
ایک ناگفتہ دعا	سید مبارک شاہ،	۱۹۳
ہر طرف آگ ہے	کاوش عباسی،	۱۹۳
سارا دن	ڈاکٹر وحید احمد،	۱۹۴
ایک تخریب کار نے کہا	فرزانہ رضوی،	۱۹۵
گولیاں	فرزانہ رضوی،	۱۹۵

درخواست اعجاز رضوی ، ۱۹۶
قائداعظم کے لیے اعجاز رضوی ، ۱۹۶
ہوا کے سوال سعید احمد ، ۱۹۷
مجھے نزدیک آنے دو اقبال حیدر ، ۱۹۸
چار نظمیں رخسانہ شمیم ، ۱۹۹
چار نظمیں محسن شیخ ، ۲۰۰
انتباہ شہزاد اظہر ، ۲۰۱
نقاد شہزاد اظہر ، ۲۰۱
میں کہاں جاؤں گا افتخار بخاری ، ۲۰۲
فرصت ہی نہیں ملتی افتخار بخاری ، ۲۰۲
ستاروں نے کہا افتخار بخاری ، ۲۰۳
میں مکمل ہوئی تو — راشدہ کامل ، ۲۰۳
علم کا حوالہ نظیر اختر ، ۲۰۴
کلاس روم فرخ یار ، ۲۰۵
ہمزاد توصیف خواجہ ، ۲۰۶
سہراب شہاب صفدر ، ۲۰۷
تین نظمیں ارشد نعیم ، ۲۰۸
ہیر رانجھا محمد حنیف ، ۲۰۹
کانٹے کے لیے ایک نظم انیل چوہان ، ۲۱۰
حوالے مٹ نہیں سکتے ناہید قمر ، ۲۱۱
خواہش ایک سوال مقصود وفا ، ۲۱۲
تین نظمیں ارشد لطیف ، ۲۱۳
تنہا سید عباس احمد ، ۲۱۴
یہ عالم خواب کا ہے غافر شہزاد ، ۲۱۴

افسانے

طوق محمد سعید شیخ ، ۲۱۵
فصل گلزار ، ۲۲۰
حکیم جی حمید قیصر ، ۲۲۴
ایک ننھی چڑیا فرحت پروین ، ۲۲۸
گرفت محمد حمید شاہد ، ۲۳۳
کھڑکی عرفان احمد عرفی ، ۲۳۸
کنتری نسرین قریشی ، ۲۴۳
خودنگری فوزیہ چودھری ، ۲۴۷
زنگاری نگہت سلیم ۲۵۱
چیروالا احمد ندیم قاسمی ، ۲۵۵

انشائیہ

یگانگت کی قوس قزح مشکور حسین یاد : ۲۶۱

غزلیں

ضیا جالندھری ، ۲۶۴
بیدل حیدری ، ۲۶۵
گوہر ہوشیارپوری ، ۲۶۶
محب عارفی ، ۲۶۷
آفتاب اقبال شمیم ، ۲۶۸
توصیف تبسم ، ۲۶۹
ظفر اقبال ، ۲۷۰
ساقی فاروقی ، ۲۶۶
بیدل حیدری ، ۲۶۷
گوہر ہوشیارپوری ، ۲۶۸
محب عارفی ، ۲۶۹
آفتاب اقبال شمیم ، ۲۷۰
خلیق احمد خلیق ، ۲۷۱
ظفر اقبال ۲۷۲

ن ایلیا ، ۲۷۳
ضیٰ برلاس ، ۲۷۴
ن احسان ، ۲۷۵
بدصدیقی ، ۲۷۶
یق سلیمی ، ۲۷۷
یع ضامن ، ۲۷۸
فاق حسین ، ۲۷۹
در سلیم سیال ، ۲۸۰
ت حسین کاظمی، ۲۸۱
اب حیدر نقوی، ۲۸۲
ضیائی ، ۲۸۴
کوثر ، ۲۸۵
ان سکون ، ۲۸۶
خلیلی ، ۲۸۷
کنجاہی ، ۲۸۸
ش بٹ، ۲۹۰
مغل ، ۲۹۱
خاور ، ۲۹۲
تابش، ۲۹۳
بخاری ، ۲۹۴
شاکر اعوان، ۲۹۵
حمد ، ۲۹۶
جاوید ، ۲۹۷
زشاہ ، ۲۹۸
گل ۲۹۹

مرتضیٰ برلاس ، ۲۷۴
محسن احسان ، ۲۷۵
ماجد صدیقی ، ۲۷۶
شفیق سلیمی ، ۲۷۷
شفیع ضامن ، ۲۷۸
اشفاق حسین ، ۲۷۹
صفدر سلیم سیال ، ۲۸۰
مشکور حسین یاد ، ۲۸۱
ثاقب عرفانی ، ۲۸۲
خالد احمد ، ۲۸۳
پروفیسر افضل علوی ، ۲۸۴
سلیم کوثر ، ۲۸۵
رشک خلیلی ، ۲۸۷
روحی کنجاہی ، ۲۸۸
شوکت ہاشمی ، ۲۸۹
کاوش بٹ ، ۲۹۰
افتخار مغل ، ۲۹۱
ایوب خاور ، ۲۹۲
عباس تابش، ۲۹۳
افتخار بخاری ، ۲۹۴
ڈاکٹر اشرف عدیل، ۲۹۵
سعید احمد ، ۲۹۶
اشرف جاوید ، ۲۹۷
محمد فیروز شاہ ، ۲۹۸
یاسمین گل ۲۹۹

ثروت محی الدین، ۳۰۰ تصدق شعار ، ۳۰۰
ابرار احمد ، ۳۰۱ سید عباس احمد ، ۳۰۲
جمشید چشتی ، ۳۰۲ آصف محمود باسط ، ۳۰۳
آصف محمود باسط ، ۳۰۳

اختلافات

محمد ارشاد، شہزاد منظر، خاور نقوی، شعیب آفریدی،
آصف ثاقب، رشید ملک، ارشد عروج، احمد حسین مجاہد،
محمد اشفاق، خیر الدین انصاری۔ ۳۰۴

تبصرے

اشارئیے (محمد علی صدیقی) ڈاکٹر ممتاز احمد خان، ۳۲۷
برگ و شبنم
بزیر شاخ گل (سید منیرا) شفیق الرحمٰن ، ۳۲۹
فسانہ کہیں جسے (عاشور کاظمی) مشکور حسین یاد، ۳۲۹
گھر کی تلاش (سجاول خان) ڈاکٹر عطش درانی،
تعلیمی مثلیں (انعام الحق کوثر) محمد اسعدی ، ۳۳۴
سیرت پاک کی خوشبو (انعام الحق کوثر) محمد انور ، ۳۳۷
جدائی راستوں کے ساتھ (نصیر احمد ناصر) داؤد رضوان، ۳۴۰
تھکن (نزہت گردیزی) داؤد رضوان ، ۳۴۲
ناصر کاظمی ـــ شخصیت اور فن ڈاکٹر توصیف تبسم، ۳۴۴
(ناہید قاسمی)
آدمی غنیمت ہے (انیس شاہ جیلانی) احمد ندیم قاسمی، ۳۴۶

سرورق ـــــــ موحد

حرفِ اوّل

ندیم

قارئین "فنون" نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ "فنون" کی اشاعت میں اتنے طویل وقفے کیوں وارد ہو رہے ہیں۔ اپنی مجبوریوں کو بار بار دہرانا بھی بھلا نہیں لگتا اس لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ قارئین "فنون" کی معذرت قبول کریں۔ "فنون" کی گزشتہ ۳۳ برس کی تاریخ گواہ ہے کہ قارئین نے ہماری مسلسل کوتاہیوں کے باوجود، ہماری معذرت قبول کر لی ہے۔

شمارہ نمبر ۴۶ کو محشر بدایونی، ظہیر کاشمیری اور پروین شاکر کی یادوں کے لیے وقف کر دینے کا ارادہ تھا مگر پروین کی وفات کے بعد تادمِ تحریر، کئی اہلِ قلم اور اہلِ فن بزمِ حیات سے اٹھ گئے (اس دوران میں کراچی سے ایک اہم شاعر صہبا اختر، بمبئی سے اردو نظم کے ایک بڑے شاعر اختر الایمان اور ایک نامور صحافی خاتون محترمہ رضیہ بھٹی (مدیرہ "نیوز لائن") کی رحلت کی خبریں بھی ملیں) چنانچہ سبھی مرحومین کے بارے میں مضامین، مرثیوں اور نوحوں کو محدود کر دیا گیا۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایک برس کے طویل وقفے میں وہ بیشتر مضامین اور نوحے دوسرے رسالوں، اخباروں اور کتابوں میں شائع ہو گئے جو "فنون" کو بھجوائے گئے تھے۔ اس کے باوجود اس شمارے میں مرحومین کا تذکرہ ۱۴۰ صفحات پر محیط ہے۔

اس مدت میں جو شخصیات رخصت ہو گئیں ان میں مولانا حامد علی خاں بھی شامل ہیں جو نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ مدیرِ رسالہ "ہمایوں" کی حیثیت سے انہوں نے جدید ادب کی اشاعت میں بھرپور کردار ادا کیا۔ انجم فوقی بدایونی، خورشید حسن میر، اختر لکھنوی، محمود شارب اور شیدا کاشمیری بھی معروف شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ نشاط فاطمہ ایک نامور افسانہ نگار اور نسیم حجازی ایک مقبول ناول نگار بھی ان جانے والوں میں شامل ہیں۔ جلیل قدوائی، ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی، ڈاکٹر محمد عارف، پروفیسر اعجاز (ایرک) سپرین اور صادق قریشی نے اپنے اپنے پسندیدہ موضوعات پر بہت خوبی سے لکھا۔ منظر علی خاں مزاح نگار تھے، اسد جعفری شروع میں اداکار تھے مگر پھر جرنلزم کا پیشہ اختیار کیا۔ پنجابی شاعر سلطان محمود آشفتہ اور پنجابی کے [illegible] پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اور افسانہ نگار

ں سعید کے انتقال کی خبریں ملیں۔ سلطان راہی، محمد یوسف اور فخری احمد کے سے فلم اور ٹی وی کے روں کے علاوہ طبلہ نواز استاد شوکت حسین، پیانو نواز ماسٹر صادق، گلوکار مسعود رانا اور منیر حسین اور معیار کے خوشنویس عبدالواحد نادر القلم بھی راہی ملک بقا ہوئے۔

ان مرحومین کے فن اور شخصیت کے بارے میں آئندہ مضامین کا سلسلہ جاری رہے گا۔ موجودہ ے میں ان کے لیے جو صفحات مخصوص کئے گئے ہیں، ان کی حیثیت "فنون" کی طرف سے ان رخصت ہو ، والے کے ساتھ اظہار محبت و عقیدت کی ایک عاجزانہ کوشش ہے۔

اس ایک برس کے دوران میں "فنون" کے مدیر اور مدیر منتظم کو بعض نجی سانحات کا بھی سامنا رہا۔ ۱۹۹۴ء پروین کی حادثاتی رحلت کے چند ماہ بعد مدیر "فنون" کی بیٹی نشاط، نہایت معمولی تکلیف کے علاج لسلے میں ایک ڈاکٹر کی ناتجربہ کاری کی بھینٹ چڑھ گئی۔ چند ہفتے بعد قریب قریب ایسے ہی حالات میں عزیز بابر اور بہن خدیجہ مستور کی بیٹی کرن اسلام آباد میں چل بسی۔ اس کے بعد مدیر منتظم کا ایک نوجوان خالہ عائی ابراہیم پاشا، جس کی تین ماہ قبل اسلام آباد میں شادی ہوئی تھی، ایک دو روز کی علالت کے بعد آباد کے ایک کلینک میں راہی ملک عدم ہوا۔ احباب نے ان چاروں اموات پر نہ صرف محبت بھرا اظہار ی کیا بلکہ بعض شاعر دوستوں نے رلا دینے والے نوحے بھی لکھے۔ پروین تو خیر شاعرہ تھی سو اس کے و بیسیوں نوحے لکھے گئے ان میں سے چند ایک اس شمارے میں نذر قارئین ہیں۔ باقی عزیزوں کے ، میں، خاص طور پر نشاط اور کرن کے لیے جو نوحے بھجوائے گئے، انہیں "فنون" میں شامل کرنا اس لیے ب نہیں سمجھا گیا کہ "فنون" کوئی نجی مجلہ نہیں ہے۔ یہ ایک قومی رسالہ ہے اور اسے ذاتی مسائل و ب سے ہمیشہ الگ رکھا گیا ہے۔ ان سطور کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان دوستوں اور کرم فرماؤں کا دل کی یوں سے شکریہ ادا کیا جائے جنہوں نے ہمارے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ کر اتنے بھرپور نوحے بھجوائے۔

ہم کوشاں رہیں گے (اور قارئین دعا کرتے رہیں) کہ آئندہ "فنون" کی اشاعت میں اتنی قابل ں اور مایوس کن تاخیر نہ ہو۔ آئندہ شمارہ (نمبر ۴۷) طباعت کے لیے تیار رکھا ہے۔ تازہ شمارے کی ت کے ایک ماہ بعد شمارہ نمبر ۴۷ بھی، انشاء اللہ، آپ کے ہاتھوں میں ہو گا۔

ایک معذرت ضروری ہے۔ مدیر "فنون" اپنی تحریریں ہمیشہ متعلقہ شعبے کے آخر میں درج کرتا ہے دسرے احباب کو تقدیم و تاخیر کی شکایت نہ ہو مگر اب کے حصہ نظم کا آغاز مدیر ہی کے کلام سے ہو رہا راس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کلام حمدیہ ہے اور حمد کو سب سے آخر میں درج کرنا مناسب نہیں تھا۔

چہرہ تراشی کھیل نہیں ہے — محشر بدایونی کی شاعری

شبنم رومانی

شعر اگر شعور سے مشتق ہے تو یہ ہر موزوں طبع کے بس کی بات نہیں ہے۔ ماضی کے علم، حال کے فہم اور مستقبل کے ادراک سے ہی شعور راہ پاتا ہے۔ وہ لوگ جو ماضی میں کھوئے رہتے ہیں، یا حال پر احتجاج کرتے رہتے ہیں، یا مستقبل کے خواب دیکھتے رہتے ہیں، ہمیشہ ادھورے پن کا شکار رہتے ہیں — وقت کی ان تینوں جہتوں کو، اور ان جہتوں کے تاریخی، تہذیبی، ذہنی اور حسی تجربات کو جوڑنے سے ہی شعر اور شعور کی اکائی وجود میں آتی ہے۔ یہی اکائی محشر بدایونی کے کلام کا سب سے بڑا حوالہ ہے۔

محشر صاحب سے میرے مراسم ۴۸ برسوں پر محیط تھے۔ میری ان کی پہلی ملاقات بدایوں کے ایک بڑے مشاعرے میں ہوئی تھی، ج
کے مہتمم فنا لودھی تھے۔ محشر صاحب ان دنوں ماہنامہ "خاتونِ مشرق" دہلی کے مدیر اعزازی تھے۔ پھر اس ملاقات کی تجدید ۱۵۰
میں ہوئی جب میں شاہجہاں پور سے ہجرت کر کے کراچی پہنچا۔ محشر صاحب نے دلی سے کراچی تک، ۹۶-ایف، اے سینیا لائنز سے
"برگ و بار" نارتھ ناظم آباد تک، لحنِ داؤدی سے تحت اللفظ تک، اور تغزل سے تفکر تک کا فاصلہ بڑے اعتماد کے ساتھ طے کیا
ان کی کردار سازی میں ان کی بڑی بہن اور تصویر حسین حمیدی کی والدہ محترمہ رفیق فاطمہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ اُن کی اپنی تہذیب، نظامی پریس کے مالک
اور ہفت روزہ "ذوالقرنین" کے مدیر حضرت نظامی بدایونی کی قربتوں میں ہوئی تھی۔ محشر صاحب کو دو خوبیاں اپنے والد ماجد حضرت مو
بدایونی سے ورثے میں ملی تھیں — ایک حسِ مزاح، دوسرے تاریخ گوئی — حضرت مورخ کمال کا مادۂ تاریخ نکالتے تھے۔ ۱۸
میں انہوں نے اپنے پوتے اور معروف شاعر نیاز بدایونی کی شادی کے موقع پر ناقابلِ فراموش تاریخ نکالی تھی۔ مصرعِ تاریخ یہ ہے کہ

آج ہے شادی، کل ہے رخصت، نویں مہینے بچہ ہوگا

محشر صاحب نے بھی بے حد و حساب اور بے ساختہ تاریخیں نکالیں۔ حفیظ ہوشیارپوری کے بعد وہ پاکستان کے
سے بڑے "تاریخ ساز" تھے — مگر اب جبکہ وہ خود اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں، دیکھنا ہے کہ ان کے شایانِ شان کون ان کی تار
نکالتا ہے!

محشر صاحب تو حشر اُٹھا کر چلے گئے ؏

اب ہم ہیں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو

محشر صاحب کا شمار "شہرِ آرزو" کے اشراف میں ہوتا تھا۔ شاعری اُن کا میڈیم ہی نہیں، ان کا ایڈیم بھی تھی۔ وہ محاور
کے شاعر نہیں تھے، مگر ان کو شاعری کا ایسا محاورہ تھا کہ مرتے مر گئے کبھی بوڑھے نہیں ہوئے — اُن کی شاعری میں کبھی گیپ نہ
آیا، بلکہ جنریشن گیپ بھی کبھی نہیں آیا۔ کیفے ٹیریا کے بوڑھوں اور کافی ہاؤز کے نوجوانوں سے ان کا رابطہ مسلسل اور متوازی رہا۔

محشر صاحب اپنی غزل میں جگہ جگہ "ہنر" اور "کارِ ہنر" پر زور دیتے رہے، کیوں کہ وہ شاعری کو جز وقتی چیز، شہرت اور تفریح کا ذریعہ، یا کسبِ معاش کا اوسط نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اس کو ایک "مکمل فن" کے طور پر وظیفۂ حیات بنائے ہوئے تھے۔ کوئی بھی فن ہو، پوری زندگی کی بھینٹ چاہتا ہے، اس سے کم پر راضی نہیں ہوتا۔ محشر صاحب کی شاعری کے باب میں بے حد حساس، سنجیدہ اور چوکس تھے۔ انہوں نے شاعری کو کبھی ڈھیل نہیں دی۔ اہلِ ہنر کا قلم ہی نہیں لکھتا انگلیاں بھی بولتی ہیں۔ شاعری صرف آسمان سے نہیں اُترتی، زمین سے بھی پھوٹتی ہے، بلکہ کئی جہتوں سے حملہ آور ہوتی ہے۔ یہ ایک بہت پیچیدہ تخلیقی عمل ہے۔ باطن کے عُمق سے ظاہر کے اُفق تک لکیر کھینچ دینا ہی "کارِ ہنر" ہے۔ اور محشر صاحب نے اِس ہفت خواں کو بہ طریقِ احسن طے کیا ہے ؎

زخمۂ تارِ سنگ ہُنر سے، زخم رفو ہو جاتے ہیں
چہرہ تراشی کھیل نہیں ہے، ہاتھ لہو ہو جاتے ہیں

"چہرہ تراشی" کے اس جان لیوا کھیل میں، یہ نکتہ بطورِ خاص توجہ طلب ہے کہ فکر و خیال کی تمام ندرت اور تازگی کے باوجود محشر بدایونی کی غزل کا بانکپن کلاسیکی بنیادوں پر قائم ہے۔ وہ ان نام نہاد جدت طرازوں میں سے نہیں تھے جو خوبصورت الفاظ کو اغوا کر کے، ان کو مِن گھڑت علامتوں کی رسّیوں سے جکڑ دیتے ہیں اور پھر ان پہ ہر طرح کا تشدد روا رکھتے ہیں۔ محشر صاحب کا اسلوبِ اظہار نہایت شفّاف ہے اور اُن کا خیال اُن کے پیمانوں میں آبِ حیات کی طرح چھلکتا ہے۔

خوش شکل، خوش لباس، خوش مزاج، خوش گو اور خوش خوراک محشر بدایونی پانچویں دہائی تک ہلکی پھلکی غزلیں کہا کرتے تھے، یکن چھٹی دہائی کے اوائل میں ان کے ہاں ایک اہم موڑ، ایک تازہ غزل کے ایک تازہ شعر کے ساتھ آیا ؎

نہ جاؤ گھر کے شب افروز روزنوں پہ، کہ لوگ
دیا مکان میں جلتا بھی چھوڑ جاتے ہیں

دوسرا موڑ اُن کی شاعری میں اُس وقت آیا جب ہجرت کرنے والوں پر عزتِ نفس اور شہرِ روزگار کے دروازے بند کیئے جانے لگے —— ہجرت کی شاعری تو بہت ہوئی ہے اور اب بھی ہو رہی ہے، مگر محشر صاحب کے ہاں "ہجرت" کا تھیسس مقامی ہونے کے ساتھ ساتھ آفاقی ہی تھا۔ اُنہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اِس زہر کو اپنے رگ و پے میں اُتار کر لکھا ہے ؎

ہم خس و خاشاکِ آوارہ، گزرگاہوں کا بوجھ
رقص کرنے تیرے کُوچے کی ہوا میں آئے ہیں

یوں محشر صاحب ایک طرف انسانیت کا درد آشوب لکھ رہے تھے تو دوسری طرف ہجرت کا شہر آشوب بھی تخلیق کر رہے تھے۔ ہجرت ل سے انسان کا مقدر رہی ہے اور تاریخِ انسانی، از آدم تا ایں دم، اس ابتلا سے خالی نہیں رہی —— آج بھی پوری دنیا میں ستائے ہٹے انسانوں کے قافلے، پہاڑوں سے سر ٹکراتے، اور میدانوں میں دھول اُڑاتے پھر رہے ہیں۔ روئے زمیں پر حشر کا سا عالم ہے۔ اقت نے ضمیر اور دلیل کا گلا دبا رکھا ہے، اور ظلم نے نئی "بوطیقہ" ایجاد کر لی ہے۔ ایسے میں محشر کی شاعری اور بھی اہمیت اختیار کر جاتی ہے ؎

بول میں رس نہ سہی، لہجے میں نرمی نہ سہی
کچھ تو ہے بات، جو ٹھہرے ہیں یہ محشر تیرے

حقیقت یہ ہے کہ محشر صاحب کے یہ شعر اب شہر در شہر اور ملک در ملک پھیل چکے ہیں —— اور وہ خود تاریخِ غزل کا حصہ بن لے ہیں —— اور یہ سودا اُنہوں نے پوری زندگی دے کر چکایا ہے —— ہماری صفوں میں محشر صاحب کا یوں اچانک اُٹھ جانا پوری اُردو دنیا سوگوار کر گیا ہے مگر اس لمحۂ نامسعود کے لئے وہ اپنا تعزیتی شعر خود ہی کہہ گئے ہیں ؎

شہر میں اِس سے پہلے نہ دیکھی کبھی
وہ اُداسی جو اب ترے جانے سے ہے

محشر بدایونی

(اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں)

حمایت علی شاعر

بعض اوقات شعر کی شہرت آگے نکل جاتی ہے اور شاعر پیچھے رہ جاتا ہے۔ شاعری کے میدان میں محشر صاحب کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

پژمردگی گل پہ ہنسی جب کوئی کلی
آواز دی خزاں نے کہ تو بھی نظر میں ہے

یہ شعر جب سارے ہندوستان میں گونج رہا تھا تو دکن کے بہت کم لوگ جانتے تھے کہ شاعر کا نام محشر بدایونی ہے۔

فانی بدایونی جب حیدر آباد دکن میں آ بسے تھے تو اہل دکن کو بدایوں بھی، دکن ہی کا ایک شہر محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ اور بات کہ فانی نے اپنے تجربات کی روشنی میں ایک نئی حقیقت فاش کی تھی۔

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

اس شعر کا پس منظر صدق جائسی کی کتاب "دربار در بار" کے مطالعے کے بعد کھلتا ہے۔ صدق جائسی عثمانیہ انٹر میڈیٹ کالج اورنگ آباد میں میرے استاد رہے تھے۔ محشر صاحب کا یہ شعر میں نے پہلی با انہیں کی زبانی سنا تھا۔

۴۸ء میں جب میں دکن ریڈیو حیدر آباد سے متعلق ہوا تو بدایوں اور بھی میرے قریب آگیا۔ علام حیرت بدایونی حیدر آباد ہی میں قیام فرما تھے۔ ان کی صاحبزادی جیلانی بانو بحیثیت افسانہ نگار نمایاں ہو رہ تھیں۔ واجدہ تبسم کی بھی ابھی ابتدا تھی۔ علامہ حیرت کے برادر نسبتی ریاض فرشوری میرے دوستوں می تھے۔ اسی دن اطلاع ملی کہ بدایوں کا یہ گھرانا، ایک ماہنامہ "چراغ" نکالنے والا ہے۔ ہماری قربتیں اور بڑ گئیں۔ گویا ہم بھی بدایوں میں آ گئے۔

شکیل بدایونی، ادا بدایونی اور منور بدایونی کے نام ویسے بھی سن رکھے تھے۔ شکیل کے فلمی نغمے بہ مشہور تھے، ادا بدایونی (ادا جعفری) اردو کی پہلی شاعرہ تھیں جنہوں نے اپنے نسائی تشخص کا احترام کیا۔ اور من

بدایونی کے نعتیہ اشعار علامہ حیرت سناتے رہتے۔ ایک دن بر سبیل تذکرہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دلاور فگار بھی بدایوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان حضرات کے درمیان محشر بدایونی کا نام کہیں نہیں تھا۔

جب کبھی کوئی بڑا شاعر دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو یہ بحث اکثر چھڑ جاتی ہے کہ اس کا جانشین کون ہو گا۔ فانی کے بعد بزرگ شعراء میں علامہ حیرت ہی تھے مگر وہ اس منصب کے کبھی آرزو مند نہ ہوئے۔ منور بدایونی نعت گو تھے اور شکیل کو (بقول کسے) فلم نے خراب کر دیا تھا۔ ایک بار دوران گفتگو علامہ حیرت نے بڑے یقین و اعتماد کے ساتھ ایک نام لیا ---- محشر بدایونی! اور پھر ان کی اسی غزل کے اشعار سنائے جس کا ایک مشہور شعر میں نے شروع میں لکھا ہے۔ یہ مشہور شعر سن کر تو ہم سب حیران رہ گئے۔ یہ شعر محشر کا ہے!!

موضوع نیا نہیں تھا مگر لہجہ نیا تھا۔ اس کے ڈرامائی انداز نے اسے اور بھی پر کشش بنا دیا تھا۔ اس غزل کے ایک اور شعر نے بھی مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا:

یک قطرہ خوں بہت ہے اگر چشم تر میں ہے
کچھ ہو نہ ہو' چراغ تو کہنے کو گھر میں ہے

اس شعر کی تہہ داری اور نئی معنویت مسلسل دعوت فکر دے رہی تھی۔ یہ شعر روایت کے حدود میں رہتے ہوئے بھی نئے امکانات کا سراغ دے رہا تھا۔ چراغ کے حوالے سے فانی بدایونی نے اپنا تعارف یوں کرایا تھا۔

چراغ کشتہ آرام گاہ بے نشانی ہوں
میں رویائے پریشان فنا ہوں یعنی فانی ہوں

محشر کے شعر میں "چراغ" زندگی کی علامت تھا --- میں علامہ حیرت کا ہم نوا ہو گیا۔

۱۹۵۱ء میں جب میں پاکستان آیا اور ریڈیو پاکستان کراچی سے متعلق ہوا تو محشر صاحب ماہنامہ "آہنگ" کی مجلس ادارت میں تھے۔ وہ نوجوان تھے مگر بزرگ شعراء کے درمیان رہتے تھے۔ ذوالفقار علی بخاری' ارم لکھنوی' تابش دہلوی' شعیب حزیں' بہزاد لکھنوی' حفیظ ہوشیار پوری اور بنیاد تیموری وغیرہ۔ میں ایک تو غزل کا شاعر نہیں تھا' دوسرے ترقی پسند بھی تھا۔ میرے دوستوں کا حلقہ ہی اور تھا۔ میرے ہم عصروں میں احمد فراز' سلیم احمد' قمر جمیل اور احمد ہمدانی وغیرہ تھے جن سے ادبی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ محشر بدایونی کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ وہ روائتی شاعر ہیں۔ اس رائے سے مجھے قدرے اختلاف تھا۔ وہ روایت پسند ضرور تھے مگر کچھ اور بھی تھے۔ مشاعروں میں انہیں بڑی توجہ سے سنا جاتا۔ ترنم سے پڑھتے اور محفل پر چھا جاتے۔ ان کے یہ اشعار بہت ہی مقبول تھے:

کوئی غنچہ کھلے' چونک پڑتا ہوں میں
جیسے میری ہی جانب ہو روئے سخن

چٹک اے کلی' لیکن آہستگی سے

ہم نفسو، کیا بیر آپس میں
تم بھی قفس میں، ہم بھی قفس میں

اس کے رخ پر حیا کی طرح چھا گئی
میرے ہونٹوں پہ جو آرزو آئی ہے

ان کی نظم "تاج محل" بھی بہت مقبول تھی۔ مگر ہم ترقی پسند تو ساحر کے سحر بھی گرفتار تھے۔ محشر صاحب کی نظموں سے زیادہ مجھے ان کی غزلیں پسند آتی تھیں۔ کبھی کبھی ایسے شعر بھی مل جاتے جن کی روشنی میں وہ "کچھ اور" دکھائی دیتے اور میرے خیال کی تصدیق ہونے لگتی۔ مثلاً"

آ کہ اس تماشے پر خلوتوں میں ہنس لیں ہم
تجھ سے میں گریزاں ہوں، مجھ سے تو گریزاں ہے

"چراغ" ہماری شاعری میں زندگی کی علامت ہے، مگر ہوا کی زد میں ہے:

انیس دم کا بھروسہ نہیں، ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

یہ روایت جو زندگی کی بے ثباتی اور انسان کے مجبور محض ہونے کی دلیل ہے، ایک مخصوص عقیدے کی آئینہ دار ہے۔ اردو شاعری میں اس کی عکاسی تقریباً ہر شاعر کے کلام میں نظر آتی ہے۔ فانی تو ویسے بھی غم پرست شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں "غم" یاسیت کی حد تک پھیلا ہوا ہے۔ زندگی کا کوئی خواب اگر ان کی آنکھوں میں جاگ بھی اٹھتا ہے تو چراغ مزار بن جاتا ہے اور وہ اسے بجھا دینے کی آرزو کرتے ہیں:

آئی ہے اے نسیم، تو اس وقت تک ٹھہر
جب تک بجھے چراغ، ہمارے مزار کا

محشر صاحب کی شاعری میں "چراغ" خون سے روشن ہوا ہے۔ چنانچہ اس کی لو نہ صرف تابناک ہے بلکہ ہر لمحہ ہوا سے نبرد آزما بھی رہتی ہے۔

ہوائے شب! مرے شعلے سے انتقام نہ لے
کہ میں بجھا تو افق تک دھواں اڑا دوں گا

یہ شعر ان کے پہلے مجموعہ کلام "شہرنوا" میں ہے جو روایت اور جدت کا سنگم ہے۔ یہ سنگم محض اسلوب کا نہیں بلکہ طرز فکر کا بھی ہے۔ یعنی قدیم میں جدید کی نمود، بقول فراق گورکھپوری:

کہ مل رہا ہے کسی پھوٹتی کرن کا سراغ

زندگی کا یہ رجائی تصور ہماری شاعری کو علامہ اقبال نے عطا کیا ہے۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

غالب کی شاعری میں صدیوں کا جمع شدہ غصہ جس انتشار فکر سے الجھتا نظر آتا ہے، اقبال کی شاعری میں ایک منظم شعور حاصل کرلیتا ہے اور یہیں سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نئے دور کی تشکیل میں جہاں ہیگل اور مارکس کا فلسفہ جدلیات کارفرما ہے وہیں ڈارون اور برگساں کے نظریہ ارتقاء اور فرائیڈ کے دریافت کردہ نفسیاتی رموز سے آگاہی بھی شامل ہے۔ اردو شاعری نے اقبال اور اقبال کے بعد فراق، جوش، راشد اور میراجی کی معرفت ان افکار سے بہت روشنی حاصل کی مگر وہ شعری اصناف جو مخصوص اظہار کی پابند رہی ہیں ---- بالخصوص غزل ---- اپنی لسانی تہذیب کے دائرے سے بہت کم باہر نکل سکیں۔ غزل چونکہ اپنی روایت کی ایک تاریخ بھی رکھتی ہے۔ اس لیے اقبال و یگانہ کے لہجے کی ضرب بھی اس کے مزاج پر بہت دیر میں اثر انداز ہوئی۔ وہ بہت کم تبدیلیوں کو قبول کر سکی۔ آج بھی ہمارا دور اسی کشمکش کا شکار ہے۔ میں نے جن شعراء کے نام لئے ان میں فراق اور فیض کو دیکھئے، جدید ہو کر بھی روایت کو کتنا عزیز رکھے ہوئے ہیں۔ سوچا جائے تو ان کی غزل کی مقبولیت کا راز بھی یہی ہے۔

میر نے کہا تھا:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

عوام سے گفتگو کا مسئلہ ہی شعراء کو اظہار کے تہذیبی دائرے میں رکھتا ہے۔ محشر صاحب کی شاعری بھی عوام سے گفتگو کرتی ہے۔ چنانچہ اپنی شعری لسانیات کو قدرے نئے انداز میں مرتب کرنے کے باوجود انہوں نے اسلوب کا تہذیبی پیرہن، روایت سے آراستہ رکھا ہے۔ ان کی غزل کی دلکشی کا راز بھی یہی ہے۔ "شجرنوا" سے "فصل فردا" تک جدید تر خیالات بھی، روایت کے مخصوص آداب کے ساتھ، ان کے اشعار میں ڈھلتے ہیں۔ "شہرنوا" ہی کا ایک شعر دیکھئے۔

نہ جاؤ گھر کے شب افروز روزنوں پہ کہ لوگ
دیا مکان میں جلتا بھی چھوڑ جاتے ہیں

یہ ایک نیا شعر ہے اور اس میں جدیدیت کی غرابت بھی نہیں۔ وہ کھردرا پن بھی نہیں جو عموماً" نئی غزل بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ نئے خیالات کی فنی تہذیب کی برکت ہے۔

"شہرنوا" میں ایسی کئی مثالیں ہیں۔ تفصیل میں جاؤں گا تو بات بہت دور تک چلی جائے گی۔ محشر صاحب کے اب تک چھ مجموعہ کلام شائع ہوئے ہیں۔ ان میں زندگی کی کتنی ہی آنکھ او جھل تصویریں ہیں جو اپنے خوبصورت خدوخال کے ساتھ نمایاں ہوئی ہیں۔ کتنی ہی فکر انگیز حقیقتیں ہیں جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور نئے زاویے سے سوچنے پر اکساتی ہیں۔ انسانی نفسیات کے کتنے پہلو ہیں جو نئے نئے استعاروں اور علامتوں کی معرفت ہم پر نئے راز منکشف کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں اس مضمون میں محشر صاحب کی پوری شاعری کو اس کی تمام تر خوبیوں کے ساتھ سمیٹ نہیں سکتا۔ ۴۴ء میں ان کی غزل کے جس شعر نے انہیں ہندوستان گیر شہرت عطا کی تھی اسی غزل کے مطلع میں ایک ایسا چراغ بھی روشن تھا۔ جس میں امکانات

ایک دنیا منور تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لاشعوری طور پر محشر صاحب اسی "چراغ" کی روشنی میں آباد ں:۔

یک قطرہ خوں بہت ہے اگر چشم تر میں ہے
کچھ ہو نہ ہو، چراغ تو کہنے کو گھر میں ہے

اس شعر کا ذکر پہلے بھی میں نے کیا ہے۔

یہ "چراغ" جو قطرہ خون کی صورت "چشم تر" میں روشن ہوا، اپنی "ہوا" کے ساتھ، ساری زندگی محشر صاحب کا ہم سفر رہا ہے۔ میری نگاہ میں سو سے زیادہ اشعار ایسے ہیں جو اس مخصوص استعارے کی نسبت سے اپنے نت نئے معانی ہم پر آشکار کرتے ہیں۔ یہ استعارہ ان کی قادر الکلامی کا بھی آئینہ ہے۔ بقول انیس:

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھو

سب سے اہم بات یہ ہے کہ محشر صاحب کو ورثے میں فانی کی یاسیت ملی تھی مگر انہوں نے اس یاسیت کو امید و یقین سے بدل دیا۔

ہوا بھی کم نہ تھی کچھ تیز لیکن
ہوا سے تیز نکلی لو دیئے کی

رخ ہوا کا چراغ دیکھ چکے
اب چراغوں کا رخ ہوا دیکھے

کس قدر تیز ہے باد شب تخریب کی رو
ان چراغوں کی طرف جن کی ضیا تازہ ہے

یہ تو منزل سوز کامل ہی سے ہوتی ہے نصیب
سب دیئے بجھ جائیں اور گھر میں اندھیرا بھی نہ ہو

ان اشعار میں یقین کی شدت اور زندگی کی حرارت کتنی تیز ہے۔ کیا یہ وہ انقلابی فکر نہیں جو ہمارے عہد کے باغی شعراء کی پہچان ہے۔ آخر الذکر شعر کا رخ، ممکن ہے بعض لوگ صوفیانہ فکر کی طرف موڑ دیں اور اس کے رشتے جذب و کشف سے ملا دیں۔ فرض کیجئے ایسی بھی کوئی تاویل ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ تصوف خود اپنے عہد کا ایک انقلابی فلسفہ حیات تھا۔ اسی کا احسان ہے کہ مختلف عقائد کے لوگ اپنے اپنے "مقدس در و دیوار" کے حدود سے نکل کر زندگی کے کھلے میدانوں میں ایک دوسرے سے گلے مل سکے۔ ویسے اس شعر کی تہہ داری اور معنوی گہرائی سے "غیر صوفی" بھی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ عشق کی انتہا ہے اور یہ عشق کسی بھی مقام پر کسی بھی اہل دل کو ہو سکتا ہے۔

محشر صاحب کی غزلوں میں سماجی اور سیاسی حقیقتوں کی پردہ کشائی، گرد سفر میں اٹی ہوئی منزلوں کی

بجائے‘ روشن اور شفاف منزلوں کا سراغ‘ معاشرے میں فرد کے انفرادی اور اجتماعی کردار کا تعین اور درون ذات۔ آباد تنہائیوں کی تصویر کشی بڑے شعور کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔ ان مخصوص استعاروں کی معرفت یہ قرینہ اظہار بھی دیدنی ہے:

دلوں کو خود بجھا کر رکھ دیا ہے
اور الزام اب ہوا پر رکھ دیا ہے

مرے لئے ہے تجھے خدشہ ہوا کیسا
تو اپنے گھر کے چراغوں سے اپنا گھر تو بچا

پناہ شب میں یہ مجھ خستہ ضو پہ اور ہے جبر
بجھوں بھی اور ہواؤں کو مرحبا بھی کہوں

لے گیا ہے رات کے صحرا میں کتنی دور تک
رہگزر میں ایک مدھم سا دیا رکھا ہوا

رہ گئے ہیں ابھی دور کچھ قافلے
آندھیو! تم ابھی مت بجھانا مجھے

سبیل عافیت ہمرہاں نکلتی رہے
دیئے بھی جلتے رہیں اور ہوا بھی چلتی رہے

اب فاصلے ہیں شام کے اور واہموں کا بوجھ
گھر میں کوئی دیا بھی جلا ہو گا یا نہیں

حبس چھٹ جائے‘ دیا جلتا رہے
گھر بس اتنا ہی ہوا دار‘ اچھا

اور اب ایک بالکل ہی نیا شعر جسے پڑھ کر میں کچھ دیر سکتے کے عالم میں رہا:

بنے وہ کیسے تماشا‘ تہہ فلک جو چراغ
بجھا دیئے گئے اور روشنی میں رکھے گئے

اس شعر میں جس کرب کا اظہار ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ اردو شاعری میں ایسے مضامین بہت کم ملتے

یں۔ مذہبی حوالے سے ایک ہلکا سا طنز حسب ذیل شعر میں ضرور ہے۔

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں
وہی قتل بھی کرے ہے، وہی لے ثواب الٹا

مگر محشر صاحب کے شعر کی فضا اور ہے۔ اس میں وسعت بھی ہے اور گہرائی بھی، یہ تصویر انسانی عظمت کا المیہ نہایت تضحیک آمیز انداز میں پیش کرتی ہے۔ اسی حوالے سے خود محشر صاحب کا ایک اور شعر بھی ہے مگر کیفیت ذرا مختلف ہے۔

بڑھا اندھیرا تو جلنا پڑا دیوں کو بہ جبر
دیوں سے کام نہ نکلا تو گھر جلائے گئے

اس میں چھپا ہوا جو طنز ہے۔ اس کا رخ ہماری سیاست کی طرف ہے۔ یہ مضمون اکثر شعراء کے پاس مل جاتا ہے۔ لیکن محشر صاحب جس فن کاری سے اپنے اشعار کو نیا مفہوم دیتے ہیں، وہ زبان پر غیر معمولی قدرت اور اپنے ادب عالیہ سے گہری وابستگی اور اسالیب شناسی کا ثبوت ہے۔

کچھ اشعار اس زاویے سے بھی دیکھئے:

بجھے چراغ، مگر دیکھ لو، وہی بجھ کر
چراغ کر گئے پل بھر میں کتنی آنکھوں کو

شوق سے جاگنے کا اب، کون سا سلسلہ رہا
بجھتے چلے گئے چراغ اور میں دیکھتا رہا

آبرو مندی شب ایسی رہی کچھ دل خواہ
پاس ظلمت سے دیا بھی نہ جلایا گھر میں

ڈھلا ہے سورج تو نرم لہجے میں کہتی گزری ہوا دیوں سے
یہ روشنی آسمان کی ہے، زمین کی روشنی نہیں ہے

تیز تر باد خود سر چلی تو یہاں کون سی لو گھٹی
میں نے اور اک لہو سے جلا کر دیا، بام پر رکھ دیا

چراغ ہوں، مری ضو میں کمی نہیں ہو گی
مجھے تو جلنا ہے، شب بھر، جلوں کسی گھر میں

ان اشعار میں شاعر کی کلاسیکی تربیت صاف جھلکتی ہے۔ مگر اپنے عہد کی حقیقتوں کے ساتھ، ہر شعر میں

کوئی زاویہ ایسا موجود ہے جو ہمیں اپنے مسائل کا احساس دلا دیتا ہے۔ یا کوئی ایسا نکتہ نمایاں کرتا ہے۔ جسے ہم ابدی قدر سے تعبیر کر سکتے ہیں، جو ہر زمانے کی سچائی ہے۔ یہ اشعار فرد کے بھی آئینہ دار ہیں اور پورے معاشرے کے بھی۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ "چراغ" اور "ہوا" کی معرفت ہم کتنی متنوع، متضاد، ہم رنگ اور ہمہ رنگ کیفیتوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ ہم پر زندگی کے کتنے اسرار کھلتے ہیں:

چراغ اک تم بھی ہو اور ہم بھی لیکن
ہوا سے تم بجھے، ہم روشنی سے

بس اب تو بخشے ہواؤں کی برہمی مجھ کو
جلا چکی ہے بہت میری روشنی مجھ کو

دیوں کے دکھ ہی زیر بحث کیوں ہیں
ہوا کو کب سکوں حاصل ہوا ہے

دیا میں نے جلایا، پھر نہ پوچھو
دیئے نے میرا دل کتنا جلایا

بجھ جائیں جب سارے چراغ محبت کے
بستے گھروں میں آگ تو یوں بھی لگتی ہے

محشر صاحب انہیں استعاروں میں اپنا عکس بھی دیکھتے ہیں، اپنا جائزہ بھی لیتے ہیں اور کچھ ایسی سچائیاں بیان کرتے ہیں جو ہم سب کو دعوت فکر دیتی ہیں۔

ہنر کا حق تو ہوا کی بستی میں کون دے گا
ادھر میں اپنا دیا جلا لوں، یہی بہت ہے

وہاں بھی تیز رکھی ہے، ہنر کی لو میں نے
جہاں ہوا نہ کسی کا چراغ جلنے دے

جو بھی طاق شب پہ لکھنا تھا مجھے
میں نے وہ جل کر لکھا، بجھ کر لکھا

میری بجھنے پر نہ جا، یہ غور کر

کتنے ذہنوں کو میں روشن کر چلا

میں شعلگی ذات سے پہنچا ہوں یہاں تک
بجھ جاؤں گا جل جل کے، تو لو دے گا دھواں تک

سچائیوں کی لو کبھی بجھتی ہوا سے ہے
یہ دشت زندہ میرے چراغ صدا سے ہے

ان اشعار میں ایک تخلیق کار کا تجربہ اس کے محسوسات اور اس کا کرب ہی نہیں اس کا اعتماد بھی جھلکتا ہے۔ اور پھر جب وہ پورے یقین کے ساتھ یہ شعر کہتا ہے۔

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیے میں جان ہو گی، وہ دیا رہ جائے گا

تو یہ شعر، اسکے عہد کا محاورہ بن جاتا ہے۔ اس محاورے کی تخلیق میں نصف صدی کی ریاضت شعر کار فرما ہے جو اس طمانیت قلب کو تازہ کرتی ہے جو ۴۴ء کی غزل کے مطلع میں "قطرہ خون" کی صورت "چشم تر" میں نمودار ہوئی تھی اور "چراغ" کی صورت آج بھی محشر صاحب کے کلام میں روشن ہے۔

کچھ ہو نہ ہو، چراغ تو کہنے کو گھر میں ہے

محشر بدایونی کو ان کی پوری شاعری کی روشنی میں ابھی تک کسی نے نہیں پرکھا۔ میں نے بھی صرف ایک زاویے سے ان کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ تصویر یک رخی ہونے کے باوجود اسلوب کے اعتبار سے کتنی منفرد اور عصری آگہی کے اعتبار سے کتنا وسیع کینوس رکھتی ہے، اہل نظر سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن جب ان کا پورٹریٹ پورے قد و قامت کے ساتھ بنایا جائے تو ہمارے عہد کے غزل گو شعراء میں نمایاں ترین مقام پر آویزاں ہو گا۔ انہوں نے خود کتنے اعتماد کے ساتھ کہا ہے:

میں اتنی روشنی پھیلا چکا ہوں
کہ بجھ بھی جاؤں تو اب غم نہ ہو گا

صاحب طرز غزل گو روحی کنجاہی
کے اولیں مجموعہ کلام "سمتیں" کے بعد
دوسرا مجموعہ غزلیات
اچھے دنوں کی آس میں
عنقریب چھپ رہا ہے
ناشر: القمر انٹرپرائزز، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

محشر کی غزل

احمد ندیم قاسمی

محشر بدایونی آج کے غزل گو شعراء میں ایک نہایت معتبر نام ہے۔ ہمارے ہاں محشر کے سوا کوئی ایک بھی ایسی مثال شاید ہی موجود ہو کہ نصف صدی سے زیادہ عمر کے ایک غزل گو نے جدید حسیت' جدید طرز احساس اور جدید غزل کا چیلنج اتنی حوصلہ مندی سے نہ صرف قبول کیا ہو بلکہ پوری خوداعتمادی کے ساتھ نہایت رکھ رکھاؤ سے اسے برتا بھی ہو۔ محشر کی غزل پڑھیے تو دیر تک یقین نہیں آتا کہ اس شاعر کی عمر نصف صدی سے زیادہ ہے اور وہ شعراء کے ایک ایسے ہجوم میں زندگی بسر کرتا ہے جو اپنی اپنی جگہ سب ٹھیک ٹھاک شاعر ہیں مگر اتنے روایت پسند اور غزل کی لفظیات اور تشبیہ و استعارہ اور علامات و تراکیب سے متعلق اتنے وضعدار ہیں کہ اگر کوئی شاعر اپنے شعر میں دریچے کی بجائے کھڑکی کھول دیتا ہے تو ان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اور ایک محشر بدایونی ہے کہ نہ قدیم سے چمٹے رہنے میں اپنی نجات دیکھتا ہے اور نہ جدید کو اپنے اوپر مسلط کر لینے کا قائل ہے۔ وہ قدیم و جدید کی منتخب خوبصورتیوں' رعنائیوں اور ندرتوں کا شاعر ہے۔ اور اس کی غزل کے ہر شعر میں انسان کے کسی نہ کسی نازک جذبے کا نفوذ اتنا بے ساختہ ہوتا ہے جیسے پھول کی پتی پر شبنم اترتی ہے۔ وہ غزل کے لحاظ و احترام میں اپنی انفرادیت کو دفن نہیں کرتا بلکہ قدیم روایت کے حسن کو سمیٹتا اور نئی حسین روایت قائم کرتا ہوا گزرتا چلا جاتا ہے۔

پھر ہم سب جانتے ہیں کہ وہ جو غزل کا ہمیشہ زندہ و قائم رہنے والا حسن ہے وہ دراصل غزل کے باطن میں ہوتا ہے۔ غزل کے باطن کے اس حسن تک ہمیں الفاظ پہنچاتے ہیں اور شاعر کا کام ایسے مناسب الفاظ کا انتخاب اور ان کی ایسی فنکارانہ ترتیب ہوتی ہے کہ بظاہر دیکھیے تو شعر بہت سادہ اور بے ساختہ معلوم ہو مگر دراصل شعر کی تخلیق پر شاعر کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں صرف ہوئی ہوں۔ میں محشر کی غزل ایک عام قاری کی حیثیت سے پڑھتا ہوں تو میرا پہلا تاثر سادگی اور بے ساختگی ہی کا ہوتا ہے مگر ذرا سا رک جائیے تو شعر کی پرکاری آپ کے دل و دماغ میں' آپ کے وجدان و عرفان میں حلول کرنے لگتی ہے۔ تجربتہ" یہ شعر پڑھیے:

سر مژگاں بھی ہے بہ قطرۂ آب
پس جاں بارشیں بھی ہو رہی ہیں

پھر یہ شعر:

کلام کرتے ہیں در، بولتی ہیں دیواریں
عجیب صورتیں ہوتی ہیں انتظار میں بھی

محشر کے سادہ و پُرکار اشعار میں معنویتوں کی پرتوں پر پرتیں ہوتی ہیں۔ جب ہر شعر میں ایک رمز ہو، ایک علامت ہو، ایک استعارہ ہو اور شعر کہنے والا محشر بدایونی ہو تو ایسے شعر کی بلاغت اور تاثیر میں بھلا کسے کلام ہو سکتا ہے۔ محشر کا ایک شعر ہے:

ڈرو ان سے کہ ان خستہ تنوں میں
لہو کم ہے، حرارت کم نہیں ہے

"غزل دریا" کا مصرع ہے:

ہوا بھی کہتی ہے یہ لوگ مرنے والے نہیں

یہ خیال اور یہ لہجہ "گردش کوزہ" تک پہنچتے پہنچتے ان مصرعوں اور شعروں میں ڈھلا ہے:

؎ ہم بھی انسان ہیں اک انداز انا رکھتے ہیں

؎ نمو کے سلسلے ہوتے ہیں ریگ زار میں بھی

مسیحائی کا در بھولا ہوں، دھیان ایسا تو میرا ہے
کہاں میں نے بھی دستک دی، یہ دروازہ تو میرا ہے
اجازت ہے سب اسباب سفر تم چھین لو مجھ سے
یہ سورج، یہ شجر، یہ دھوپ، یہ سایہ تو میرا ہے

ہم در عدل پہ منت کو گئے جتنی بار
اپنے ماں باپ کی قبروں پہ بھی اتنے نہ گئے

مثالیں متعدد ہیں مگر صرف انہیں شعروں اور مصرعوں سے ثابت ہو جاتا ہے کہ محشر کے ہاں خارجیت کے تیور بھی تخلیقی ہوتے ہیں۔ دو شعر اور ملاحظہ ہیں:

روشن کسی اور افق پہ ہوگا
سورج کبھی ڈوبتا نہیں ہے

بارش ہے تو ایسی کہ لرز جائے زمیں بھی
پانی ہے کہ مٹی کو بھی تلوار بنا جائے

محشر بدایونی نے اپنی غزل میں اپنے وطن کی گزشتہ تیس چالیس سال کی ذہنی اور وجدانی تاریخ مرتب ی ہے۔ بہت ہی کم غزل گو شعراء ایسے ہیں جو محشر کی طرح اپنے تہذیبی منصب کو پہچانتے ہیں اور پھر اس ب کے ساتھ انصاف بھی کرتے ہیں۔ پھر ذاتی واردات کو عالمگیر واردات --- سبھی انسانوں کی واردات بھی بدلنا بھی کوئی محشر سے سیکھے۔

محشر نے اس دور کی اردو غزل کو بے شمار توانائیاں بخشی ہیں۔ وہ درد کا اظہار بھی کرتا ہے تو درد کے تمے کے عزم کے ساتھ کرتا ہے۔ پھر اس کے اخلاق معیاروں میں بھی عجیب طلسماتی کیفیت ہے:

مرے بارے میں لہریں کچھ بھی سوچیں
میں کہتا ہوں بھرم دریا کا رہ جائے

جھوٹے اقرار سے انکار اچھا
تم سے تو میں ہی گنہگار اچھا

زد پہ ہم ہیں تو زد پہ تم بھی ہو
تیر ہم بھی کڑی کمان کے ہیں

بنے ہیں کیسے تماشا تہ فلک جو چراغ
بجھا دیئے گئے اور روشنی میں رکھے گئے

گھر سے ہمیں جانے کی ضرورت نہیں اب کچھ
باہر کی ہوا آ کے بتا جاتی ہے سب کچھ

یہ ہاتھ اوج تخیل تک بلند، اور کم نصیب ایسے
کہ جائے لمس بھی گنجینۂ زر میں نہیں رکھتے

اتنا بھی نہ ہو صحن کہ در تک میں پہنچ کر
در کھولوں تو درویش دعاگو ہی چلا جائے

اور آخر میں محشر کے چند مزید نشتر قسم کے اشعار:

یوں بھی ہوتا ہے کہ دل خوں ہو جائے
اور آنسو نہ رواں ہو کوئی

—

اندھیرے چھوٹے تو پہنچے اس روشنی کی حد تک
جہاں کسی کو کسی کا چہرہ نظر نہ آئے
خدائے شام و سحر! میں انسان ہوں کہ پتھر
تھکن بھی دن بھر ہو، نیند بھی رات بھر نہ آئے

—

فن کے پیمانے سبک، حرف کے کوزے نازک
کیسے سمجھاؤں کہ کچھ دکھ ہیں سمندر میرے

محشر بدایونی نے اردو غزل کے ساتھ تصنع کی بدسلوکی کبھی نہیں کی۔ اس نے اردو ادب و فن کی اس دلہن کو نہ زیوروں سے آراستہ کیا اور نہ اسے غازے اور مہندی سے سنوارا ہے۔ محشر نے غزل کو جو توانائیاں بخشی ہیں ان کے دم سے اس دلہن کی آنکھوں میں قندیلیں روشن ہوگئی ہیں، رخساروں سے شفق اڈنے لگی ہے اور ماتھے سے پو پھوٹ رہی ہے۔

محشر کی خود اعتمادی کا ثبوت اس کی اپنی جدید غزل ہے۔ قدیم باوقار وضعداری اور جدید باشعور آزادہ روی کے متوازن امتزاج کی نمائندہ غزل۔

(محشر کے مجموعہ کلام "فصل فردا" کا حرف اول)

مرتضیٰ برلاس
فن کے ایک منفرد رجحان، شاعری کے ایک اعلیٰ اسلوب کا نام ہے
تیشہ کرب
کے بعد اس کا نیا مجموعہ کلام
ارتعاش
جس میں برلاس کی لاجواب غزلوں کے علاوہ اس کی وہ زبردست نظمیں بھی شامل ہیں جنہیں پڑھنے اور سننے والوں نے اپنے دل و دماغ میں جگہ دے رکھی ہے۔
ناشر: الحمد پبلیکیشنز، رانا چیمبرز، سیکنڈ فلور
چوک پرانی انارکلی، لاہور

محشر بدایونی

منتخب اشعار

عجب وہ شہرِ ستمگر تھا، چھوڑ کر جس کو   بہت خوشی ہوئی اور پھر بہت ملال ہُوا

کرے دریا نہ پُل مسمار میرے   ابھی کچھ لوگ ہیں اُس پار میرے

اِس انتظار سے بھی ہم گزر چکے اب تو   جس انتظار میں انسان مر بھی جاتا ہے

چٹانوں کی شکست آساں نہیں ہے   بالآخر ٹوٹنا تیشے کو ہو گا

سایہ طلب گئے جدھر، بول اُٹھے وہیں شجر   آئے ہو اب مسافرو، جب ہمیں دھوپ کھا گئی

ڈرو ان سے کہ ان خستہ تنوں میں   لہو کم ہے، حرارت کم نہیں ہے

سرِ مژگاں بھی ہے بے قطرۂ آب   پسِ جاں بارشیں بھی ہو رہی ہیں

کلام کرتے ہیں در، بولتی ہیں دیواریں   عجیب صورتیں ہوتی ہیں انتظار میں بھی

اجازت ہے، سب اسبابِ سفر تم چھین لو مجھ سے   یہ سورج، یہ شجر، یہ دھوپ یہ سایہ تو میرا ہے

ہم درِ عدل پہ منت کو گئے جتنی بار   اپنے ماں باپ کی قبروں پہ بھی اتنے نہ گئے

روشن کسی اور اُفق پہ ہو گا   سُورج کبھی ڈوبتا نہیں ہے

جھوٹے اقرار سے انکار اچھا   تم سے تو میں ہی گنہگار اچھا

بنے ہیں کیسے تماشا، تہِ فلک جو چراغ   بجھا دیے گئے اور روشنی میں رکھے گئے

اتنا بھی نہ ہو صحن کر در تک میں پہنچ کر   در کھولوں تو درویش دعا گو ہی چلا جائے

یوں بھی ہوتا ہے کہ دل خوں ہو جائے   اور آنسو نہ رواں ہو کوئی

اندھیرے چھوٹے تو پہنچے اس روشنی کی حد تک   جہاں کسی کو کسی کا چہرہ نظر نہ آئے
خدائے شام و سحر، میں انسان ہوں کہ پتھر   تھکن بھی دن بھر ہو، نیند بھی رات بھر نہ آئے

نہ جاؤ گھر کے شب افروز روزنوں پہ، کہ لوگ   دیا مکان میں جلتا بھی چھوڑ جاتے ہیں

مجھے بھی ساتھ ہی لے لو، مگر نہیں یارو   میں سست رو ہوں، تمہاری تھکن بڑھا دوں گا

مجھ کو اتنی تو نہ ایذائے سفر دی جائے   دھوپ دی جائے تو کچھ چھاؤں بھی کر دی جائے
کچھ تو ساماں ہو میسر ہمیں حفظِ جاں کا   چلیے شمشیر نہ دی جائے سپر دی جائے

روایت کے بہت سے ضابطوں کو   ضرورت نے قلم زد کر دیا ہے

شہر تو سنگ بدست ہے محشر   تو آداب لیے پھرتا ہے

کیسا وحشی ہے کہ وحشت کی حدیں توڑ گیا   کوئی صحرا کی طرف جا کے بھی گھر آیا ہے !

اتنی نوازش بھی ہے کافی ہم پردیسی لوگوں کو   جن پر سر ٹک جائے، وہی پتھر زانو ہو جاتے ہیں

اب ہوائیں ہی کریں گی، روشنی کا فیصلہ   جس دیئے میں جان ہوگی، وہ دیا رہ جائے گا

[illegible]

کچھ ایسے بھی ہیں تہی دست و بے نوا جن سے   ملائیں ہاتھ تو خوشبو نہ ہاتھ کی جائے

دیں گردشیں اتنی کوزہ گر نے   مٹی ہی تو تھے، بکھر گئے ہم

گھروں میں اب تو باہر کے دھوئیں ہیں   کبھی باہر تھیں خوشبوئیں گھروں کی

برکتیں وقت نے سب کر لیں غصب   اب تو بس صبر ہے ناداروں میں

کیا جانے کہاں فقیہ پہنچے   کشکول پڑے ہوئے ہیں خالی

ابھی سر کا لہو تھمنے نہ پایا   ادھر سے ایک پتھر اور آیا

مکیں ایسے گئے ہیں اس مکاں سے   کہ سناٹے پکارے جا رہے ہیں

گر صداقت گئی تو یہ سمجھو   عزتِ فنِ سخن وروں سے گئی

گھر کے واسطے اب اک چراغ بھی دے گا   وہ جس نے رہنے کو کاغذ کا گھر دیا ہے مجھے

لیسے کر سکتی ہے اس ظلم کو تاریخ معاف   میرا گھر لوٹنے والے مرے ہمسائے تھے

کس پہ اصحابِ زر کی شان کھلے   ظرف ہیں تنگ اور مکان کھلے

بڑھا اندھیرا تو جلنا پڑا دیوں کو بجبر   دیوں سے کام نہ نکلا تو گھر جلائے گئے

میں اتنی روشنی پھیلا چکا ہوں   کہ بجھ بھی جاؤں تو اب غم نہیں ہے

لے گیا ہے رات کے صحرا میں کتنی دور تک   رہگذر میں ایک مدھم سا دیا رکھا ہوا

عزت ہی نہ جب بچا سکیں لوگ پھر کیا کریں، جان بھی بچا کے

اے دل، اس انتہائے رفاقت سے باخبر اک امتحانِ ترکِ رفاقت بھی آئے گا

اب اتنا بھی نہ موسم مہرباں ہو کہ بارش ہو تو دریا گھر میں آ جائے

کوئی ہماری نوا ڈوب کر سُنے ورنہ سُنا تو شورِ سرِ رہگذر بھی جاتا ہے

عجیب قحطِ خیال و خبر سے گزرے ہم کسی نے حال بھی پُوچھا تو جی بحال ہُوا

چٹک اے کلی لیکن آہستگی سے یہ آوازِ گوشِ خزاں تک نہ پہنچے

ہوائے شب مرے شعلے سے انتقام نہ لے کہ میں بُجھا تو اُفق تک دھوئیں اُڑا دوں گا

رہ گئے ہیں ابھی دُور کچھ قافلے آندھیو، تم ابھی مت بُجھاؤ مجھے

شوق سے جاگنے کا اب کون سا سلسلہ رہا بجھتے چلے گئے چراغ، اور میں دیکھتا رہا

چراغ اک تم بھی ہو اور ہم بھی لیکن ہَوا سے تم بُجھے، ہم روشنی سے

دیوں کے دُکھ ہی زیرِ بحث کیوں ہیں ہَوا کو کب سکوں حاصل ہُوا ہے

وہاں بھی تیز رکھی ہے ہُنر کی لَو میں نے جہاں ہَوا نہ کسی کا چراغ جلنے دے

چُھوتی ہے ذرا جب تن کو ہَوا، چُبھتے ہیں رگوں میں کانٹے سے سو بار خزاں آئی ہوگی، محسوس مگر اس بار ہوئی

[illegible]

یوں پریشان گھر سے نکلتا ہوں میں
جیسے واپس نہیں گھر میں آنا مجھے

رہِ مراد میں اک خوابِ مہرباں نے ہمیں
دیا سُکوں بھی مگر دُکھ بھی انتہائی دیئے

شیشہ گر کارگہہِ شیشہ سے لاتے بھی ہیں کیا
خالی ہاتھوں میں خراشیں ہی پڑی ہوتی ہیں

اک حرفِ جُنوں کہہ نہ سکا مجھ سے تو محشرؔ
زنجیر ہی اچھی جسے جھنکار ملی ہے

ایک بے نام سی دیوار ہے باہر میرے
کون جانے جو نیا شہر ہے اندر میرے

آوازِ دل تھا میں، مجھے دائم سُنا گیا
آوازِ پا نہ تھا جو سفر تک سنائی دے

محبت کے گلستانوں میں پھلنے پھولنے والو!
اسی رستے میں آگے چل کے ویرانے بھی آتے ہیں

وہ نقطہ ہوں کہ ہر جا قیام ہے میرا
وہ دائرہ ہوں کہ جس کی حدیں نہیں ملتیں

عنوانِ گفتگو تھے کہ رہ گئے سوچ سوچ کر ہم
یہ بات اُسے ناگوار ہوگی، یہ لفظ اُسے ناگوار ہوگا

حبس چھٹ جائے، دِیا جلتا رہے
گھر بس اتنا ہی ہوادار اچھا

یہ رُوح ایسی سفر دوست تھی کہ اب شاید
ندائے قافلہ آئے تو قبر چلنے لگے

روشنی محشرؔ رہے گی روشنی اپنی جگہ
میں گزر جاؤں گا، میرا نقشِ پا رہ جائے گا

فصلِ جنوں کے آتے آتے — ظہیر کاشمیری کی یاد میں

صلاح الدین حیدر

کسی یونانی فلسفی کے مجسمے کی طرح ترشا ہوا دانائی کا استعارہ --- لمبی سی ناک، لمبوترا چہرا، سرخ و سفید رنگ جیسے مرمر سے خون چھلک جائے۔ عقابی آنکھوں میں مسکراتی ہوئی محبت کی رِم جھِم، ڈھلتے ہوئے جسم کے ساتھ درمیانہ قد، شاعری اور فکر کے امتزاج کا ایک خوبصورت شاہکار، وقت کے دریا میں ڈوبتی ہوئی بیسوی صدی کے بادبانوں میں اسلوب کا جادوگر باد و باراں کے موسم میں کڑکتی بجلی کی چمک جو تیکھے پن سے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔

سنہ ۱۹۹۴ء کی سرد لہر اور سفاک شاموں کے موسم میں بزمِ ہستی کو اچانک الوداع کہہ گیا ہے، ریگل چوک، بیڈن روڈ یا ٹی ہاؤس کی کسی میز کے روبرو اچانک ملاقات ہو جاتی تھی، لیکن پہلے پہل میں نے سنہ ۱۹۶۴ء کے زمانے میں "عظمتِ آدم" کے فلیپ پر ایک مجسمے کے روپ میں اُسے دیکھا۔ رزم گاہِ حیات کی سنگلاخ سرزمینوں میں اس کی شاعری ایک مسکراتی اور لہلہاتی ندی کی طرح سہارا بنی رہی اور چند ہی برسوں بعد عوامی تحریک کا ریلا اُٹھا تو خس و خاشاک کو والیٔ چمن بنانے کی دھن میں ظہیر کاشمیری بھی اپنے غم کدے سے انقلابی اسلوب کے ساتھ طلوع ہوا اور ٹی ہاؤس کے نوجوان دانشوروں اور ٹریڈ یونین کارکنوں کی محفلوں میں اُس کی فکر انگیز باتوں نے نیا ولولہ دیا لیکن کسی عوامی تحریک میں یہ اُس کی پہلی شرکت نہ تھی۔ برطانوی سامراج کے غروب ہوتے ہوئے سورج کو بھی اُس نے اپنے خوابوں سے کرنیں سمیٹ کر سراسیمہ کرنا چاہا لیکن یہ کہانی تو فلیش بیک میں لکھی جائے گی۔

جب عوامی تحریک اٹھی تو حلقہ اربابِ ذوق بھی دو حصوں میں بٹ گیا، سائنسی طریقۂ علم کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر اعزاز الحق نے اپنے عہد کے بنیادی تضادات کی نشاندہی کرتے ہوئے حلقۂ اربابِ ذوق کو سیاسی قیادت مہیا کرنے کی کوشش کی۔ انہی دنوں کی ایک نشست کی صدارت جناب احمد ندیم قاسمی کر رہے تھے۔ وائی ایم سی اے ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کچھ غیر ملکی بھی تشریف فرما تھے۔ بڑی ٹیبل کے دوسری طرف قاسمی صاحب کے مقابل حبیب جالب بھی براجمان تھے کہ اچانک ظہیر کاشمیری "فصلِ جنوں کے وحشی" یا سینہ اہلِ وطن کے زخموں کی مصوری بنا ہوا جناب احمد ندیم قاسمی کے پہلو میں آ بیٹھا۔ ایک نوجوان دوست وجودیت کے حوالے سے مارکسی فلسفے پر تنقید کر رہا تھا کہ ظہیر کاشمیری اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے آشفتگی اور دلیل کی قوت کے امتزاج سے تمام ایوان کو سراسیمہ کر دیا۔ اسلوب کی گھن گرج ایسی تھی، اور استدلال پر اعتماد اتنا پختہ تھا کہ کوئی جوابی مکالمہ کرنے کی جرأت نہ کر سکا لیکن کسی گوشے سے وضع داری کی طناب ٹوٹی اور مطالبہ ہوا کہ ظہیر کاشمیری کو اس کے سرکش اسلوب کے پیشِ نظر ایوان سے نکال دیا جائے۔

[illegible] احمد ندیم قاسمی [illegible] نے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ میں خود ایوان سے باہر چلا جاؤں گا

جلاس برخاست کر دوں گا لیکن ظہیر کاشمیری کو باہر نکل جانے کے لیے نہیں کہوں گا۔ ہنگامہ بڑھتا گیا۔ ایوان سے بہت سے ب بطور احتجاج باہر نکل گئے، اور اُن کی سراسیمگی سے لطف اندوز ہوتا ہوا ظہیر کاشمیری بھی باہر نکل گیا تو لوگ واپس آ کر وضع دارانہ گفتگو کی ستاربندی کرنے لگے لیکن ایک بار پھر سب کو سانپ سونگھ گیا جب وہ پھر اطمینان سے قاسمی صاحب کے پہلو میں آ کر بیٹھ گیا۔ ب ڈاکٹر عزیز الحق نے مخصوص خطابیہ اسلوب سے اُسے مخاطب کر کے کہا "ظہیر صاحب! میں آپ کو کارل مارکس کے چند اشعار انا چاہتا ہوں"۔ بس ایک لمحہ کے لیے اُس کی توجہ ہٹی، اور ڈاکٹر عزیز الحق نے مورچہ سنبھال کر ظہیر کے آٹھ دس اشعار سنا دیئے اور ں اسلوب میں ظہیر کی داستانِ حیات کے بعض ابواب سنائے اور اس کی کومٹ منٹ کو اس طرح اجاگر کیا کہ شاید خود ظہیر کو ں اپنی حالت پر ترس آنے لگا۔

اگلے روز دفتر "فنون" میں جناب احمد ندیم قاسمی نے بتایا کہ وہ ٹیلیفون پر کہہ رہا تھا کہ ہنگامہ اُس نے نشے کی حالت میں یں کیا بلکہ سوچ سمجھ کر ایسا کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ مطالبہ بھی کیا کہ میرے لیے دو روپے اپنی جیب میں تیار رکھیں کسی بھی وقت وصول نے آ جاؤں گا۔ میر نے جو سنگ کو آشفتہ سری کا مداوا کہا تو عقل کی کمی کی وجہ سے نہیں۔ شاید خرد افروزی کو منوانے کے لیے۔

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد حلقہ اربابِ ذوق ادبی کی ایک نشست میں مَیں نے اُسے مختلف روپ میں دیکھا۔ س کے روبرو بیٹھے ہوئے جناب انتظار حسین نے بہت تیکھے سوالات دریافت کیے لیکن برہم ہونے کی بجائے جرأت مندانہ نانت سے ادبی اقدار اور معاشرتی تضادات کی، جدلیاتی طریقۂ علم کے حوالے سے، تشریح کرتا رہا۔ پہاڑ کی زندگی کا بوجھ محض تش مثانی ہی کے لیے تو نہیں ہوتا۔ ظہیر کے اسلوب میں دانائی، متانت، بذلہ سنجی، لطافت اور طنز و مزاح کے عناصر موجود ہوتے ہے لیکن وہ منطقی تسلسل کے ساتھ سادگی سے بات کہتا تھا۔ معاشرتی تضادات کے جہنم سے تصادم کے عمل میں اس نے تخیلات ے نگار خانے سے روایت کے گل بوٹے چن کر شاعری کا جہان آباد کیا۔ وہ جمالیاتی قدروں اور تخلیقی معیاروں کے پس پردہ ادی عوامل کی کارفرمائی کو بامعنی سمجھتا تھا۔ مادی رشتوں کے تصادم کے حوالے سے ہی تخلیقی عمل کو بامعنی بناتا تھا۔ دس ڈاؤننگ سٹریٹ کے مقابل اُس نے نو بیڈن روڈ پر مورچہ گاڑ رکھا تھا۔

مارشل لا کے زمانے میں ایک بار میں نے خیریت دریافت کی تو فرمایا کہ بیکار پھر رہا ہوں حکومت نے اخبار بند رکے میری مشینوں پر دو سنتری بٹھا رکھے ہیں فیض احمد فیض پر مقالہ لکھنے کے دوران ایک بار اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور موضوع کے حوالے سے چند سوالات سامنے رکھے تو قدرے جز بز ہوئے اور فرمایا کہ بڑی شخصیتوں کے پیچھے دنیا بھر کی ایجنسیاں اپنے اپنے مفادات کے مطابق سرگرم عمل ہوتی ہیں۔ میں کسی شاعر کی عظمت پر اس طرح گفتگو نہیں کر سکتا۔ میں نے ردعمل میں بعض تیکھے سوالات کیے تو اُن کی عالمانہ گفتگو نے کئی سمتوں کی نشان دہی کی۔ انقلابِ فرانس ہو یا جرمن فلاسفی، نشاۃ الثانیہ ہو یا روسی انقلاب، مشرق کی کلاسیکل روایت ہو یا اٹھارویں، انیسویں صدی کا فکشن، بیسویں صدی کے فلسفے ہوں یا عالمی انقلابی تحریکوں کے حالات۔ غرض کسی بھی موضوع پر مستند حوالہ جات کے ساتھ گفتگو کرتے تھے اور شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کبھی محکمۂ تعلیم میں ملازم نہ رہے تھے۔

اکتوبر ۱۹۹۴ء میں اہلِ قلم کانفرنس میں شرکت کے لیے ادیبوں شاعروں کا قافلہ ملتان سے روانہ ہوا تو لاہور سے شریک سفر ہونے والوں میں ظہیر کاشمیری بھی تھے۔ ان کے چہرے کی سرخی اور سپیدی میں روایتی شوخی کی بجائے زرد پتوں جیسی کیفیت نمایاں تھی۔ لیکن جب اسلام آباد میں اُن کی خیریت دریافت کی تو انھوں نے اپنے مخصوص رجائی اسلوب

میں کہا "صحت اب اچھی نہیں رہتی ہے۔"

یہ میرے کہاتے میں بدنصیبی ہے کہ نیشنل لائبریری کی آخری نشست کے دوران میں نے ۱۹۳۶ء کے ترقی پسندوں کی برطانوی سرکار کی حکمت عملی کے تعاون پر تنقید کرتے ہوئے ظہیر کاشمیری کا ایک حوالہ بھی لپیٹ لیا۔ بعد ازاں جب چائے کے لیے لوگ جا رہے تھے تو انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ وہ کرسی پر بیٹھے تھے۔ برملا اور دو ٹوک انداز سے پوچھا "تم کہنا کیا چاہتے تھے؟"

میں نے وضاحت کی تو انھوں نے گرجدار آواز سے کہا: "تم نے شاید اقدام" میں میرے مضامین نہیں پڑھے۔" میں نے نیازمندی کا رویہ اختیار کیا تو انھوں نے چائے لانے کا حکم دیا۔ وہ اُٹھ کر دعوتِ طعام کی ذمہ واریوں سے نبرد آزما ہونے سے قاصر تھے۔ اہل قلم سلطنت روم کے شیروں کی طرح چائے کے لوازمات پر ڈٹ پڑے تھے۔ میں ایک شیر کے منہ سے شکار چھین لایا اور اُن کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی۔ یہ اُن سے آخری ملاقات تھی۔

ظہیر کاشمیری کی زندگی ایسی کھلی کتاب تھی جس کی جلد بندی کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اُنھوں نے جلیانوالہ باغ کی فائرنگ سے باغیانہ اسلوب کے ساتھ سنبھلتے ہوئے امرتسر میں ہوش سنبھالا۔ کٹرہ جیمل سنگھ کی محفلوں میں مصوری اور موسیقی سے شغف بڑھا۔ ایم۔اے او کالج میں کرامت حسین جعفری، ڈاکٹر تاثیر اور فیض احمد فیض جیسے اساتذہ سے مکالمہ رہا۔ شہر کی ٹریڈ یونین اور کالج کے طلبا کی یونین کی سرگرمیوں میں سرگرم عمل رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران فوجی بھرتی کے خلاف تقاریر کیں، اور کئی بار جیل بھیجے گئے۔ بنگال میں بھی روپوش رہے۔

قیام پاکستان کے بعد مارشل لا کے دفتروں میں حاضریوں کے لیے طلب کیے جاتے رہے، اور "بابا" کہلانے کے باوجود اکثر بیشتر طالب علم رہنماؤں کی طرح خوش لباسی اور حوصلہ مندی کے ساتھ بے روزگار رہے۔ کبھی کبھار کسی اخبار میں کالم نویس کے طور پر کام کیا، کسی اشتہاری کمپنی میں بھی کام کرتے رہے یا کسی فلم کے مکالمے وغیرہ لکھتے رہے، لیکن عالمانہ وقار کے ساتھ بے وقوفانہ زندگی گزارنے پر کبھی راضی نہ ہوئے۔ وہ انتہا پسندانہ، تاثراتی اور موقع پرستانہ رویوں کے نقاد رہے۔ تاریخ کے مادی رشتوں کے مفـ رہے" اور اب وہ ہمارے درمیان نہیں رہے۔ عابد عمیق کی ایک مختصر سرائیکی نظم یوں ہے کہ بزرگ ٹپکے کے آموں کی طر ہوتے ہیں۔ کیا خبر کہ کب کوئی جھونکا انھیں شاخوں سے جدا کرتا ہوا گزر جائے۔

مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی توسیع و تعمیر کی باتصویر اور ایمان افروز کہانی
مدینۃ النبیؐ ـــ کل اور آج
ڈاکٹر خالد عباس کی غیرفانی تخلیق
آرٹ پیپر پر قیمت: ۲۲۵ روپے
ناشر: اساطیر - ۴۵ - اے، مزنگ روڈ۔ لاہور

ظہیر کاشمیری ــــ ایک قدآور شاعر

احمد ندیم قاسمی

ظہیر کاشمیری ترقی پسند مصنفین کے اس ہراول دستے کے ایک منفرد اور سربر آوردہ رکن تھے جس کے پیش نظر اگست 1947ء کے بعد اس نوزائیدہ مملکت کو حق و انصاف، عدل و توازن، خود کفالت و بے احتیاجی، حسن و خیر اور سچی اور کھری جمہوریت کا ایک لائق تقلید گڑھ بنانا تھا۔ ظہیر نے اپنی بے کنار دانش و حکمت کی مدد سے اس ہراول دستے کی قدم قدم پر رہنمائی کی، اسے رجعت و قدامت کی نمائشی رنگارنگی سے دامن بچا کر آگے بڑھتے رہنا سکھایا اور ایسی پرزور اور پرجوش شاعری تخلیق کی جو لوگوں کی رہنمائی کا فرض بھی ادا کرتی ہے مگر اس کے باوجود شاعری ہی رہتی ہے، نعرہ نہیں بن پاتی۔

سچی بات یہ ہے کہ حضرت جوش ملیح آبادی کے بعد اس دبدبے اور طنطنے کی شاعری صرف ظہیر کاشمیری ہی نے کی ہے۔ اس کے الفاظ مصرعوں میں کھنکتے تھے اور اس کا لہجہ ان الفاظ میں گونجتا تھا۔ ظہیر کی آواز میں خود اعتمادی کی کاٹ تھی اور وہ حق بات کا اعلان اتنی قوت اور تیقن کے ساتھ کرتا تھا کہ معاشرے کو گھسیٹ کر پیچھے لے جانے کے خواہش مندوں کی نیندیں حرام ہو جاتی تھیں۔

ظہیر کی اور میری رفاقت کی مدت پاکستان کی عمر کے برابر ہے۔ ہم ترقی پسند ادب کی تحریک میں شانہ بہ شانہ چلے۔ 1951ء میں جب عدل و صداقت کی آواز بلند کرنے والوں کا راؤنڈ اپ ہوا اور سب کو جیل میں ڈال دیا گیا تو ظہیر اور میں ایک ساتھ گرفتار ہوئے۔ جیل میں ہم نے کچھ عرصہ جیل کے ایک ہی احاطے میں، سلاخوں لگی ایک سی کوٹھڑیوں میں، مٹی کے فرش پر سو کر، اور تکیے کا کام اپنے بازو سے لے کر، اور مچھروں کی افواج قاہرہ کے سامنے اپنے جسموں کو بچھا کر اور گہری سیاہ رنگ کی بے ذائقہ دال سے پیٹ کا دوزخ بھر کر گزارا۔ اس ماحول میں، جہاں قتل کر کے آنے والے چودہ چودہ سال کے قیدی ہم نظربندوں کے مقابلے میں شہزادوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے، ظہیر نے ایک بار بھی اپنی نظربندی اور جیل کے عملے کی بدسلوکی کا گلہ نہ کیا اور ہم سب کو اپنی علمی و فنی گفتگو سے بھی نوازتا رہا اور امرتسر کی بعض شخصیات کے قصے سنا سنا کر ہنساتا بھی رہا اور معائینے کے لیے آنے والے جیل کے بڑے افسروں کو اپنی دبنگ اور بلند بانگ انگریزی سے دہلاتا بھی رہا۔ افسوس کہ وہ بیمار ہو کر جیل کے ہسپتال میں منتقل ہو گیا ورنہ اس کی ہمراہی میں نظربندی کا وقت بہت پرلطف انداز میں کٹ رہا تھا۔

1952ء میں ترقی پسند مصنفین نے اپنے انتہا پسندانہ منشور پر نظرثانی کے لیے کراچی میں کل پاکستان

کانفرنس منعقد کی۔ میں تین برس سے انجمن کے جنرل سیکرٹری کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھا مگر میں نے محسوس کیا تھا کہ آئندہ کسی مجھ سے زیادہ سرگرم ادیب کو یہ منصب تفویض ہونا چاہیے، چنانچہ میں نے اس کانفرنس میں ظہیر کاشمیری کا نام جنرل سیکرٹری کے عہدے کے لیے تجویز کیا، مگر میری اس تجویز کی رسمی تائید سے پہلے ہی ظہیر اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ میں اپنا نام واپس لیتا ہوں اور تجویز کرتا ہوں کہ ندیم ہی اس منصب پر فائز رہے۔ ظاہر ہے یہ بہت بڑا ایثار تھا۔ اس کا ایک معین مطمح نظر تھا جس پر وہ عمر بھر کمال استقامت سے کاربند رہا۔

اس کی نظم میں لفظیات کا جو آہنگ ہے اس سے ہم سب واقف ہیں مگر اس کا کمال فن یہ تھا کہ اس نے کسی بھی مقام پر اسے پند و موعظت نہیں بننے دیا۔ اس کی غزل کا آہنگ بھی معاصر غزل سے مختلف ہے۔ اس میں اس کی انفرادیت اس طرح کے جلوے دکھاتی ہے:

برق زمانہ دور تھی لیکن آتش خانہ دور نہ تھی
ہم تو ظہیر اپنے ہی گھر کی آگ میں جل کر خاک ہوئے

اور یاد رکھیے کہ یہ شعر اور اس انداز کے دوسرے شعر انفرادی ردعمل سے زیادہ، ملک کی اجتماعی صورت حالات کے عکاس ہیں۔

اردو کے نامور نقاد
پروفیسر فتح محمد ملک
کی ایک خصوصی تصنیف

* احمد ندیم قاسمی ــــ شاعر اور افسانہ نگار

جس میں ندیم کی شاعری اور افسانہ نگاری کا
متوازن تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے

قیمت: ۹۹ روپے

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

ظہیر کاشمیری کی غزلوں کا انتخاب

ہم کو تو نذرِ سیل ہوئے، عمر ہو گئی   کشتی میں ڈھونڈتا ہے مگر ناخدا ہمیں

جب خامشی ہی بزم کا دستور ہو گئی   میں آدمی سے نقش بہ دیوار بن گیا

ہو گئی آج تکمیلِ بے چارگی   سانس بھی رُک گئی، چارہ گر بھی نہیں

کون لکھے گا سرِ محفل صحیفے نور کے   ڈھل چکی شب، سرد شمعِ زندگانی ہو چکی

شاید اپنی خاکستر حشر کر سکے پیدا   زندگی کی خواہش میں آؤ آج مر جائیں

تھکن تیرے بدن کی، عذر کوئی ڈھونڈ ہی لیتی   حدیثِ محفلِ شب کہہ رہی ہے زلفِ برہم بھی

دل ہو تو ظہیر اس محفل میں طوفانِ تکلم ہوتا ہے   عاقل کے لئے تو پتھر کی تصویریں ہیں بُت خانوں میں

اپنے میں رہے تو رسوائی، اپنے سے گئے تو سودائی   ہم مدت سے دیوانگی دنیا کا تماشا کرتے ہیں

جینا پڑا کہ اپنی وفا کا خیال تھا   ورنہ ہر اک عزیز کی خاطر پہ بار تھے

مگر تم بھی تو اک بُوئے گریزاں کی طرح نکلے   گزرنے کو گزر جاتی بہارِ دوستی اپنی

ہم بھی چراغِ بزم تھے، لیکن   روشن ہوتے ہی کجلائے

قدم قدم پہ جنوں اختیار کرتے تھے   شباب تھا تو ستارے شکار کرتے تھے

دار و رسن تعلقِ خاطر کی بات ہے   ورنہ قریب تر تھا شبستاں کھلا ہُوا
ابلیس اب بھی بیمِ دشمن سے ہے بہرہ ور   اب بھی ہے بابِ رحمتِ یزداں کھلا ہوا

موسم بدلا، رت گدرائی، اہلِ جنوں بے باک ہوئے   فصلِ بہار کے آتے آتے کتنے گریباں چاک ہوئے
برقِ زمانہ دُور تھی لیکن مشعلِ خانہ دُور نہ تھی   ہم تو ظہیر اپنے ہی گھر کی آگ میں جل کر خاک ہوئے

پھولوں پہ مسرت ناچے گی، کلیوں پہ اُجالا برسے گا   ہم لوگ برنگِ نورِ سحر، اے صبحِ گلستاں، آتے ہیں

پہاڑ رات کا کٹنا محال لگتا ہے   چراغِ وعدہ کی لَو، شام ہی سے مدھم ہے

ہمارے حال سے مایوس کیوں ہیں اہلِ چمن   خزاں زدہ ہیں تو پیغمبرِ بہار بھی ہیں
جنہیں سلام کرے گا نظامِ مستقبل   وہ آج جرمِ بغاوت میں زیرِ دار بھی ہیں
ہمارا عشق ہمیں تمکنت سکھاتا ہے   کشیدہ سر بھی ہیں، پابندِ زلفِ یار بھی ہیں

موسم میں وہ آنچ ہے کہ ہر گُل   تانبے کی طرح پگھل رہا ہے

سکوت پر بھی جرس کا گماں گزرتا ہے   کہیں قریب نہ ہو قافلہ بہاروں کا

میں ہوں وحشت میں گم، میں تیری دنیا میں نہیں رہتا   بگولا رقص میں رہتا ہے، صحرا میں نہیں رہتا

صحرا تو ظہیر تنگ نکلا   اب دیکھیں، کدھر کو جائیں گے ہم

ہاں میں بھی ستارہ تھا سرِ گنبدِ افلاک   ہاں میں ہی ترے بعد خلاؤں کا دھواں ہوں

دیکھنے پر بھی نہ دیکھا تھا کسی بُت کو ظہیر   عمر گزری ہے تو آدابِ نظر آتے ہیں

خود نہیں جانتے کیا مانگتے ہیں   تجھ سے کچھ تیرے سوا مانگتے ہیں

[illegible]

چھپی ہوئی ہیں ابھی سینۂ بشر میں ظہیرؔ   وہ منزلیں کہ جہاں گردِ کارواں نہ گئی

ہمارے ہاتھ میں ہیں ابلقِ ایّام کی باگیں   ہمارے نام سے خائف رہیں کوہ و دمن والے
پسِ دیوارِ زنداں کچھ ہیولے سے لرزتے ہیں   یہی تہذیبِ فردا ہیں، یہی ہیں فکر و فن والے

اب پسِ دیوار ہجرِ یار کا موسم نہیں   سوختہ جانو! اُٹھو، جلوے لبِ بام آگئے

غمِ حیات سے بڑھ کر ہو کائنات کا غم   یہ مرحلہ بھی ضروری ہے آدمی کے لئے

، تھا ظہیرؔ احساسِ زیاں، اب ہیچ ہے دولتِ کون و مکاں   جب غیر کا دامن دیکھا تھا، اب اپنا گریباں دیکھا ہے

کتنا دلکش ہے تری یاد کا پالا ہُوا اشک   سینۂ خاک پہ مہتاب گرا ہو جیسے

ایک پروانے کو بھی دادِ جنوں دے نہ سکی   شمع سب کچھ تھی مگر صاحبِ کردار نہ تھی

ظلم منظور، مگر اذنِ تکلّم دے دے   آدمی کچھ بھی سہی، نقش بہ دیوار نہیں

غریبِ شہر پہ تہمت تراشنے والو!   امیرِ شہر کا بھی شجرۂ نسب دیکھو

وہ خوں جس نے ہمارے شہر کی مٹی کو سینچا تھا   اُگے گا صورتِ برگِ حنا آہستہ آہستہ

ان کے روبرو نکلے نطق و لفظ بے معنی   بات ہی عجب لیکن خامشی نے پیدا کی

لوحِ مزار دیکھ کے جی دنگ رہ گیا   ہر ایک سر کے ساتھ فقط سنگ رہ گیا
سیرت نہ ہو تو عارض و رخسار سب غلط   خوشبو اُڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا
کتنے ہی انقلاب شکن در شکن ملے   آج اپنی شکل دیکھ کے میں دنگ رہ گیا

منزلوں کی جستجو کا تذکرہ بے سُود ہے   ڈھونڈنے نکلو تو اب اپنے ہی گھر ملتے نہیں

ہمیں وہ سوکھے ہوئے زرد پیڑ ہیں، جو کبھی   بہار بانٹتے پھرتے تھے گلعذاروں میں

بیٹھ کر گھر میں، کڑی راہوں کو سر کرتا رہا   میں وہ رہرو ہوں جو خوابوں میں سفر کرتا رہا
جب سفر میں عمرِ فانی کٹ گئی تو یہ کھلا   میں تو ساکت تھا، زمانہ ہی سفر کرتا رہا

افق نہ دیکھ، افق ہے فریبِ حدِ نظر   زمیں سے جھک کے کبھی آسماں نہیں ملتا

وہی تو در ہے جو صحرا کی سمت کھلتا ہو   وہی تو سر ہے جسے زانوئے جہاں نہ ملے

ابھی کچھ اور کڑی دھوپ میں چلنا ہوگا   ربط اتنا نہ بڑھا سایۂ دیوار کے ساتھ

عشق مسیحا بن کر آیا، ٹوٹا ہوا دل جوڑ گیا   ورنہ عہدِ جوانی میں تھے مرنے کے امکان بہت

زندگی کو اندھیرے سے نفرت سہی   زندگی روشنی کا سفر بھی نہیں

مضمحل ہونے پہ بھی خود کو جواں رکھتے ہیں ہم   ایک سر ہے جس پہ ساتوں آسماں رکھتے ہیں ہم

دیوارِ آگہی میں کھلا ہے درِ جنوں   رستہ دکھائی دینے لگا رہگزار کا

پھول سے اتنا ربط بڑھانا ٹھیک نہیں   قطرۂ شبنم اڑتے اڑتے کہتا ہے

جوشِ دریا کے قرائن یہ بتاتے ہیں ظہیر   موج کھا جائے گی ساحل کے شبستانوں کو

تیر بن کر میں کسی وقت بھی چل سکتا ہوں   رفعتوں کو حدِ محتاط میں رہنا ہوگا

فصلِ خزاں میں کچھ بھی نہ تھا پر رشتوں کی پہچان تو تھی   فصلِ بہار میں سوکھے پتوں کی مانند بکھر گئے لوگ

امید کے آنگن بوسیدہ، وعدوں کی چھتیں کمزور بہت   اور اس پر ہجر کے موسم میں، برسی ہے گھٹا گھنگھور بہت

قیامت بام پر آئی ہوئی ہے   سوا نیزے پہ سورج آگیا ہے
ہر اک قطرے کے نازک آئنے میں   سمندر اپنا چہرہ دیکھتا ہے
جو دامن پر ابھی لَو دے رہا ہے   یہ تارا آنکھ سے ٹوٹا ہوا ہے

زخم زخم شہروں پر چاک چاک ہے سورج   منتشر ہیں کرنوں کی کرچیاں ہواؤں میں

اُس نے جب پیار کے لہجے میں پکارا مجھ کو   کئی خدشاتِ غمِ دل مرے اندر جاگے
بے ہنر آج ہنرمند بنے پھرتے ہیں   سو گیا تیشۂ آزر تو یہ پتھر جاگے

166916
Date 2-9-96

ناخدا اب خدا پر بھروسہ کریں   کشتیاں تو سپردِ خدا ہوگئیں

اِدھر کارِ زمیں سے ایک پَل فرصت نہیں ملتی   اُدھر واعظ سُناتا ہے فسانے آسمانوں کے

وہ گرد اٹھی کہ دن کو جلانے پڑے چراغ   یہ حادثہ بھی آج سرِ رہگزر ہوا

جن کی کج کلاہی سے راستی کو شرم آئے   ہم زمیں نشیں اچھے ایسے سرفرازوں سے

ہم کو ساری عمر کی اختر شماری کے عوض   کچھ ملا تو بس یہی راتوں کی تنہائی ملی

ہم نے اندھیری جھونپڑیوں میں نیرِ تاباں دیکھے ہیں   ہم نے قطروں کو دیکھا ہے دامن میں طوفان لیے

چلو دن بھر کی بے مصرف تھکن ہی ساتھ لے جائیں   بوقتِ شام خالی ہاتھ گھر جانا نہیں اچھا

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب   ہمارے بعد اندھیرا نہیں، اجالا ہے

اے نورِ گل کو دیکھنے والے، مجھے بھی دیکھ   خود جل رہا ہوں اور چراغِ چمن ہوں میں

عمر بھر تو خار پیمائی میں گزری تھی ظہیرؔ
مر گئے تو بارشِ برگ و سمن ہونے لگی

مشتاق شاد

چراغِ آخرِ شب

ظہیر کاشمیری کیلئے ایک نظم

کبھی قریب، کبھی دور کے حوالے سے
کبھی دیئے تو کبھی طور کے حوالے سے
جہاں بھی ذکر چھڑے گا حسین کرنوں کا
تو نام آئے گا اک نور کے حوالے سے

وہ نام جس میں کئی چاند جگمگاتے ہیں
وہ نام جس میں کئی گیت گنگناتے ہیں
وہ نام روح میں تاثیر گھول دیتا ہے
وہ نام سن کے جسے دل بھی جھوم جاتے ہیں

وہ نام جس سے غزل کا بدن ملائم ہے
وہ نام نظم کا پندار جس سے قائم ہے
وہ نام شعر کو ملتا رہا ہے جس سے دوام
وہ نام آج بھی اقلیمِ فن میں دائم ہے

خیال و فکر تھے اُس کی سپاہ میں جیسے
حروف اُس کے قلم کی پناہ میں جیسے
لٹا رہا تھا زمانے پہ یوں متاعِ سخن
پڑا ملا ہو خزانہ یہ راہ میں جیسے

کبھی جو اپنے خیالوں سے بات کرتا تھا
تو زندگی کے حوالوں سے بات کرتا تھا
جمال اُس کا تھا وادی کے مرغزاروں سا
جلال اُس کا ہمالوں سے بات کرتا تھا

بکھر گئی وہ دیئے کی شعاع پچھلے برس
اجڑ گئی وہ دلوں کی متاع پچھلے برس
اُسی کا نام تھا یارو "ظہیر کشمیری"
اُسی کو سب نے کیا تھا وداع پچھلے برس

جدائیوں سے ملن کی اساس بنتی ہے
کپاس شاخ سے کٹ کر کپاس بنتی ہے
یہ دوریاں ہی نئی قربتیں بناتی ہیں
یہ نارسائی، رسائی کی آس بنتی ہے

خدایا اُس کو وہاں اور استقامت دے
چراغِ آخرِ شب تھا، اسے ہوامت دے
یہاں وہ کرتا تھا شعر و سخن کی تاجوری
وہاں بھی اُس کو غزل شہر کی امامت دے

احمد ظفر

ظہیر کاشمیری کی یاد میں

یات اِک سلسلہ رہی ہے غمِ جہان کا
بھی وسیلہ یہی بنی ہے نشاطِ جاں کا
کسی نے ہر سو مسرتوں کو سجا لیا ہے
سی نے لقمہ بنا دیا خود کو خاک داں کا
، آئینہ جس میں عکس کوئی نہ نقش کوئی
کھائی اس میں دیا ہے منظر مگر خزاں کا

فر کو زادِ سفر سمجھ لیں، یہ سوچتے ہیں
ہ شب کو حسنِ سحر سمجھ لیں، یہ سوچتے ہیں
م اپنے اندر کے جنگلوں سے گزرنے والے
جر کو سب بے ثمر سمجھ لیں، یہ سوچتے ہیں
ڑی زمانے کی دُھوپ سر پہ اگر کھڑی ہے
گھر کو بے بام و در سمجھ لیں، یہ سوچتے ہیں

کیسا طوفاں چراغ دل کے بجھا گیا ہے
د ساتھ لے کر ہمارا سب کچھ چلا گیا ہے
دل کی راہوں پہ ثبت ہوتے رہے ہیں برسوں
بتوں کے وہ نقش سارے مٹا گیا ہے
شہر میں کس نے ماتمِ آرزو کیا ہے؟
یں تو روتی تھی، آسماں کو رُلا گیا ہے!

گفتار خیالی

حضرت ظہیر کاشمیری کی وفات پر

خزاں رسیدہ چمن کو بہار کیا جانے
غمِ حیات کو عشرت گزار کیا جانے
جو دفن ہو چکا اس کا جہاں سے کیا رشتہ
جو لاش ہم نے اُتاری، مزار کیا جانے
چراغِ علم کو تاریک شب سے کیا نسبت
قمر کے نور کو اختر شمار کیا جانے

قدم قدم پہ ملی جس سے منزلوں کی نوید
نویدِ منزلِ جاں، رہگزار کیا جانے
سکوتِ مرگ ہے طاری کمالِ عرفاں پر
کمالِ علم کو ناپختہ کار کیا جانے
خدا نے کیسے بنایا اُسے بصیرِ علوم
یہ معجزاتِ خدا ۔ سوگوار کیا جانے
فرازِ علم پہ پہنچا تھا آدمِ خاکی
یہ رازِ عالمِ خاکی ــ غبار کیا جانے
غریقِ کرب و الم ہے یہاں فقط گفتار
غریبِ شہر کا غم شہریار کیا جانے

احمد فقیہ

ظہیر کشمیری کی نذر

آگ اُگلتی زرد دوپہریں
گہری، زہری ناگن راتیں
کھیت وطن کے خشک پڑے ہیں
اور سمندر پہ برساتیں !

ویراں ہیں ہم اپنے گھر میں
بوڑھے ٹوٹے وقت کھنڈر میں
جیسے اپنی ہتھیلی کھولے
بہت قدیم درخت کھڑے ہوں!

ہم تو پہلے ہی تنہا تھے
اور خاموش بھی ایسے جیسے
صدیوں سے پُرشور نگر میں
تنہائی میں گِھرے ہوئے بت !

دِل شکنی کے اس موسم میں
تنہائی کے کُنجِ عدم میں
بے وطنی کا شہر بسا کر
تم نے اور کیا کچھ تنہا !!

(سویڈن)

سید علی عباس جلالپوری

(ظہیر کاشمیری کی زمین میں)

○

ضبطِ فغاں کے بندھن ٹوٹے آج سے ہم بیباک ہوئے
جُرمِ وفا کے داغ تھے جتنے اشکِ رواں سے پاک ہوئے

کیسے کیسے پھول کِھلے جو بادِ خزاں نے نوچ لیے
کیسے کیسے بلبل چہکے، جن کے سینے چاک ہوئے

کیسے کیسے سپنے تھے جو راہِ طلب کی دُھول ہوئے
کیسے کیسے ارماں تھے جو خاک میں مِل کر خاک ہوئے

راکھ کریدی، کچھ نہ مِلا بیچارے غم کے ماروں کو
پیار کے انگارے کجلائے، جلتے بُجھتے خاک ہوئے

لوگ حریمِ ناز میں سیّد شمعِ مراد جلاتے ہیں
ہم تو اپنے ہی شعلوں کے آپ خس و خاشاک ہوئے

پروین شاکر کی شاعری

قیصر تمکین (برطانیہ)

پروین شاکر کے انتقال پر تمام ادبی و شعری حلقوں میں متفقہ طور پر سوگ منایا گیا۔ یہ ذرا غیر معمولی بات تھی۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب کسی علاقے، گروہ یا ادبی اکھاڑے کا کوئی ممتاز فرد داعی اجل کو لبیک کہتا ہے تو اس حلقے، گروہ یا اکھاڑے کو چھوڑ کر باقی جگہوں پر ماتم محض سرسری طور پر اور خانہ پری کے لیے ہوتا ہے۔ اس طرح کی جانبداری معمولی لوگوں کو تو چھوڑیے خود جوش اور منٹو تک کے بارے میں دیکھنے میں آئی۔ کہنے کو تو سب نے رسمی تعزیتی کلمات استعمال کیے مگر لوگ ایسے واقعی بہت کم تھے جنہوں نے جانے والے کی مفارقت میں حقیقی احساس زیاں کا اظہار کیا۔[۱]

پروین شاکر کی ناگہانی وفات پر جہاں تک نظر جاتی ہے تقریباً تمام ادب شناس سچے دکھ اور رنج سے مملو ہیں۔ اس کی دو تین وجوہ تو بہت واضح ہیں۔ اول یہ کہ وہ بہت کم عمر تھیں۔ دوسرے یہ کہ پاکستان میں ٹریفک کے حادثات اس طرح ہوتے ہیں کہ ہم غصے سے تلملا کر رہ جاتے ہیں اور کچھ بھی کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اگر کوئی فطری حادثہ یا سانحہ ہو تو صبر آجاتا ہے مگر اس نوعیت کے حادثے جن میں پروین شاکر جیسی مقبول شاعرہ کو جان سے ہاتھ دھونا پڑیں، حادثے نہیں بلکہ قتل عمد میں گنے جائیں گے اور ان پر رنج اور غصہ بالکل حق بجانب ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی فکر کی روانی کے دور میں تھیں۔ بہت اعتماد سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ابھی بہت کچھ اور بہت معیاری سخن پارے ہم کو دے سکتی تھیں۔ یہ وہ عمر ہوتی ہے جب عام طور پر لکھنے والے قدرے تھکے تھکے نظر آنے لگتے ہیں یا خود اپنے مقرر کردہ معیار سے بھی کم تر درجے کی چیزیں پیش کرنے لگتے ہیں۔ دسمبر 1994ء کے اواخر میں جب ان کی وفات ہوئی اس وقت بھی وہ انہماک سے لکھنے پڑھنے میں مصروف تھیں۔ دسمبر ہی کے فنون کے شمارے میں ان کی تین بڑی اچھی تخلیقات شائع ہوئیں۔

بہت دنوں کی بات ہے ڈیلن ٹامس کے مرنے پر ایک ادیب نے لکھا تھا:

To die at the age of 49 is dying very young.

اس کے دو ہی تین برس بعد مجاز کا انتقال ہوگیا تو میں نے یہ قول بڑی آزادی سے اپنے ایک مضمون میں اس طرح استعمال کر لیا جیسے یہ میرا اپنا ہی خیال ہو۔ لیکن آج بہت دنوں بعد پھر میں یہ جملہ استعمال کرنے پر مجبور

ہوں مگر اس بار اس اعتراف کے ساتھ کہ یہ میرا خیال نہیں بلکہ موجودہ سائنسی و طبی ترقیوں کے دور میں اس کی حیثیت ایک کلئے کی سی ہے۔ کوئی ڈیڑھ پونے دو سو برس پہلے جین آسٹن نے لکھا تھا کہ اچھی خواتین کو چالیس کی عمر کے لگ بھگ مرجانا چاہیے۔ لفظ "اچھی" سے اس کی کیا مراد تھی؟ یہ معلوم نہ ہوسکا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جین آسٹن خود ایک اعلیٰ پائے کی ناول نگار تھی اور چالیس بیالیس سال کی عمر میں مرگئی، مگر وہ پرانی--- بہت پرانی کہاوت ہے۔ آج اس کے قول سے متفق ہونا مشکل ہے۔

پروین کی وفات کے حادثے کی تفصیل یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ اپنی گاڑی پر اسلام آباد کی مارگلہ روڈ سے گزر رہی تھی۔ ایک تیز رفتار بس نے قریبی اڈے سے سواریاں اٹھانے کی عجلت اور لالچ میں، ایک بہت مصروف چوراہے کی پروا نہیں کی اور پروین کی گاڑی کو بائیں طرف سے ٹکر ماردی جس سے اس کی گاڑی قلابازیاں کھاتی ہوئی سو گز تک لڑھکتی چلی گئی۔ اس کی گاڑی کا ڈرائیور موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔ پروین شاکر کو شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا جہاں وہ ایک گھنٹے کی کشمکش کے بعد دم توڑ گئی۔

پروین کی تاریخ پیدائش 24 نومبر 1953ء بتائی جاتی ہے۔ دسمبر 1994ء میں اس کی عمر 42 سال تھی۔ اس نے کراچی میں تعلیم پائی اور ادبیات میں معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ بعد میں وہ سرکاری ملازمت میں شامل ہوگئی اور اسی دوران ہارورڈ یونیورسٹی سے بھی متعلق رہی۔ وفات کے وقت وہ اسلام آباد میں کسٹمز شعبے میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھی۔

اس کی وفات کا حادثہ ایسے وقت ہوا جب دنیائے ادب کو اس سے بہت اعلیٰ اور جائز توقعات تھیں اس مضمون کا بنیادی مقصد ہی یہ اظہار تاسف ہے کہ وہ ایک صاحب طرز اور صاحب فکر شاعرہ تھی اور ا کام مکمل کرنے سے پہلے ہی بزم ادب سے اٹھ گئی۔ لیکن اشک شوئی اس امر پر بھی کہ جاسکتی ہے، کہ اپنی عمری کے باوجود اس کا شعری سرمایہ کسی سے کم نہیں ہے۔ ہمارے سامنے اس کا جو کچھ کلام ہے وہ اتنا و اور معتبر ہے کہ اچھے سے اچھے معمر شعراء کے سرمائے کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

کم عمری میں فنکاروں کی موت پر اچھی خاصی بحثیں رہی ہیں۔ اور خیال اس سلسلے میں کرسٹو فرما (29 برس) کیٹس (27 سال) سلویا پلیتھ (30 سال) کا بھی آتا ہے۔ ان بلند پایہ فنکاروں کی ناوقت موت ہمیشہ بزم تہذیب کے روشن فانوسوں کے گل ہو جانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ محض قیاس ہی کہا جاسکتا ہے اگر مذکورہ فنکار مزید زندہ رہتے تو اور کیا کیا لکھ سکتے تھے۔ مگر عام طور پر اس قیاس آرائی سے کوئی ف نہیں ہوتا کیونکہ جو لوگ لمبی عمروں تک زندہ رہتے ہیں ان میں بھی بیشتر اوقات فکری و فنی انحطاط ہونے لگتا ہے۔ تاریخ ادب ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ شروع عمر میں چونکا دینے والے فنکار آخر میں اپنے ابتدائی اور قابل یادگار کارناموں سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

اسی سلسلے میں ذہنی ارتداد کی بھی عبرتناک مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ بہت بلند اور آتش نوا مغنی بھی عمر کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر صرف عہدوں اور انعام و اکرام کے حریص بن جاتے ہیں۔ پھر ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو پچاس پچپن کی عمر پر پہنچ کر صرف اپنے ہی میں مگن رہنے لگے

ور شروع عمر میں جو بویا تھا اس کی کاشت پر ہی قناعت کرنے لگتے ہیں۔ یہ تو صرف غالب، اقبال یا ٹیگور کے رتبے کے فنکار ہوتے ہیں جن کی تخلیقی صلاحیتوں میں مناصب، عہدوں اور رابطہ عامہ کے جدید وسائل کی کارفرمائی نہیں ہوتی بلکہ ان کے فکر و فن کے سوتے آخر وقت تک خشک نہیں ہوتے۔ اس طرح کے فنکار پنے کمال کی سیڑھیوں سے نیچے نہیں اترتے بلکہ بقول شاعر "ہمیشہ فکر بلندی بلند بینوں کو" کی مثال ہوتے یں۔

تو یہ سوچنا کہ پروین شاکر اگر چالیس برس اور زندہ رہتی اور آخر وقت تک جہد فکر میں مصروف رہتی تو ادب اور شاعری کو اس سے کیا فائدہ ہوتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ زندگی کی دوسری مصروفیتوں میں پھنس کر بعض ہم عصر خواتین کی طرح جلد ہی ادب سے تائب بھی ہو جاتی یا اس کی تخلیقی صلاحیتوں کے سوتے اس طرح خشک ہو جاتے کہ وہ "بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے۔" کے مصداق اپنی خود نوشت رقم کرنے یا اپنے بارے میں نمبروں اور گوشوں کی اشاعت کی سیاست میں آلودہ ہو جاتی۔ فی الحال تو ہم کو ایک خوش اسلوب اور شائستہ فکر و توازن شاعرہ کی ناوقت وفات پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے یہ سوچ کر قناعت کرنا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کر گئی وہی بہت ہے۔ اب سوال آتا ہے اس "بہت" کا کیونکہ بات جب بھی پروین شاکر کی آئے گی تو بحیثیت شاعر اس کی دیکھ ریکھ اور چھان بین میں اسی "بہت" پر ہی زور دیا جائے گا اور اس کا سخت سے سخت ترین ناقد بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گا کہ یہ "بہت" محض رسمی بہت نہیں بلکہ واقعی بہت کچھ ہے۔

اردو شعر و ادب کی محفل میں ہمارے دیکھتے دیکھتے بعض بہت معیاری شاعرات ابھریں اور تھوڑی بہت چمک دکھانے کے بعد جلد ہی شہاب ثاقب کی طرح بجھ گئیں مگر یہ المیہ صرف اردو کا نہیں ہے، پوری ادبی دنیا اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ پروین شاکر کا کلام اپنی نوعیت، طرز ادا، فکر و شعور اور "مقدار" کے اعتبار سے دوسری بہت سی شاعرات سے بہت بہتر ہے۔ جس طرح عصمت چغتائی جیسی بیباک افسانہ نگار کی موجودگی کے باوجود قرۃ العین حیدر نے اپنے طرز ادا اور فنی شعور کا لوہا منوا لیا، اسی طرح پروین شاکر نے بھی اپنی مختصر اور انتہائی مصروف زندگی کے باوجود اتنا ترو تازہ اور شاداب کلام چھوڑا کہ (برا ماننے کی بات نہیں محض اظہار حقیقت ہے) بعض بڑی بڑی مترنم شاعرات "باسی" اور صف دوم میں محبوس نظر آنے لگیں۔

یہاں ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہے۔ جب قحط الرجال ہو تو کوئی بھی بھلا مانس فوق البشر کا اعزاز حاصل کر سکتا ہے۔ کسی بھیانک ویرانے میں ایک ہی پھول متاع بہار کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کسی رنگا رنگ چمن میں اپنی رنگینی، شگفتگی اور سرمستی منوانا آسان نہیں ہوتا۔ اگر سن چالیس یا پچاس کی دھائیوں میں بعض قبول صورت، خوش آواز اور چھم چھم کرتی شاعرات غیر ضروری طور پر مقبول ہو گئیں تو اس کا سبب یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مخصوص ماحول میں اپنی نوعیت و انفرادیت کی بنا پر مہمان خصوصی قرار دی گئیں۔ لیکن ایک ایسے دور میں جب چاروں طرف خوش گو اور خوش فکر شاعرات کی چہل پہل ہو، کسی ایک کم سن شاعرہ کا

محض اپنی نوائے بلند کی بنا پر "محرم رازدرون بت خانہ" کی اہمیت اختیار کر لینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ دور غالب میں ہر شاعر "جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔" کی تمثیل تھا۔ غالب کی عظمت ہی یہی ہے کہ مومن و ذوق جیسے جید صاحبان کمال کی موجودگی میں اس نے اپنی فکری تب و تاب سے قدر شناسان ادب کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ یہی کمال پروین شاکر کا بھی ہے کہ ایسے زمانے میں جب کسی کا نئے لب و لہجے میں شاعری کرنا کوئی اہم یا انوکھی بات نہیں رہ گیا تھا، وہ چپکے سے بزم ادب میں داخل ہوئی اور فوراً ہی جوہر شناسوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کی شاعری کی عمر لگ بھگ اٹھارہ بیس برس رہی ہوگی۔ یہ مدت دیکھنے میں تو بہت معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی دوسری سرگرمیوں اور مصروفیتوں کے پیش نظر کچھ زیادہ نہیں ہے، خاص طور پر اس لیے کہ وہ ایک طرف تو اپنی سرکاری یا پیشہ ورانہ پابندیوں میں مبتلا تھی اور دوسری طرف گھریلو ذمہ داریوں اور شوہر بیٹے کے مسئلوں میں بھی گھری ہوئی تھی۔ پھر بھی اس نے اس مدت میں اتنی سرعت سے ترقی کی کہ اچھی خاصی قادرالکلام ہو گئی اور آج اس کے بزم علم و ادب سے رخصت ہونے کی بنا پر جو ایک سناٹا سا نظر آ رہا ہے اس کا سبب اس کی یہی عظمت فکر و اسلوب ہے۔

اگر کوئی تفصیلی مضمون پروین شاکر کے بارے میں لکھا جائے تو اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی پوری طرح بحث کی جائے گی۔ تنگ نظری سے اجتناب، محدود قومی و علاقائی تعصبات سے مبرا وہ ایک وسیع القلب عالمی شہری ہونے کے باوجود اپنے ملک و قوم کی نمائندگی اس فہمیدگی سے کرتی ہے کہ اس کے قومی تشخص اور سیاسی بصیرت کی اطلیت (Brocade) خیرہ کن جگمگاہٹ کے بجائے شبنمی جھلملاہٹ کا تاثر پیدا کرتی ہے۔ اس کی سماجی و سیاسی اور سرکاری مصروفیتیں بھی اپنی طرف پوری طرح مطالبہ کناں ہیں۔ ا میں دوسروں کے دکھ سکھ کو سمجھنے کا مادہ بھی ہے اور ایک بڑی عالمی ادبی برادری میں رکنیت کی اہمیت احساس بھی۔ ان حوائج سے الگ وہ بالکل ادبی شخصیت بھی ہے اور اس میں بھی وہ کسی ایک محدود دائر میں محو گشت نہیں ہے۔ وہ نثر نگار بھی ہے اور ادبی و صحافتی کالم نگار بھی۔ لیکن غرض ہم کو فی الحال صرف ا کی شاعری سے ہے۔ اس شاعرانہ شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ ایک میں وہ ایک سادہ کاری کی طرح نظم نگار روپ میں سامنے آتی ہے۔ اس کی تقریباً تمام نظمیں روایتی قیود سے آزاد بلکہ بعض تو نثری نظمیں ہیں۔ شا کی حیثیت سے اس کا دوسرا زیادہ جگمگ کرتا روپ غزلگو کا ہے۔

ایمانداری کی بات یہ ہے کہ پروین شاکر کی آواز اپنی ہے اور اس نوا پیرائی کے لیے اپنی لفظیات اس نے منفرد تراشی ہیں۔ اس کی فکر اپنی ہے اور اس کے دکھ سکھ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے انوکھے اچھوتے ہیں۔ ادب کی دنیا میں عام طور پر دو چیزوں کا فقدان ہوتا ہے۔ اول تو یہ کہ لکھنے والے کا اپنا طرز اظہار ہو یا یوں کہئے کہ فن کار صاحب طرز و ادا ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ عصری تقاضوں سے بھی بھ واقفیت رکھتا ہو۔ "لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے۔" کے دعویدار مردوں کی محفلوں میں تو دو ایک میں آ جاتے ہیں مگر خواتین کی دنیا میں لکھنے والوں کی نظر عام طور پر (عصمت کی حیثیت استثنائی ہے) ایک پہلو یا ایک ہی رمز کی شناسا ہوتی ہے۔ پروین شاکر کے سلسلے میں ہم کو ہمہ جہتی فکر کا احساس ہوتا ہے۔

اعریا ادیب کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے ایک آسان طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے معاصرین میں سے اس ا تقابل کیا جائے۔ مگر پروین کا مقابلہ کسی دوسری شاعرہ سے کرنے کا کوئی تک ہی نہیں۔ اپنے طرز فکر، طرز دا اور طرز مشاقی میں وہ بالکل یکتا و منفرد اور انوکھی ہے۔ ایک طرف تو وہ انگریزی اور ہندی کے موتی چنتی ظر آتی ہے۔ تو دوسری طرف اردو کے ادب عالیہ کے قدیمی سرمائے سے گہری واقفیت و وابستگی کا بھی ثبوت بتی ہے۔ چنانچہ اکثر ترکیبوں میں جو خود اس کی اپنی وضع کردہ ہیں، پرچھائیاں ہم کو میر و مرزا کی بھی ملتی ہیں ور یہ وہ خوبی ہے جو معمولی پڑھے لکھوں کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے زبان و ادب سے آشنائی ہی میں بلکہ دانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی ترکیب وضع کرنے اور اپنی لفظیات کی جے مالا گوندھتے وقت وہ بھی کبھی ناقابل قبول ندرت پر بھی مائل نظر آتی ہے۔

یہ کہنا غالباً کسی طرح کے غیر ضروری ہونے کا شاخسانہ نہ ہوگا کہ نظم گو پروین شاکر بہت ہی کمزور اور خام ہے۔ تقریباً سبھی نظمیں آورد کا نتیجہ ہیں۔ شاعرہ نے کچھ کہنا ضروری سمجھا۔ محض فیشن کے طور پر، یا ادبی جغادریوں کو متوجہ کرنے کے لیے یا پھر خواہ مخواہ کی ترقی پسندی کا مظاہرہ کرنے کے لیے۔ اور آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر ایک نمونہ (Pattern) وضع کر دیا۔ چنانچہ دو ایک نظموں کو چھوڑ کر۔ یہ وہ ہیں جن میں ارکان و اوزان کی پابندی موجود ہے۔ باقی تمام نظمیں بھرتی کی ہیں۔ ان میں بھی بہت ناقص اور کمزور وہ نظمیں ہیں جن میں انگریزی کی پیوند کاری کی گئی ہے۔ مثلاً:

کلچر کی باگ ڈور
پارٹی Activisrts نے سنبھال لی ہے (پھر وہی فرمان۔ "انکار")

اسی طرح "انکار" کے صفحہ 193 پر ایک نظم ہے "ہم سب ایک طرح کے ڈاکٹر فاسٹس ہیں۔" نظم کی آخری سطریں دیکھیے۔

سو زندگی کی Wall Street کا ایک جائزہ یہ کہتا ہے
کہ آج کل قوت رکھنے والوں میں
عزت نفس بہت مقبول ہے!

اس نظم کا خیال اپنی جگہ پر بہت اچھا ہے اور اگر شاعرہ سنجیدگی سے توجہ کرتی تو یہی بات کہ:

کوئی اپنے شوق کی خاطر
اور کوئی کسی مجبوری سے بلیک میل ہو کر
اپنی روح کا سودا کر لیتا ہے

بہت ہی خوبصورت ڈھنگ سے بھی کہی جا سکتی تھی۔ پروین بحیثیت نگینہ ساز یا بنت کار کے پھوہڑ نہیں تھی۔ وہ پورے التزام نفاست کے ساتھ اپنی بات کہنے پر قادر تھی۔ پھر اس نے یہاں تساہلی سے کام کیوں لیا؟ چنانچہ بات وہیں پہنچتی ہے کہ نظم گوئی میں پروین شاکر کے یہاں متاع آمد نہیں بلکہ اندوختہ آورد ہی سب کچھ ہے۔ ایک نظم کا عنوان ہے "I'll Miss You" یا پھر دیکھیے۔ "کلفٹن کے پل پر":

کلفٹن کے پل پر
جس سے شہر کی الیٹ گزرتی ہے

یہ نظمیں پروین کے مجموعے "انکار" میں نثری نظموں کے ضمن میں شامل ہیں۔ مگر ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں---- اور یہ جبر بالکل فطری ہے---- کہ پروین ہمہ نغمہ و ہمہ موسیقی شاعری کرنے پر قادر ہونے کے باوجود اس طرح کی نثری نظمیں کیوں لکھتی ہے۔ ایک قدرتی فنکار زمانے کی روش یا فیشن یا دنیا کیا کہے گی کے لاحقوں سے الگ ہو کر اپنا پیرایہ تخلیق وضع کرتا ہے۔ پروین شاکر کو اس طرح کے ادیبوں کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا جن کو بناوٹی یا انگریزی میں Phoney کہا جائے۔ کیا پروین شاکر اگر یہ نظمیں نہ لکھتی تو ادبی محفلوں میں اس کی حیثیت گھٹ جاتی؟

انگریزی سے کسب فیض ایک چیز ہے اور انگریزی کی نقالی بالکل ہی دوسری ذہنیت ہے۔ اردو میں غیر ضروری طور پر انگریزی جملوں یا لفظوں کا استعمال صاحب مضمون یا ادیب و شاعر کے احساس کمتری کا غماز ہوتا ہے۔ جس طرح بعض لوگ (نیم خواندہ یا خواندہ) انگریزی ملبوس میں لپٹ کر اپنے کو "شرفا" یا وضعدار لوگوں میں شمار کیے جانے پر زور دیتے ہیں' اسی طرح نیم ترقی یافتہ حضرات یا عام طور پر احساس کمتری کے مارے لوگ زبردستی انگریزی اصطلاحات کی بیساکھیوں کا سہارا لیتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ پروین شاکر کے نہ تو شجرے میں کوئی شاخ نہال غم ایسی تھی جو ہری ہو اور نہ ان کی تہذیب و تعلیم میں کوئی سقم تھا۔ پھر وہ "اتراہٹ" یا انگریزی ہی کی ترکیب Upstartish Showman Ship پر کیوں آمادہ ہے' اس کا سبب جاننے کے لیے نفسیاتی تجزیے کی ضرورت ہوگی۔ دنیا کے زیادہ تر قارئین پسماندہ حالات و طبقات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ وہاں اپنی روایات اور اپنی تہذیب کے بجائے ایک سامراجی زبان کی ترکیب استعمال کرنا کہاں تک قابل قبول ہوسکتا ہے۔ انگریزی زبان و ادب ایک الگ چیز ہے اور انگریزی لسانی سامراج بالکل الگ شے۔ ایک اچھی خاصی ترقی پذیر زبان میں سامراجی لسانیات کی ترویج کر کے کیا ہم اپنے تہذیب و تمدن سے غداری کے مرتکب
نہیں ٹھہرائے جاسکتے؟ انگریزی سے مرعوب ہونے کا زمانہ بھی ختم ہوچکا ہے۔ پھر اب کیوں اہل پاکستان او
خاص طور پر ادیب و شاعر اس سے مرعوب ہیں۔ یہ بھی ایک قابل غور اور قابل مطالعہ موضوع ہے۔ اس موضوع کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ پروین شاکر جیسی شائستہ اور پڑھی لکھی شاع
انگریزی کے غیر ضروری استعمال پر مصر ہے جبکہ اردو پر اس کی گرفت بہت ہی مضبوط اور مستند ہے۔

تاہم پروین شاکر کی جھوٹی' بناوٹی اور بھرتی کی نظموں کا اگر کوئی علاحدہ مجموعہ مرتب کیا جائے تو ا
میں بھی ایک آدھ اچھی نظم ایسی مل جاتی ہے جہاں شاعرہ نے بیساختگی سے کچھ کہا ہے۔ اس طرح کی نظمو
میں "چاند کی روشنی میں لکھی گئی دو نظمیں" (انکار صفحہ 181) ضرور شامل کی جائیں گی۔ مگر یاسر عرفات ۔
لیے ایک نظم۔ فیض صاحب کے لیے' فیض کے فراق میں۔ قرۃ العین حیدر۔ سلمیٰ کرشن چندر۔ میکینہ و
جیسی نظمیں اگر پروین کے کلام سے نکال دی جائیں تو بہتر ہوگا۔ بھرتی کی بھی دو ایک نظمیں ایسی ہیں جن
پروین کے منتخب کلام میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کی نظموں میں "نذر امیر خسرو" (خوشبو) ایک ا

نظم کہی جاسکتی ہے۔ اس میں آمد نہ ہونے کے باوجود بیساختگی کا گمان ہوتا ہے۔ بہت سی نظموں کے عنوانات بھی انگریزی میں ہیں۔ یہ نہ تو کوئی بڑی بدعت ہے اور نہ کوئی انوکھی بات۔ ہاں قابل گرفت اردو نظموں کے وہ انگریزی عنوانات ہیں جو لکھے بھی انگریزی میں گئے ہیں مثلاً:

A woman's pride, Lady of the House,
Good to see you, Hot line,
Vanity thy name is....., San Francisco,
i'll miss you. وغیرہ وغیرہ

سوال یہ ہے کہ یہ بچپن کی اتراہٹ آخر میں، پختگی عمر میں، کیوں نمودار ہو رہی ہے؟ اگر قرۃ العین حیدر کی طرح پروین شاکر بھی شروع شروع میں انگریزی سے واقفیت کا مظاہرہ کر لیتی تو بات قابل درگزر تھی مگر "خوشبو" جیسا بلند پایہ مجموعہ پیش کرنے کے بعد فکری، ذہنی اور فنی اعتبار سے پختہ تر شاعرہ پروین شاکر---- بقول کلیم الدین احمد---- "انڈر گریجویٹ" ذہنیت پر کیوں نازاں ہے۔ کیا وہ کسی تخلیقی خشک سالی سے ہراساں تھی یا اپنے وجود کا یقین دلانے کے لیے سرود و ساز کے بجائے نوبت اور ڈھولک پر قناعت کی منزل پر پہنچ رہی تھی! شاعر و ادیب اگر واقعی عوام الناس سے رابطے کے لیے قلم اٹھاتا ہے تو اس کا کسی غیر ملکی اور خاص طور پر سامراجی زبان سے رشتہ کہاں تک جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟ اگر ادب کا مقصد واقعی عوام کی بہتری اور عوام سے دوستی ہے تو پھر پاکستان کے ان عوام کے لیے جن کو اردو میں لکھنے پڑھنے کی مشکل ہے، اس طرح کی سوٹڈ بوٹڈ نظمیں کس طرح قابل قبول ہو سکتی ہیں!

اس بات کی ایک سرسری نفسیاتی توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ پروین شاکر کے گھرانے یا اعزاء میں ایسے قدامت پسند لوگ ہوں گے جو عورتوں کی تعلیم کو بری نظروں سے دیکھتے ہوں یا پھر وہ عورتوں کی شاعرانہ و ادیبانہ سرگرمیوں کو خرافات سمجھتے ہوں، ان کو جلانے چڑانے کے لیے پروین شاکر نے شاید اس طرح کی انتہا پسندی اختیار کی ہو۔ یہ باتیں بہت صفائی سے یوں کہی گئی ہیں کہ پروین شاکر لفظیات کے معاملے میں قطعی تہی مایہ نہیں۔ ایسے ناپختہ یا چھچھورے ادیب جن کے پاس اپنے نفس مضمون کی ادائیگی کے لیے اصطلاحات و تراکیب نہ ہوں، اگر انگریزی کا سہارا لیں تو ان کی کم مائیگی پر افسوس کیا جاسکتا ہے اور اس کے ساتھ ان کو معاف بھی کیا جاسکتا ہے مگر تعجب یہ ہے کہ پروین شاکر کے خمیر میں اردو کے اعلیٰ ادب کی خوبیاں رچی بسی ہوئی ہیں، اس کے باوجود وہ انگریزی کو اپنانے پر مائل ہے۔ مثلاً اردو کی ترکیب "کوبکو" کا جس طرح اس نے جگہ جگہ استعمال کیا ہے وہ پروین شاکر کے اعلیٰ ذوق کی دلیل ہے۔ اس طرح کا متین اور بیساختہ استعمال میر کے بعد کے شعرا میں نظر ہی نہیں اتا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ "کوبکو" کو پروین شاکر نے نئی زندگی عطا کر کے نئے پس منظر میں لا کر نیا پیراہن عطا کر دیا ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ آزاد نظموں یا نثری نظموں میں لفظوں کی حرمت کا بھی کوئی خاص خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ اگر غزلوں میں کہیں لفظ یا ترکیب میں جھول نظر آئے تو قابل معافی ہے کیونکہ وہاں اوزان

و بحور کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ مگر نظموں میں "پر" کی جگہ "پہ" کا استعمال محض تساہلی ہے۔ اور یہ وہ تساہلی ہے جو پروین کی نہ تو فطرت ہے اور نہ اس کا شعار۔ وہ تو بحیثیت شاعر ایک بہت ہی محتاط مشاطہ ہے۔ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ یہ تساہلی سبب اس امر کا ہے کہ آزاد نظمیں یا نثری نظمیں لکھنے والی پروین شاکر شاعرہ نہیں بلکہ "پرگو" متشاعر ہے۔ اس کی زیادہ تر نظمیں کسی ایسے سیاسی لیڈر کی یاد دلاتی ہیں جس کو نہ عوام سے کوئی علاقہ ہے اور نہ نفس مضمون سے کوئی واقفیت۔ مگر پھر بھی اس کو ایک جلسہ عام میں تقریر کرنا لازمی ہوتا ہے کیونکہ یہ اس کے فرائض میں شامل ہے۔ اگر وہ بے تکی ادھر ادھر کی تانیں نہ اڑائے گا تو لوگ بھی کہیں گے کہ ------ آج غالب غزل سرا نہ ہوا۔

اس تمام "تنقیص" کے باوجود یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نظم گو پروین شاکر کا ایک پہلو اور بھی ہے جہاں وہ ایک ماں ہے۔ اس طرح کی نظموں میں اخلاص بھی ہے اور دل نشینی بھی۔ جن نظموں میں اس نے بحیثیت ماں کے کچھ کہا ہے وہ اپنی اثر آفرینی میں واقعی بے مثال ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ (ممکن ہے اس کے قریب کے لوگ اس بارے میں کوئی روشنی ڈال سکیں) اس کا بیٹا جو اس کی ذاتی کائنات کا محور ہے، اس کی جدائی کا خوف اس کو ہمہ وقت فکر مند رکھنے لگا۔ اس بیٹے کے دور ہو جانے کا خوف و اندیشہ اس کو برابر ایک غمناک گہرائی میں مبتلا رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں دو تین نظمیں اپنی شدت، اپنی درد انگیزی اور اپنی بھیگی تنہائی کے اظہار کے لیے مثالی ادب پاروں میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ پروین شاکر کا یہ درد اردو بزم شعر میں ایک بالکل ہی نئے جذبے، نئے احساس اور نئی محرومی کا ہے۔ تاحال ہم کو اس طرح کے درد جدائی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہم کو صرف ایک نظم اقبال کی "ماں کا خواب" یاد آتی ہے۔ مگر وہاں ماں مجبور ہے کیونکہ اس کا بچہ مرچکا ہے۔ ایسی حالت میں اشک افشانی کے باوجود صبر و شکر کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا ہے۔ مگر پروین شاکر کا درد آج کی اس جدید عورت (ماں) کا درد ہے جو اپنی کسلمندی، اپنی نقاہت اور مجبوری کے باوجود زندہ رہنے اور زندگی کا ثبوت دینے پر مجبور ہے۔ ایک ماں کے درد و اضطراب اور تپش قلب کا اندازہ لگانے کے لیے ہم کو پہلے تو "شرارت بھری آنکھیں" (انکار۔ صفحہ 37) پڑھنا ضروری ہے:

مرے گھر میں اجالا بھر گیا
تیری ہنسی کا

قسم کی ممتا بھری سطریں پڑھنے کے بعد ہماری نظر پڑتی ہے "سفر اب جتنا باقی ہے......" پر۔ اس نظم میں جو امر ناگزیر باعث اضطراب ہے وہ ملاحظہ فرمائیے:

زیادہ دن نہ گزریں گے
مرے ہاتھوں کی یہ دھیمی حرارت
تجھے کافی نہیں ہوگی
کوئی خوش لمس دست یاسمیں آکر
گلابی رنگت حدت

تیرے ہاتھوں میں سمو دے گا
مرا دل تجھ کو کھو دے گا
میں باقی عمر تیرا راستہ تکتی رہوں گی
میں ماں ہوں
اور میری قسمت جدائی ہے

یہ ڈر تو ہر ماں کا ہے۔ اور ہر عورت اسی خوف و اندیشے سے دوچار رہتی ہے۔ اس سے بالکل الگ جو ساقط نشاط اندیشے پروین کے غم، اس کے لگاؤ اور اس کی بیکراں تنہائی کا سبب ہیں وہ "جدائی کی پہلی رات" میں اس طرح نمایاں ہیں جیسے ریشم کے کسی نازک ٹکڑے کو خاردار جھاڑیوں میں پھنسا کر گھسیٹ لیا گیا ہو۔ یہ درد اور سوئیوں کی طرح کی چبھن اتنی ناگزیر نہیں ہے جہاں "کوئی خوش لمس دست یاسمیں" اس کے جگر کے ٹکڑے کو الگ لے گیا بلکہ کچھ ایسی ناقابل بیان وجوہ ہیں جن کی بنا پر وہ سسک سسک کر یہی کہہ کر رہ جاتی ہے:

مرے بچے، مرے لال!
فرض تو مجھ کو نبھانا ہے مگر
دیکھ کہ کتنی اکیلی ہوں میں

ایک ماں کی حیثیت سے پروین نے اپنے بچے سے جو کچھ خطاب کیا ہے وہ تاحال (جہاں تک مجھے علم ہے) اردو شاعری میں ایک بالکل ہی نئی چیز ہے۔ یہ نظمیں اپنے جذبے کی تاثیر اور اپنی یاس انگیز گہرائی کے لحاظ سے ایک انوکھا تحفہ ہیں۔ تعجب ہے کہ ہماری شاعرات نے عورت کے اس بنیادی جذبے، یعنی مامتا کی زہرناک شیرینی کی طرف کبھی کوئی دھیان نہیں دیا۔ یہ بیساختگی، تنہائی، اندھیرے بند کمروں میں بھٹکنے اور کچھ نہ پاسکنے کی تہی مائیگی اسی شاعرہ کا مقدر تھی۔ پروین شاکر کی ایک اور نظم بھی اسی ضمن میں ضرور قابل ذکر ٹھہرے گی جہاں شاعرہ نے اپنے بچے کو پہلی بار قلم پکڑے دیکھا ہے۔ ماں کو رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ محبت، نیکی اور سچائی کا ورثہ جو اس کو اپنے باپ سے ملا تھا، اس نے آخر کیا فائدہ پہنچایا (مجھے کیا دے دیا اس نے) لیکن اس کے باوجود زمانے کی ہر تازہ روش سے آگہی کے باوجود ماں۔ پروین شاکر۔ جس پیام انسانیت کی امین ہے وہی ہم سب کے لیے آخری امید کی کرن بھی نظر آتی ہے------:

مگر میں ماں ہوں
اور اک ماں اگر مایوس ہو جائے
تو دنیا ختم ہو جائے
سو، میرے خوش گماں بچے!
تو اپنی لوح آئندہ پہ
سارے خوبصورت لفظ لکھنا

سدا سچ بولنا
احسان کرنا
پیار بھی کرنا
مگر آنکھیں کھلی رکھنا

ممکن ہے ہم انتہائی رجائیت میں نئی نسل کو پیغام امن و خلوص دیتے وقت بہک جائیں مگر زمانے کے خم و پیچ سے بخوبی واقف پروین شاکر بحیثیت ماں کے تمام دائمی سبق دہرانے کے بعد آخری آگاہی بھی دیتی ہے۔ کاش یہ پیغام اس کے تمام اہل وطن کے لیے نصیحت بھی بن سکے۔

یہیں پر سوال آتا ہے پروین شاکر کی تخلیقی روح اور اس کی رنگارنگی کا۔ ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ فکر آفرینی کے لیے وہ جس طرح لفظوں کے پیکر تراشتی ہے وہ اردو شاعری میں ایک بالکل ہی نئی روش ہے۔ اس معاملے میں وہ اردو کی تمام شاعرات اور شاعرانہ روایتوں سے مختلف ہے کیونکہ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، پروین شاکر شکوہ و شکایت نہیں بلکہ طنز لطیف کے پیرائے میں اظہار خیال کرتی ہے۔ یہاں ایسا لگتا ہے جیسے پروین شاکر غزل کے سانچے میں میرابائی کے گیت لکھ رہی ہے۔ یا ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ پروین شاکر اپنی جذبہ صادق کے اظہار میں میرابائی کا روپ دھار لیتی ہے۔

اردو غزل کی دو ایک بہت ہی مکروہ اور قبیح روایتیں بھی رہی ہیں۔ اول تو یہ کہ ہر شاعر اپنا دکھڑا روتا ہے۔ زمانے کا شکوہ کرتا ہے۔ محبوب کی چیرہ دستیوں کا شاکی رہتا ہے۔ اس کو شقاوت قلبی کا مجرم ٹھہراتا ہے اور پھر دنیا کی تمام برائیاں رقیب روسیاہ سے منسوب کر دیتا ہے۔ یہ انفرادیت یا اولیت پروین شاکر کا ہی امتیاز ہے کہ وہ زمانے کی شکوہ سنج نہیں ہے۔ مقدر کا رونا نہیں روئی۔ اور نئی نئی آرائش خم گیسو کے پرستار کو مطعون بھی نہیں کرتی۔ وہ زیر لب ایک بات کہہ جاتی ہے اور تمام شائستگی اظہار کے باوجود بات اتنی سچی ہوئی ہے کہ شاعرہ کا سارا سوز سمٹ کر آجاتا ہے۔

بات صرف اتنی نہیں ہے کہ پروین شاکر بنیادی طور پر غزل کی شاعرہ ہے۔ اصل میں وہ اردو شاعری میں لسانی شائستگی کی علامت ہے۔ غزل کچھ اتنی بدنام اور مبتذل صنف ہے کہ غزل گوئی کو ایک طرح کا عیب سمجھا جانے لگا ہے۔ غزل لکھنا بہت آسان ہے کیونکہ الفاظ، ترکیبیں، محاورے اور علامات مع خیالات و جذبات آفرینی کے ایک بندھے ٹکے فارمولا کی طرح ہر اردو داں کی گرفت میں رہتے ہیں چنانچہ اردو کا ہر قاری، خواندہ یا ناخواندہ، بہ آسانی غزل کہہ سکتا ہے۔ کرنا صرف یہ ہوتا ہے کہ نپے تلے لفظوں اور ترکیبوں کو الٹ پھیر کر یکجا کر دیا جائے۔ دوسری طرف غزل میں کچھ کہنا بہت ہی دل گردے کا کام ہے۔ غزل کہنا اور غزل میں کچھ کہنا دو بالکل ہی الگ کمالات ہیں۔ اگر کوئی شاعر غزل کی قیود میں رہتے ہوئے کوئی نئی یا انوکھی بات کہے تو ہم اس کو شاعر ماننے پر مجبور ہوں گے۔ یہاں مشکل یہ ہے کہ دنیا میں کوئی بھی مضمون یا موضوع ایسا نہیں ہے جس پر غزل گو حضرات طبع آزمائی نہ کرسکے ہوں۔ پروین شاکر کا کمال یہ ہے کہ اس نے غزل کا ظاہری سانچہ قائم رکھتے ہوئے بھی اس کی ہیئت ترکیبی کو یکسر بدل ڈالا۔ اس بات کی وضاحت یوں آسانی سے

کی جاسکتی ہے کہ غزل کے اصل معنی بعض اہل فن نے بتائے ہیں "سخن بہ زنان گفتن" یا "حکایت با یار گفتن۔" ان معنوں میں پروین نے غزل کی صنف (بمعنی جنس) ہی بدل دی۔ اگر غزل عورتوں سے راز و نیاز و بیان عشق و محبت یا پیام و سلام محبت کا نام ہے تو پھر وہ غزل کیا ہوگی جس میں واحد متکلم کا صیغہ مذکر نہیں بلکہ مونث ہے۔ تذکیر و تانیث کا فرق قدماء نے برتا ہے اور رنگین، جان صاحب وغیرہ نے عورتوں کے لہجے میں باتیں کی ہیں مگر وہ شاعری اتنا مبتذل اور استفراغ آمیز ہے کہ اس کو ادب ماننا ہی مشکل ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس کو غزل کا نہیں بلکہ ریختی کا نام دیا جاتا ہے۔ پروین شاکر کے معاملے میں غزل گوئی کی روایت اپنی ایک نئی راہ متعین کرتی نظر آتی ہے۔ اردو میں، عربی و فارسی کے اتباع میں، اظہار جذبات کرنے والے مرد ہوتے ہیں اور کسی عورت کا شعر و غزل کی آڑ میں کچھ کہنا بجائے خود ایک معیوب فعل ہے۔ عورتوں نے ان قیود اور پابندیوں کے باوجود خاصے نمایاں نمونے چھوڑے ہیں۔ اردو شعر میں بعض خواتین کے نام بہت مشہور و معروف ہیں۔ ان میں ایسی بھی ہیں جن کی لے بھی نرالی ہے اور طریق کلام بھی منفرد۔ مگر پروین شاکر ان سب سے ممیز و نمایاں یوں ہے کہ وہ کہیں بھی حالات کی شاکی نہیں ہے۔ وہ صرف ایک بات زیر لب کہتی ہے اور چونکہ بات بہت بھرپور اور معنی خیز ہوتی ہے اس لیے اس کا اثر بھی بہت گہرا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر دیکھئے۔

وہ مجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آ جاتا

یہی منفرد، بھرپور مگر بہت ہی تیکھا لہجہ پروین شاکر کا مخصوص پیرایہ اظہار ہے۔ اس میں نہ لعن طعن ہے اور نہ طنز اور نہ شکوہ شکایت۔ اس طرح بحیثیت مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ پروین کی پوری غزلیہ شاعری میں ایک نظاہت، نفاست، رکھ رکھاؤ، اور تہذیبی شائستگی ملتی ہے۔

غزل کی مخصوص راگنی (لفظیات، روایت، معاملہ بندی اور رنگ ڈھنگ) پر جاگیرداری سماج کی قیود حاوی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ پوری غزلیہ روایت پر مسلم معاشرت کی گہری چھاپ پائی جاتی ہے۔ اس طرز میں اس روایت میں اور اس لوہے کے حصاروں جیسی قیود میں کوئی نیا طرز اختیار کرنا یا کوئی نیا راگ الاپنا بمنزلہ اجتہاد کے ہے۔ پروین ان معنوں میں مجتہد ہے کہ وہ غزل کا ایک وسیع مسطر تو ضرور استعمال کرتی ہے مگر اس کا مزاج اس طرح بدل دیتی ہے کہ ہم اردو کے کسی کے مقطع چقطع شاعر کے بجائے کلاسیکی دیوداسیوں یا یونان قدیم کی اساطیری بربط نواز دوشیزاؤں کے تصور میں محو جذب ہو جاتے ہیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس فلومیلا کا گلا ہی نہیں گھٹ رہا ہے بلکہ وہ آسکر وائلڈ کی بلبل کی طرح گلاب کے کانٹے اپنے قلب میں گہرے اور بہت گہرے چبھو رہی ہے۔ اس کا دل مجروح ضرور ہے مگر آئین و آداب کی قائل یہ سوز دروں کی ماری ہوئی شاعرہ کسی طرح کی شکست تہذیب کی مرتکب ہونے پر تیار نہیں ہے۔ اس کے یہاں غیر شائستگی کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ اس کا تعلق قلبی جمالیاتی بھی ہے اور نظری بھی۔ اس کے اشعار میں کہیں بھی ان منزلوں کے اشارے نہیں ہیں جن کو مجاز اپنی شریعت میں جرم خود کشی سے بدتر قرار دیتا ہے اور رشید احمد

صدیقی نے جس کو ابتذال تصور کی وہ حد آخری قرار دیا ہے جس کو ابتذال کے بجائے ارتکاب کہنا درست ہوگا۔ یہاں علی سردار جعفری کے اس قول سے متفق ہونا پڑے گا کہ مرد اور عورت کے احساس جسم میں جو فرق ہے وہ فراق اور فیض کے انداز سے اور پروین شاکر کے انداز سے ظاہر ہوا ہے۔ پروین شاکر کے کلام میں' اس کی پوری شاعری میں جسم کا تقدس اور تہذیب ہے۔ جعفری کا کہنا ہے:۔

وہ فیض و فراق سے زیادہ
تقدیس بدن کی نغمہ خواں تھی
تہذیب بدن کی رازداں تھی
گلنار لبوں کی تہنیت میں
گلنار لبوں سے گلفشاں تھی

پروین شاکر کا مقابلہ ان کی ہم عصر شاعرات سے کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ وہ قطعی منفرد اور صاحب نظر و فہم شاعرہ ہے۔ اس کی مثال "فنون" کے تازہ شمارے میں اس کی جدید (شاید آخری) غزلیں ہیں اور ان میں صیغہ مذکر کچھ اس طرح استعمال ہوا ہے کہ اس پر واحد متکلم کا شبہ بھی ہو سکتا ہے۔ چونکہ یہ غزلیات "تازہ ترین" ہیں اس لیے ممکن ہے' زیادہ تر لوگوں کی نظروں سے نہ گزری ہوں لہٰذا دو شعر بطور حوالہ پیش کیے جا سکتے ہیں:

حرف تازہ نئی خوشبو میں لکھا چاہتا ہے
باب اک اور محبت کا کھلا چاہتا ہے
ریت ہی ریت ہے اس دل میں' مسافر میرے
اور یہ صحرا ترا نقش کف پا چاہتا ہے

یہاں زیادہ تر پروین شاکر کی لفظیات' تقاضائے عصری سے ان کی بھرپور واقفیت اور ایک نئے نویلے فکری آہنگ کی طرف اشارے کیے گئے ہیں لیکن اس کی ایک اور اہم خوبی اسماء ضمائر کو فعل میں انتہائی استادانہ طریقے سے پرو دینے میں ہے۔ یہ فن صرف لسانیات سے بخوبی واقفیت رکھنے والوں کو ہی نصیب ہو ہے۔ غالب کہتے ہیں:

پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا
دل جگر تشنہ فریاد آیا

یاد آیا کی ردیف میں "فریاد" جس طرح چسپاں ہوا ہے وہ صرف غالب کا حق ہے لیکن جب ہم اس طرح کی قادرالکلامی کسی نئے شاعر میں پائیں تو پھر قائل بہرحال اس کی مہارت لفظی کا ہونا ہی پڑے گا۔ پروین شاکر کے یہاں ایسی مثالیں واقعی قابل تعجب و قابل تعریف ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ غزل کی ردیف ہے "کر دیا":۔

جینے کا حوصلہ نہیں' رکنا محال کر دیا

عشق کے اس سفر نے تو مجھ کو نڈھال کر دیا
مدتوں بعد اس نے آج مجھ سے کوئی گلہ کیا
منصب دلبری پہ کیا مجھ کو بحال کر دیا

اور اب ردیف کی پہلو آفرینی دیکھیے:

اب کے ہوا کے ساتھ ہے دامن یار منتظر
بانوے شب کے ہاتھ میں رکھنا سنبھال کر دیا

جن خوبیوں کی طرف یہاں اشارے کیے گئے ہیں ان پر علیحدہ علیحدہ تفصیل سے کچھ کہنا اس وقت محض قلت وقت و فرصت کی وجہ سے مشکل ہے لیکن دو تین خوبیوں کا سرسری ذکر کرنے کے بعد ان کے صرف ایک پہلو کی طرف تفصیلی توجہ کی ضرورت ہے۔ پروین شاکر کی شاعری میں خوشبو کا استعارہ بہت نمایاں ہے۔ اس کے اولین مجموعے کا نام ہی "خوشبو" ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر غزل میں ہم کو "خوشبو" کا ذکر ملتا ہے اور ہر بار اس خوشبو کی نوعیت یا تجسیم مختلف ہے (چونکہ پروین شاکر نے لفظ خوشبو کو ایک تشخص عطا کر دیا ہے اس لیے "خوشبو" ایک مجرد تصور نہیں بلکہ جیتا جاگتا علامتی نشان ہے) اکثر اوقات تو اس نے خوشبو کو کچھ اس طرح نگینہ کی طرح اشعار میں پرو دیا ہے کہ کوئی ماہر سارے کار سونے کے زیورات میں سچے موتیوں کی تنصیب بھی ایسے مہارت سے نہ کر سکے گا۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیے:۔

وہ ایک خوشبو
جو میرے وجود کے اندر
صداقتوں کی طرح : زینہ زینہ اتری ہے
کرن کرن مری سوچوں میں جگمگاتی ہے (سرشاخ گل _ خوشبو)

بعد میں یہی خوشبو ایک اعلیٰ تفکر کی غماز ہو جاتی ہے۔ پھر ایک اور سمت نظر اٹھتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی لفظ شعر و ادب کا روایتی تصور بھی پیش کرنے کا اہل ہے:

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

تیسری طرف یہ خوشبو ایک نئی معنویت کے ساتھ عطر خرام ہے۔ یعنی یہ کہ ہر موئے بدن....
گوش بر آواز ہے۔ ذہن میں بیتے ہوئے موسم کی مہک ڈھونڈتا

ایک نرالا انداز اس خوشبو کا یہ بھی ہے کہ:

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو

اور پھر یہ فطرت سے الگ ہو کر معمولات و اشیاء زندگی کا حصہ بن جاتی ہے:

ارے وہ جو کونے میں اک سینٹ رکھا ہوا ہے
دکھائیں ذرا

اسے ٹسٹ کر کے دیکھوں
یہ خوشبو تو اس کی پسندیدہ خوشبو رہی ہے
سدا اس کے ملبوس سے پھوٹتی تھی (ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں __ خوشبو)

اصل میں پروین شاکر کے ”خوشبو“ کے تصور، تشخص اور استعارے کا ذکر ہی اس کی شاعری کی حقیقی روح ہے۔ اقبال کا ذکر آتے ہی مرد مومن اور شاہین کا خیال آتا ہے۔ اس طرح کی کوئی ناقابل علیحدگی علامت عام شعرا کے یہاں مفقود ہے۔ اختر شیرانی نے عذرا اور سلمیٰ کو زندگی آمیز پیکر عطا کر دیئے اور بعد میں مجاز نے لفظ آوارہ کو ادبی (تقریباً جدلیاتی) تشخص عطا کیا۔ اسی طرح اب ہم کو خوشبو کے ہر تصور کے ساتھ پروین شاکر کے مدھم مدھم غمناک نشتروں کا خیال آنا لازمی ہے۔ اس معاملے میں یہ کہنا آسان نہیں ہے کہ پروین شاکر ایک شاعرہ ہے اور ہم اس کو ایک عورت کہہ کر ادب کے عام، خارزاروں یا شاہراہوں سے الگ کر دیں۔ دراصل پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت پاکستان کی وہ واحد غزل گو شاعر ہے جس کے تصورات کی چھوٹ آنے والی نسلوں پر نہیں پڑے گی بلکہ خود دوران وقت کے ساتھ ادب کی بنیادی تصورات میں نفوذ کر جائے گی۔ اگر فنی عظمت، لفظی ترنم، صوتی رقص، خارجی مشاکلی، اخلاص جذبات اور تقریباً صحف عالیہ کی سی حقیقت بیانی کا عطر مجموعہ (یہ بھی خوشبو کی رعایت سے کہا جا رہا ہے) دیکھنا ہو تو ہم ”صد برگ“ اور ”خوشبو“ کی طرف کمال احتیاط اور احترام سے دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔

خوشبو کے بعد پروین شاکر کی دوسری انفرادیت اس کے مجموعہ تصورات میں رنگوں کی گلکاریاں ہیں۔ کوئی بھی پڑھنے والا اس کے کلام میں رنگ آمیزی سے غافل نہیں رہ سکتا۔ تقریباً ہر اسم کے ساتھ یا ہر فعل کے ساتھ ایک صفت رنگ استعمال ہوئی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

”سبز موسم کی بے حد خنک رات“
”کانچ کی سرخ چوڑی“
”پھول کا چہرہ“
”اپنے بنفشی ہاتھ میں لے کر چوما“
”قوس قزح کے پھول اگائے“
”گلابی ہنسی“
”گلابی پاؤں مرے چمپئی بنانے کو“
”کسی کے صحن چمن میں سبزی باڑہ اگائی ہو“
”کنارے صحن چمن سبز بیل کے خم“
”یہ کالی بھوری آنکھیں“
کسے بلاتی ہیں آنگن کی چمپئی شامیں“

یہ رنگوں کی بے محابا جدولیں سجانا ”خوشبو“ کی طرح مکمل ”پروینی“ انداز نہیں ہے۔ اس طرح

نک آمیزی نثر میں حجاب امتیاز علی کر چکی ہیں جن کی کہانیوں میں ہم کاسنی دوپہروں اور چمپئی شاموں کا جا بجا ذکرہ پاتے ہیں۔ پھر بھی پروین شاکر کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ان ناچتے گاتے رنگوں کو شاعری میں ریشم ے کپڑے میں جھلملاتے دھوپ چھاؤں نمونوں (Pattern) کی طرح سمو دیا ہے۔ اوپر کے مصرعے مختلف وعوں کی مختلف نظموں سے سرسری طور پر چن لیے گئے ہیں۔ ان کا ذکر اس مضمون میں کرنا ضروری تھا بن پروین شاکر کے کلام میں رنگوں کے استعارے یا استعمال کے موضوع پر ایک علیحدہ تفصیلی مضمون لکھا جا تا ہے۔

میرزا ادیب نے لکھا ہے: "اگر اردو ادب میں ایسی شخصیتیں تلاش کرنے کی کوشش کی جائے جنہوں نے خصوصی طور پر نفسیات عنفوان شباب کو اپنا موضوع بنایا ہے تو یہ دو نام فوراً ہماری توجہ اپنی طرف مبذول ،لیں گے۔ ایک تو عصمت چغتائی ہے اور دوسرا نام پروین شاکر کا ہے۔"

مجھے اس حوالے میں کچھ الجھاؤ لگا۔ کیونکہ یہ تو صحیح ہے کہ اردو میں عصمت کی طرح پروین شاکر ض اپنی صلاحیت اور قوت تخلیق کی بنا پر فن کار تسلیم کرلی گئی مگر نفسیات عنفوان شباب کا پہلو میں نے بار بار طالعے کے باوجود زیادہ نمایاں نہیں پایا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حوالہ جس طرح اخبار میں چھپا ہو اس کی ثاعت یا طباعت میں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہو۔ ہاں جو قول من و عن اور بلا کم و کاست دہرایا جاسکتا ہے وہ میرزا یب صاحب کا یہ فرمانا کہ پروین شاکر نے ایسے موضوعات کو بھی جو بالعموم سیاسی موضوعات تصور کیے جاتے ں مرکز فکر بنایا ہے۔ اس حوالے سے وہ ایک نڈر' بے باک' حوصلہ مند مفکر دکھائی دیتی ہے۔ اس نے جو کچھ کہنا چاہا ہے وہ بے باکانہ کہہ دیا ہے۔

پروین شاکر نے جیسا کہ کئی بار ذکر آچکا ہے' نظمیں بھی لکھی ہیں اور غزلیں بھی۔ نظموں میں رت ہے مگر شعر آفرینی نہیں۔ غزلوں میں ندرت بجائے خود ایک اجتہادی خوبی ہے۔ تاہم دونوں اصناف ں لہجہ ان کا بالکل اپنا ہے۔ ان کی شاعری میں کسی بڑے لکھنے والے کے اثرات ڈھونڈنا مشکل ہے۔ لفظیات ں ضرور جگہ جگہ میر کی ترکیبیں مع ان کے سوز کے نمایاں ہیں۔ نوجوان شاعروں کی دو تین نسلیں اختر یرانی' مجاز اور فیض سے متاثر رہی ہیں۔ خاص طور پر فیضیت تو کچھ اس طرح چور دروازوں سے نئی شاعری ں جلوہ فرما ہوگئی ہے کہ خود فیض کے انفرادی رنگ سے ہی الجھن ہونے لگتی ہے۔ (بعض مولوی اور مولانا ضرات نے اقبال کو کچھ اس طرح مومن و شاہین اور تبلیغ و دعوت ایمان کا سرچشمہ سمجھ لیا کہ ان کو مقام ولی عارف کا دے دیا۔ ایک بڑی تعداد اقبال کی لفظیات کا پھوہڑ استعمال بھی کرنے لگی۔ اس سلسلے میں ایک ماحب نے لکھا تھا کہ گو کہ میں سائیکل پر فکر معاش میں دفاتر کا چکر لگاتا ہوں مگر میری فطرت اسد اللہی ہے۔ س طرح کی تخریب اقبال نے اگر کچھ لوگوں کو اقبال سے بدظن کر دیا تو قصور اقبال کا نہیں ہے۔ بعینہ ہر کہ و ہ نے فیض کو اس طرح بطور ٹھپہ استعمال کرنے کی روش اختیار کرلی ہے کہ اب فیض سے ہی الجھن ہونے لگی ہے) مقام شکر یہ ہے کہ پروین پر کسی کا کوئی مضر اثر نہیں ہے۔ اس کا اپنا رنگ ہے اور وہ اردو کے ان ہند شعراء میں ہے جنہوں نے جزویست از پیغمبری کے اصطلاحی تصور کو اپنایا۔

پروین شاکر کا تصور عشق جتنا منفرد اور شائستہ ہے اس کی مثال ہم کو صرف میرا بائی کے یہاں ملتی ہے۔ بعض غیر ہمدرد ناقد یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے تصور حب کا منبع ہی میرا کے گیتوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ دور حاضر میں اس طرح کا تہذیبی رکھ رکھاؤ کہیں نہیں ملتا۔ (فیض کے تصور عشق میں پارٹی لائن کے اثرات نمایاں ہیں) اگر پروین کا تصور جذبہ و جنوں ایک طرف انتہائی مہذب اور شائستہ ہے تو دوسری طرف وہ بالکل ذاتی اور اخلاقی ہے، روایتی یا اکتسابی نہیں۔ اس کے محبوب میں کوئی روایتی خوبی یا خامی نہیں ہے بلکہ یہ محبوب سن ستر اور سن اسی کی دہائی کا اولوالعزم اور ترقی و کامرانی کی طرف ہمہ وقت رواں دواں، عہدہ پسند اور اعزا پسند نوجوان ہے جس کو رنگین اور تھیچر کے بازاری اشاریوں اور جائزوں میں ہمہ وقت ڈوب کر ہی کچھ حاصل کرنے کی توقع ہے۔ ترقی، زر نقد اور مناصب اعزاز کی فکر اس کو اس طرح سرگرداں و پریشان رکھتی ہے کہ وہ خاندان اور انسانی رشتوں سے یکسر بے بہرہ ہو چکا ہوتا ہے۔ پروین شاکر اس بات کا رنج نہیں کرتی، روتی اور منہ بسورتی نہیں نظر آتی بلکہ ان حالات کو عصری حقیقت اور سماجی قدروں کا انہدام سمجھ کر بلا تبصرہ ان کا تذکرہ کرتی گزر جاتی ہے مگر اس سرراہے ذکر میں ہی اس کا سارا سوز دروں چھپا ہوتا ہے۔ غیر ارادی طور پر وہ محبوب کی شخصیت بے نقاب کر دیتی ہے مگر نوائے زیر لبی میں کسی طرح کی تیکھی تنقید نہیں ملتی۔ ہم اس کو نہ شکر خند کہہ سکتے ہیں اور نہ زہر خند۔ اس کو کیا کہا جائے یہ طے کرنا مشکل ہے۔ پھر بھی ایک بیانیہ ہے:۔

اوروں کا ہاتھ تھامے، انہیں راستہ دکھاؤ
میں بھول جاؤں اپنا ہی گھر، تم کو اس سے کیا

اس طرز تخاطب میں سب سے موثر اور غمناک نظم "تیری ہم رقص کے نام" ہے۔

رقص کرتے ہوئے
جس کے شانوں پہ تونے ابھی سر رکھا ہے
کبھی میں بھی اس کی پناہوں میں تھی
فرق یہ ہے کہ میں
رات سے قبل تنہا ہوئی
اور تو صبح تک
اس فریب تخیل میں کھوئی رہے گی

میرا بائی کے جس انداز کا ذکر ہم جا بجا کرنے پر مجبور ہیں اس کی مثال کے طور پر مندرجہ ذیل ٹکڑا پیش کیا جاسکتا ہے:

دشت غربت میں جس پیڑ نے
میرے تنہا مسافر کی خاطر گھنی چھاؤں پھیلائی ہے
اس کی شادابیوں کے لیے

میری سب انگلیاں
ہوا میں دعا لکھ رہی ہیں۔“

پروین شاکر کا سوز و ساز اسی رواں دواں زندگی کا حصہ ہے۔ اس میں کہیں بھی وقت سے فرار، دگی سے فرار یا موت کے ہاتھوں میں سکون ڈھونڈنے کی یاسیت یا شکستگی نہیں ملتی۔ بقول اقبال یہ وہ مجروح ت ہے جو فکر درماں میں نہیں پھرا کرتی بلکہ وہ زخمی ہے جو ”کر لیتی ہے پیدا اپنے مرہم کو“ ــــ ان نوں میں پروین شاکر نہ تو رجائیت زدہ ہے اور نہ یاسیت میں مبتلا۔ وہ ہر طرح کی جراحتیں سہتی ہوئی، ہر ث پر بلبلا کر کراہنے کے باوجود زندگی سے ہراساں نہیں، فقدان نشاط پر طالب رحم نہیں بلکہ درد کو دوام بنا نے کی منزل میں تھی۔ خود اس کا پر اعتماد منشور یہ ہے کہ ”اگر زندگی سے محبت کرنا جرم ہے تو یہ لڑکی پورے ور کے ساتھ اپنے جرم کا اعتراف کرتی ہے۔“ اس اعتراف جرم میں اس نے ہر اسم کو کسی نہ کسی صفت ے متصف کر کے ہر ترکیب کو نیا وجود اور نئے معنی دے دیئے:

”مرے ہاتھوں میں پنکھڑیوں کی شبنم لمس نرمی ہے“
”پھر ڈسنے لگی ہیں سانپ راتیں“
”سنگدل رواجوں کے
”آہنی حصاروں میں
”عمر قید کی ملزم
صرف ایک لڑکی ہوں“
”جو میرے گھر میں ہمیشہ ہوا مثال آیا“

پروین شاکر کی لے غزل میں بڑی شگفتہ و شاداب ہے۔ اس کے باوجود یہ کہنا آسان نہیں ہے کہ وہ یک اچھی غزل گو ہے۔ یا یہ کہ اس کا حقیقی اور موثر پیرایہ اظہار ہی غزل ہے کیونکہ پروین کی غزل کا لب و جہ، سانچہ، ڈھانچہ، لفظی تراش خراش غرضیکہ ہر چیز غزل کی روایت سے الگ ہے۔ پابندی وہ صرف بنیادی مور ــــ قافیہ، ردیف، بحر اور ارکان کی کرتی ہے۔ اصل میں غزل کے روپ میں اس نے درد انگیز وحے اور گیت لکھے ہیں۔ اس کے اشعار کا انتخاب آسان نہیں ہے کیونکہ ہر غزل میں دو تین اشعار ایسے ضرور مل جاتے ہیں جن کو ہم اپنی اداس تنہائیوں میں گنگنانے اور ان پر سر دھننے میں مصروف ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ غزل میں مومن، اصغر، حسرت، جگر اور فانی کی غیر فانی روایات کے باوجود پروین کا ان ے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ بارھویں اور تیرھویں صدی کے صوفیوں نے اپنی انتہا پسندی میں ولی کا رتبہ پیغمبر ے بڑھا دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ پیغمبر کو علم فرشتے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جبکہ صوفی اور ولی اللہ براہ راست خدا سے کشف حاصل کرتا ہے (ملاحظہ فرمایئے ابن العربی کے فرمودات)۔ ہم اگر صوفیوں سے کسب فیض کرنا چاہیں تو ادب میں پروین شاکر کو اس صوفی کا درجہ دیں گے جو حصول علم کے لیے براہ راست خدائے شعر، حضرت میر، سے کسب کشف کرتی ہے۔ جو درد، اخلاص اور اصطلاحی اور خارجی ندرت و جدت

میر کا کمال تھی وہی (معلوم نہیں کیسے) براہ راست پروین شاکر میں رونما ہوئی ہے۔ ممکن یہ ہے کہ اس نے شروع عمر میں میر کا بالا ستیعاب مطالعہ کیا ہو۔ "کوبکو" کا بلا تکلف برجستہ اور برمحل استعمال تو میر کے بعد کسی شاعر کے یہاں نظر ہی نہیں آتا۔ یہاں بھی پروین ایک منفرد راستہ اپناتی ہے۔ وہ آئین آداب کی قائل ہے میر کی طرح، اور شائستگی اظہار میں میر کی مقلد ہے چنانچہ اس کے تیز و تند لہجے میں بھی کسی طرح کی غیر شائستگی نہیں ملتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ حیات و کائنات کے بارے میں دلچسپ طور پر سرسری اشارے کرتی گزر جاتی ہے۔ ہم کو اس کے جانے کے بعد ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ کومل گات کی شاعرہ باتوں ہی باتوں میں نہ صرف ہماری متاع فکر کو جھنجھوڑ گئی بلکہ باتوں ہی باتوں میں عمیق ترین نکات بھی بتاتی چلی گئی۔ اس کی راگنی زندگی بخش ہے۔ اقدار حیات کے بارے میں تصور اس کا انتہائی صحت مند اور زندگی بخش ہے۔ غزل کے مضبوط آہنی ڈھانچہ کی قیود میں رہ کر کوئی نیا راگ الاپنا بمنزلہ اجتہاد کے ہے۔ ان معنوں میں پروین شاکر ایک مجتہد ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض عمر میں اس سے بڑے غزل گو، مترنم، یا صاحب عہدہ و منصب شعراء پروین شاکر کو شاعرہ یا خاتون ادیب کہہ کر ٹکسال باہر ٹھہرائے یا Ghettoise کرنے کی کوشش کریں، مگر یہ بات بتقاضائے انصاف ہم کو آج ہی اور ابھی واشگاف الفاظ میں واضح کر دینا چاہیے کہ وہ وہ "شاعرہ" نہیں بلکہ ایک بہت بڑی بہت ہی منفرد اور شگفتہ شاعر تھی۔ اس کا منصب متعین کرنے کے لیے ہم کو میر کی صف میں جگہ ڈھونڈنا پڑے گی۔ اگر کسی کو اس بات سے اختلاف ہو تو وہ پروین شاکر کا بالاستیعاب مطالعہ کرے۔ چند اشعار اس کے ساتھ قرار واقعی انصاف نہیں کرسکتے۔ پھر بھی ان حضرات کے لیے جو برجستہ مثالوں کے طالب ہوتے ہیں یہاں کچھ اشعار پیش کرنا نامناسب نہیں معلوم ہوتا۔ پڑھیے اور سر دھنیے!

سج گئی بزم رنگ و نور ایک نگاہ کے لیے
بام پہ کوئی آگیا زینت ماہ کے لیے
دل میں یقین صبح کی لو جو ذرا بلند ہو
کافی ہے ایک ہی دیا شب کی سیاہ کے لیے

○

گھر کا سارا راستہ اس سرخوشی میں کٹ گیا
اس سے اگلے موڑ کوئی ہم سفر ہونے کو ہے

○

اتنی روشن ہے تری صبح کہ ہوتا ہے گماں
یہ اجالا تو کسی دیدۂ نمناک میں ہے

○

آج تو اس پر ٹھہرتی ہی نہ تھی آنکھ ذرا
اس کے جاتے ہی نظر میں نے اتاری اس کی

—○—

یوں تو اڑنا بھول جاؤں زندگی بھر کے لیے
بھر گیا ہے دل مگر مجھ سے مرے صیاد کا

—○—

ہوا مہک اٹھی، رنگ چمن بدلنے لگا
وہ میرے سامنے جب پیرہن بدلنے لگا

—○—

کس سے پوچھوں پس دیوار چمن کیا گزری
میرے گھر میں تو ہوا مہر بہ بلب آئی ہے
کون سے پھول تھے کل رات ترے بستر پر
آج خوشبو ترے پہلو سے عجب آئی ہے

—○—

کھول کر بند قبا گل کے، ہوا
آج خوشبو کو رہا کرتی ہے

—○—

لوٹا ہے وہ پچھلے موسموں کو
مجھ میں کس رنگ کی کمی تھی

—○—

ممنوع قرار پا گئے ہیں
جس بزم میں حرف خاص تھے ہم

—○—

مدت کے بعد چاند نے دستک بدن پہ دی
پھر حجلہ حیات میں آئی ہے خاص شب

—○—

اس نے خوشبو سے کرایا تھا تعارف میرا
اور پھر مجھ کو بکھیرا بھی ہوا ہی کی طرح

—○—

اے چادر منصب، ترا شوق گل تازہ
شاعر کا ترے، دست ہنر کاٹ رہا ہے

○

وہ جس کو بزم میں مہمان عام بھی نہ کہا
کسے بتائیں کہ خلوت میں خاص کتنا تھا

○

گھر میں کبھی آہٹ کی طرح سے کوئی آئے
اک بند گلی کی طرح سنسان بہت ہوں

○

ان اشعار میں کسی مصور کی طرح کی پیکر تراشی اور رنگ آفرینی تو ہے مگر اپنی ندرت فکر میں بھی اس طرح کے اشعار ہمارے عصری غزل گو حضرات سے بہت بہتر ہیں۔ یہاں عصری سے مراد وہ شعراء ہیں جو پچاس کی عمر تک کے یعنی کم و بیش پروین شاکر ہی کے ہم عمر ہیں۔ پاکستان کے شعراء کا کلام ہمارے جزائد کے ذریعے دیکھنے کو ملتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ رابطہ ہندوستان کے شاعروں سے بھی برابر رہتا ہے۔ اسی بنا پر میں اپنی جگہ پر یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ سن ساٹھ کی دہائی سے لے کر اب تک جو شعراء اور خاص طور پر غزل گو حضرات ہمارے ادبی افق پر ابھرے ہیں، پروین شاکر ان سے جداگانہ، سب سے بہتر اور سب سے مخلص شاعر ہے۔ میں نے میرزا ادیب کا حوالہ ایک جگہ دیا ہے جس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ میں ان کے قول سے پوری طرح متفق نہیں ہوں۔ اس طرح کے اشتباہ کو دور کرنے کے لیے میں یہ مضمون میرزا ادیب صاحب ہی کے قول صادق پر ختم کروں گا۔

"پروین شاکر وہ سب کچھ دینے پر قادر رہی ہے جو کسی شاعری کو بھی بڑی شاعری بنا دیتا ہے۔ گہرا تفکر، سنجیدگی، تنوع، ندرت بیان، عصری حسیت، الفاظ کا حسن انتخاب، داخلی تفکر کے علاوہ دردمندی بھی۔"

اگر کسی طالب علم کو اردو کی لطیف ترین غزلیہ شاعری کے بھرپور مطالعے کے لیے وقت نہ مل سکے تو وہ میر و غالب کے بعد براہ راست پروین شاکر تک پہنچ کر اپنے کو کامیاب کہہ سکتا ہے۔

(25 فروری 1995ء

جدید شاعری کی جدید تر شاعری

اعجاز رضوی

کا دوسرا مجموعہ کلام

بہت سے دکھ ہیں

ناشر: الحمد پبلیکیشنز، لیک روڈ۔ لاہور

PERVEEN SHAKIR · THE FLOWER CHILD

Parveen Qadir Agha

If I were a poet I would have written a poem on her If I could write I would have written in praise of her Unfortunately I am neither--in fact, not one of all the notables assembled here to remember Perveen Shakir I knew her as a Person, not as the great poet

I first met her about ten years ago in my office. It was a hot day of May when the entire CBR was busy with the annual budget preparations and when visitors are not allowed in the office The then Chairman suddenly came and asked me to come and console my namesake and a colleague who would not stop crying I had only heard of her then, never seen or met her before The cause of crying was that she was stopped at the CBR reception from entering the office without a special pass. Despite her introduction and disclosure that she had come from Karachi on an official visit, she was not allowed to proceed upstairs When I entered the room my eyes fell on a frail little girl with big beautiful eyes and long wet lashes, which despite their length could not stop the steady flow of tears I fell in love with her Such beautiful eyes were not meant for crying. Her helplessness, her small size and her entire personality sunk into my heart. Something in her called out for protection and I felt it to be my responsibility. She was not able to say much to me at this meeting. I took her to my room to console her and by the time her tears dried, it was time for her to go back to Karachi where she lived and worked After that there was no communication.

A few months later there was a soft knock at my door and in walked Perveen Shakir with a bright cheerful smile. "I have been transferred to Islamabad and in the CBR", she said happily. Without saying anything it was understood that this was the beginning of our permanent association She was like a flower child, a melody, a fragrance, in fact poetry itself. I did not have to read her poetry as for me she was herself a poem. I would rather read and understand her. She lived with me for a year, she lived with my sister in America for a year and was part of our family With her around we never needed flowers Her fragrance and presence filled the house. Perveen was a very sensitive soul She could feel things around her without any communication as her poetic thought gave her an insight of human nature.

Perveen dedicated her last book to me She never gave me any such indication. One day I went to meet her in the drive way and she smilingly handed over a book to me It was "INKAAR" and she opened its first page. I was shocked, surprised, ashamed and felt so small I wept, I was not happy What a magnanimous act! So much for so little I had loved her because she was lovable No one could help loving her and here she was so grateful for it Being a sensitive soul, she had valued love, and this was her way of expressing it.

There was something extra-ordinary about her. I used to wonder to myself how calmly she had taken her fame at such a young age. When we published her collection of works I wondered to myself why things were being done so fast. It was too early. I feared for her and wondered why God was speeding up things for her My fears turned out to be true God was winding up her work in this world Even God was in love with His creation . He wanted her in the Heavens as soon as possible.

As I stood by her body in the hospital holding her shoes and purse in my hands I felt so helpless As in all these past years I was with her at her hour of need, but this time it was of no use. My flower child was going. I prayed, but the tasbih beads refused to run. I realized that prayers were futile as there was no response from the Almighty. She came to me with her tears and has left me in tears.

Now as I look back I realise why it was that God had chosen this manner and time for her end She was an extra-ordinary person. She could not have died a normal death at a ripe old age and be mourned in the due course of events She had to live forever. God thus ordained an extra-ordinary way for her untimely death, and saved her from the cruelties of old age. She will now live in our memories as the fresh young and beautiful Perveen Shakir, a flower in full bloom rather than a faded flower Such mortals never die.

ایک معروف مصری ناول
باتیں ایک خاتون ڈاکٹر کی
مصنف: نوال سعداوی
ترجمہ: طاہرہ حبیب
قیمت: ۵۰ روپے

اُردو افسانے کی ایک بھرپور شخصیت جیلانی بانو
کے تازہ افسانوں کا دلآویز مجموعہ
یہ کون ہنسا
قیمت: ۸۰ روپے

ناشر: کھوج ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز سنٹر
فلیٹ ۲، فلور ۱، غوثیہ بلڈنگ، گلبرگ مین مارکیٹ۔ لاہور
فون: ۵۷۱۲۲۶۲

سنڈریلا نے کوچ کیا

نجم الحسن رضوی

پروین شاکر نے اپنا کتبہ خود لکھا ہے۔ اس کے مجموعے "صد برگ" کی آخری نظم کے پہلے تین مصرعے یہ ہیں:

یہاں وہ لڑکی سو رہی ہے
کہ جس کی آنکھوں نے نیند سے خواب مول لے کر
وصال کی عمر رتجگے میں گزار دی تھی

جب پروین نے شعر کہنا شروع کیا تھا تو وہ دن میں بھی خواب دیکھتی تھی مگر کسے پتہ تھا کہ آخر میں وہ رتجگوں کی شاعری کرے گی۔ وہ بے ساختہ شاعرہ تھی۔ شاعری میں اس کی روح، اور اس کی روح میں اس کی شاعری تھی۔ خوشبو کی رُتوں میں اسے عمر کے لمحے تتلیوں کی طرح خوش رنگ لگتے تھے اور وہ گلاب کے موسموں کا ذکر کرتے نہیں تھکتی تھی۔ یہ اُن کی شاعری کا اوّلین دور تھا جب ساری زندگی اُس کے لئے خوبصورت تھی اور وہ خود کو مکمل طور پر فطرت سے ہم آہنگ پاتی تھی:

سما کے ابر میں، برسات کی اُمنگ میں ہوں
ہوا میں جذب ہوں، خوشبو کے انگ انگ میں ہوں

اس زمانے میں اُس نے شہرِ سخن کو تسخیر کرنے کے لئے اپنے واسطے 'پھول سے لہجے' کی تمنّا کی تھی اور یہ دعا مانگی تھی کہ ؎

یارب مرے سکوت کو نغمہ سرائی دے
زخمِ ہنر کو حوصلۂ لب کشائی دے
تخیلِ ماہتاب ہو، اظہارِ آئنہ
آنکھوں کو نقطہ نقطہ کا چہرہ دکھائی دے

یقیناً پروین کی دعا قبول ہوئی ہوگی کیونکہ اظہار میں قدرت کے ساتھ ساتھ اسے کربِ ذات کی وہ دولت بھی نصیب ہوئی جس کی جھنکار ہمیں اس کی شاعری میں جا بجا سنائی دیتی ہے اور جس کے لئے اُس نے خالقِ ازل کو یہ کہہ کر پکارا تھا:

دل کو لہو کروں تو کوئی نقش بن سکے
تو مجھ کو کربِ ذات کی سچّی کمائی دے

ابتدائے دوشیزگی کی رومانویت ہو یا بھرپور نسوانی جذبوں کی تمازت، پروین نے پوری کامیابی کے ساتھ ان تمام کیفیتوں کی ترجمانی کی ہے۔ اس نے چاہت سے خواہشِ وصال اور ملاپ سے مہجوری تک تمام فطری نسوانی تقاضوں اور تجربوں کے بیان میں بڑی جرأت اور دیانت کا ثبوت دیا مگر اس کے یہاں جرأتِ اظہار کا مطلب دریدہ دہنی ہرگز نہیں۔ اس نے تو محبتوں کے لمس اور

ذائقے کے اظہار میں ایسی احتیاط اور خوش سلیقگی کا ثبوت دیا ہے کہ اس سے اس کی شاعری کی شائستگی میں اضافہ ہوا ہے۔ ڈیپارٹمنٹل اسٹور، رفاقت، آنے والی کل کا دکھ، اتنا معلوم ہے، کنگن بیلے کا، (Ecstasy) ایکسٹیسی، اس کی آواز، سرشاری، ویسٹ لینڈ، جدائی کے بندی خانے میں، ایک خط، ایک تنہا ستارہ، چہ کنم، ورکنگ وومن، سنڈریلا، ان وزیٹڈ اور اسی قبیل کی بہت ساری دیگر نظمیں ـــــ کوئی نظم اٹھا لیجئے، پروین شاکر کے یہاں رنگا رنگ نسوانی جذبات کا اظہار بالکل فطری انداز میں ملے گا۔

رومانی لہجہ پروین کی پہچان ضرور بنا مگر مطالعے کی وسعت نے اس کی شاعری کو نئے مشاہدوں، تجربوں اور خوبصورت فکری زاویوں سے مالا مال کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اگر ایک طرف شیکسپیئر سے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ تک بہت سے انگریزی تخلیق کاروں سے استفادہ کرتی نظر آتی ہے تو دوسری طرف اس کے یہاں پرانی داستانوں اور دیومالاؤں کے کردار بھی بولتے نظر آتے ہیں۔

پروین کی شاعری میں وطن اور ابنائے وطن کا ذکر بھی ہے اور مذہبی اور تہذیبی حوالے بھی مگر بنیادی طور پر اس کی شاعری کا منظر نامہ 'مدینۂ تمنا' اور 'کوفۂ عشق' کے درمیان اس کے اپنے سفر کے تجربوں سے عبارت ہے۔ وہ اردو شاعری کی سنڈریلا تھی جسے لوگوں نے ہمیشہ شہرت کے جادوئی بال روم میں محوِ رقص ہی دیکھا مگر وہ جس دکھ نگری کی باسی تھی وہاں تک پہنچنے کے لئے ہمیں اس کے بلوریں شعر کو اپنا رہنما بنانا پڑے گا۔ اس کی نظموں میں ہمیں نت نئے فکری گوشے روشن ہوتے نظر آتے ہیں اور اس کی غزلیں ندرتِ خیال کا پتہ دینے کے ساتھ ساتھ سادگی و پُرکاری کا نمونہ اور الم انگیز موسیقیت سے پُر ہیں۔ رومانی دور گزرنے کے بعد کی شاعری میں ہمیں پروین کے یہاں تنہائی کے اُداس رنگ گہرے ہوتے نظر آتے ہیں مگر ذاتی المیے نے اس کے فن میں قنوطیت کے بجائے گہری فلسفیانہ بصیرت کو جنم دیا ہے۔

زندگی کے تمام تلخ و شیریں ذائقے اس کے ہر شعر میں موجود ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ ہر احساس کو پوری سچائی کے ساتھ لفظوں میں منتقل کرنے کی عادی تھی۔ وہ تو موت کا ذائقہ بھی لکھنا چاہتی تھی:

موت کا ذائقہ لکھنے کے لئے
ایک لمحے کو ذرا مر دیکھوں

شاید اسے موت کا ڈر نہ تھا۔ وہ بڑی بہادر تھی۔ اس نے اپنی زندگی بھی بہت حوصلے سے بسر کی، وہ زندگی جو شاید اس کے لئے دکھوں کا سلسلہ تھی:

شاید اُس نے مجھ کو تنہا دیکھ لیا ہے   دُکھ نے میرے گھر کا رستہ دیکھ لیا ہے

مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نے اپنی خوشیوں اور تمناؤں کے خاک ہونے پر اُن کے کتبے لکھے ہیں، نوحے نہیں لکھے۔ اس نے ہمیشہ تنہائی کے دکھ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کیا۔ پروین کا یہی انکار اس کی شاعری کا مزاج تھا مگر وہ انا پرست نہیں آن پرست تھی اور اس نے اپنی آن کا پرچم ہمیشہ سربلند رکھا، اپنی شاعری میں بھی۔ اس نے دعا بھی یہی مانگی تھی:

پہروں کی تشنگی میں بھی ثابت قدم رہوں   دشتِ بلا میں روح مجھے کربلائی دے

تو اس کربلائی روح نے آخری لمحے تک بھرپور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور موت کا ذائقہ چکھنے تک زندگی کی توانائیوں کو اتنی خوبی سے استعمال کیا کہ جو کچھ اس نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے اس میں ہمیں موت کا نہیں، زندگی کا ذائقہ ملتا ہے۔

(دوبئی میں پروین شاکر کے لئے ہونے والے تعزیتی اجلاس میں پڑھا گیا)

پروین — تمنّا کی استقامت

احمد ندیم قاسمی

غالب کا ایک شعر ہے جو اُس وقت تک زندہ رہے گا جب تک انسان کے اندر جذبے کی سچائی زندہ ہے۔ شعر یہ ہے:

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

مجھے پروین کی شاعری اس شعر کا پھیلاؤ معلوم ہوتی ہے۔ جذبوں کی تکمیل اور خوابوں کی تعبیر کا انتظار جبھی ممکن ہے جب انسان کے اندر تمنا کرنے کی صداقت ہو، اس تمنا کے فن کارانہ اظہار میں حسن و دیانت ہو اور پھر اس تمنا کو عمر بھر زندہ و برقرار رکھنے کا حوصلہ ہو۔ تمنا کرنے یعنی انتظار کرتے رہنے کے اس طلسم نے ہومر سے لے کر غالب اور پھر آج تک کی اونچی سچی اور کھری شاعری کو قلبِ انسانی کی طرح دھڑکنا سکھایا ہے اور پروین اسی طلسم کاری سے اردو شاعری کو سچے جذبوں کی قوسِ قزحی بارش میں نہلا رہی ہے۔

وہ جسے ہم رومانیت کہتے ہیں، دراصل وہ سچ ہے جسے معاشرے کے بعض اندھے رواجوں اور مسلط نظاموں نے پامال کر رکھا ہو۔ سچا جذبہ، سچی بات اور سچا عمل ہی رومانیت ہے اور اس لفظ کے اصطلاحی مفہوم سے قطعِ نظر، ہر وہ شاعر جس نے بڑی شاعری تخلیق کی ہے، اس حقیقت افروز رومانیت سے بہرہ اندوز ہے اور آج اردو شاعری کی سرزمینوں پر پروین کی بیک وقت دلآویز اور دل گداز رومانیت، آسمان کی طرح چھا رہی ہے۔

جذبے کی جس سچائی سے پروین نے اردو شاعری کے قارئین کے دل و دماغ دونوں کو اُن کی گہرائیوں کی آخری حد تک متاثر کیا ہے، وہ سچائی "خوشبو" میں اس کے ذاتی کرب کی نیں تھی:

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

"خوشبو" کی دلآویزی اور دل گدازی اس لئے لوگوں کو محبوب رہی کہ اس کے جذبوں اور لفظوں میں انھوں نے وہ آئینے دیکھے تھے جن میں خد و خال کے علاوہ پسِ خد و خال کی کیفیات بھی منعکس تھیں۔

"صد برگ" میں اس سچائی نے ماورائے ذات کے آفاق پر بھی ایک دریچہ کھولا، اور کہیں کہیں یہ سچائی اُس طنز کا لہجہ بھی اختیار کر گئی جو موجود صورتِ حالات سے ناطمئن حق گوئی کا لہجہ ہے:

ہنسی کو دیکھ سُن کے ایک بار میں بھی چونک اٹھی
یہ مجھ میں دکھ چھپانے کا کمال کیسے آگیا
ابھی تو دھوپ روزنِ قفس سے کوسوں دور تھی
ابھی سے آفتاب کو زوال کیسے آگیا

اب "خود کلامی" میں سچائی کی اس دھار نے پروین کی شاعری میں ایسی کاٹ پیدا کر لی ہے کہ اس تصنع بھرے، ریاکار، منافق اور زر پرست معاشرے کا شاید ہی کوئی جھوٹ اس کی زد سے بچ رہا ہو۔ حیرت و مسرت کی بات یہ ہے کہ پروین نے سیکڑوں میں پہچانے جانے والے اپنے لہجے کی انفرادیت کی قربانی دیئے بغیر اس تیز دھار کو بڑے موثر انداز میں استعمال کیا ہے:

دل آزاری بھی اک فن ہے
اور کچھ لوگ تو
ساری زندگی اسی کی روٹی کھاتے ہیں
چاہے ان کا برج کوئی ہو
عقرب ہی لگتے ہیں
تیسرے درجے کے پیلے اخباروں پر یہ
اپنی یرقانی سوچوں سے
اور بھی زردی ملتے رہتے ہیں!

اور غزل کی زبان میں:

کیا جاں کے خسارے کی تمنا ہو کہ اب عشق
بڑھتا ہی نہیں درہم و دینار کے آگے

کچھ فیصلہ تو ہو کہ کدھر جانا چاہیئے
پانی کو اب تو سر سے گزر جانا چاہیئے

دل کے غزال کو سارا رم صحرا کی وسعت دیتی ہے
شہرِ رزق میں آنکلا اور ساری وحشت ختم ہوئی

"خوشبو" سے "خود کلامی" تک کا یہ سفر کتنے متنوع تجربوں، سوچ کی کتنی دیدہ و نادیدہ جہتوں اور حسنِ اظہار کے کتنے تیوروں سے آراستہ ہے، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو شاعری کو ہر طرح کے تعصب اور جانبداری سے بلند ہو کر پڑھتے ہیں پھر یہ شاعری صرف اس لئے لائقِ توجہ نہیں ہے کہ اس میں نسائیت ہے، یا یہ نسائی سوچوں، نسائی تجربوں اور نسائی مشاہدوں کی شاعری بھی ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ پروین اپنے عصر کے حقائق کی کیسی کیسی نئی معنویتوں کو، بظاہر کتنی سادگی اور بھولپن سے، مگر دراصل دانش و وجدان کی تمام ممکنہ رسائیوں کے ساتھ، ایک نغمے کی طرح گنگنا دیتی ہے۔

صرف ذات کی تنہائی کے مسئلے کو لے لیجئے جو پوری بیسویں صدی کا مسئلہ ہے۔ مغرب و مشرق میں اس تنہائی نے دردِ مشترک کی صورت اختیار کر رکھی ہے مگر کرۂ ارض کے ان دونوں حصوں میں رہنے والوں کے احساسِ تنہائی کے تناظر اور ان کے مضمرات یکسر مختلف ہیں۔ مغرب میں دو بڑی عالمی جنگوں اور پھر جوہری اسلحہ کی، انجام ناشناس تیاریوں اور ہمہ گیر موت کے خوفناک امکان نے زندگی کو بے مفہوم اور اس طرح انسان کو تنہا بنا دیا ہے، مگر ادھر مشرق میں ہماری دقیانوسی معیشت اور بوسیدہ معاشرت اور نظریاتی

تنگ نظری اور مذہبی تعصبات کے سلسلے میں مبالغہ پسندی اور مغرب کی سائنسی اور مادی ترقی کے سامنے اپنے احساس کمتری نے ہم نے اپنی اپنی تنہائی کے خول چڑھا رکھے ہیں۔ پروین نے "خود کلامی" کی ایک نظم میں اسے بجا طور پر "ہشت پایہ تنہائی" کہا ہے اسی لئے وہ اپنے تخلیقی ضمیر کے تقاضوں سے بے چین ہو کر کہتی ہے:

وہی تنہائی، وہی دھوپ، وہی بے سمتی
گھر میں رہنا بھی ہوا راہ گزر میں رہنا

آلامِ حیات لوٹ آئیں
آسائشیں مجھ کو کھا نہ جائیں

سوچ کے پرندے کو اک پناہ دیتا ہے
دھوپ کی حکومت میں ذہن کا شجر ہونا

بلیغ استعاروں اور بامعنی علامتوں سے سجی سنوری ہوئی اس شاعری کو اگر محمد علی صدیقی کے سے نقاد نے "رجحان ساز شاعری" کہا ہے تو بالکل درست کہا ہے۔

"خود کلامی" کی پہلی غزل کا ایک شعر ہے:

اس کو نہ پا سکے تھے جب دل کا عجیب حال تھا
اب جو پلٹ کے دیکھئے، بات تھی کچھ محال بھی

پروین نے نہ صرف پلٹ کر دیکھنا اور حقیقت کا نیا ادراک حاصل کرنا شروع کر دیا ہے بلکہ اب وہ پنجوں کے بل کھڑی ہو کر مستقبل کے امکانات میں بھی جھانکنے لگی ہے اور یہ تمنا کے اس افسونِ انتظار کا کرشمہ ہے جس سے میں نے اپنی اس مختصر گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ تمنا ہی پروین کی شاعری کے طلسم کا کلیدی لفظ ہے ——— یعنی:

شوقِ پرواز کا ٹوٹے ہوئے پر میں رہنا

اور تمنا کرتے رہنے کی یہ استقامت پروین کی وہ زبردست تخلیقی توانائی ہے جس نے بڑے بڑوں کو حیرت زدہ اور بعض کو تو خوفزدہ کر رکھی ہے۔

اردو غزل میں ایک نئے تجربے کی کوشش
مکالمہ
"ترکش" کے بعد عدیم ہاشمی کی مکالماتی غزلوں کا یہ مجموعہ
شائع ہو چکا ہے۔

ماہِ تمام

پروین کی غزلوں سے منتخب اشعار

آندھی کی زد میں آئے ہوئے پھول کی طرح   میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کے فضا میں بکھر گئی

عکسِ خوشبو ہوں، بکھرنے سے نہ روکے کوئی   اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی
جس طرح خواب مرے ہو گئے ریزہ ریزہ   اس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی

شدّت کی نفرتوں میں سدا جس نے سانس لی   شدّت کا پیار پا کے خلا میں بکھر نہ جائے

موت کا ذائقہ چکھنے کے لئے   چند لمحوں کو ذرا مر دیکھوں

مرا نوحہ کناں کوئی نہیں ہے   سو اپنے سوگ میں خود بال کھولوں

اک عمر ہوئی ہے خود سے لڑتے   اندر سے تمام تھک رہی ہوں

مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے   لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

قضا نے مرے نام کی لوح بھر دی   مری جان، تُو نے بہت دیر کر دی
حسابِ عداوت بھی ہوتا رہے گا   محبّت نے جینے کی مہلت اگر دی

اب زندگی چراغ بکف آئی بھی تو کیا   اک آدمی تو کون و مکاں سے نکل چکا

جب بنامِ دل، گواہی سرکی مانگی جائے گی   خون میں ڈوبا ہوا پرچم ہمارا دیکھنا
ایک مشتِ خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے ۔   زندگی کی بے بسی کا استعارا دیکھنا

حلقۂ خواب کو ہی گردِ گلو کر ڈالا !   دستِ قاتل کا بھی احساں نہ دوانے سے اُٹھا

مرنے سے بھی پہلے مر گئے تھے   جینے سے کچھ ایسے ڈر گئے تھے

ہر بار ایڑیوں پہ گرا ہے مرا لہو   مقتل میں اب بطرزِ دگر جانا چاہیئے

بابِ حیرت سے مجھے اذنِ سفر ہونے کو ہے   تہنیت اے دل ! کہ اب دیوار، در ہونے کو ہے
موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے دل میں کیوں   کیا محبت سے بہت خالی یہ گھر ہونے کو ہے
رونقِ بازار و محفل کم نہیں ہے آج بھی   سانحہ اس شہر میں کوئی مگر ہونے کو ہے

اپنے انجام تک آ گئی زندگی   یہ کہانی مگر اختلافی رہی

بس اتنی عمر تھی اس سرزمینِ دل پہ مری   پھر اس کے بعد اسے وہم و خواب ہونا تھا

کچلے گئے، جب بھی سر اُٹھایا   فٹ پاتھ کی ایسی گھاس تھے ہم

ہَوا کے ہوتے ہوئے روشنی تو کر جاتے   مری طرح سے کوئی زندگی تو کر جاتے

ہر ذرہ جیسے آئنہ بردوش ہوگیا   یہ کون تھا جو خاک میں روپوش ہوگیا

شہرِ جمال کے خس و خاشاک ہوگئے   اب آئے ہو جب آگ سے ہم خاک ہوگئے

تیرے پیمانے میں گردش نہیں باقی ساقی   اور تری بزم سے اب کوئی اُٹھا چاہتا ہے

تری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
مرا تن، مور بن کر ناچتا ہے

بارہا تیرا انتظار کیا
اپنے خوابوں میں، اک دلہن کی طرح

اس سے اک بار تو روٹھوں، میں اسی کی مانند
اور مری طرح سے وہ مجھ کو منانے آئے

وہ سوتے جاگتے رہنے کے موسموں کا فسوں
کہ نیند میں ہوں، مگر نیند بھی نہ آئی ہو

وہ چاند بن کے مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا
میں اس کے ہجر کی راتوں میں کب اکیلی ہوئی

دوست تو خیر کوئی کس کا ہے
اس نے دشمن بھی نہ سمجھا، لوگو!

تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سنوں
الجھ رہا ہے مرے فیصلوں کا ریشم پھر

جسم کے تیرہ و آسیب زدہ مندر میں
دل سرِ شام سلگ اٹھتا ہے صندل کی طرح

چراغ بجھتے رہے اور خواب جلتے رہے
عجیب طرز کا موسم مرے وطن میں رہا!

دستِ ہوا نے جیسے درانتی سنبھال لی
اب کے سروں کی فصل سے کھلیان پٹ گئے

ٹوٹی ہے میری نیند، مگر تم کو اس سے کیا!
بجتے رہیں ہواؤں سے در، تم کو اس سے کیا!

میں پھول چنتی رہی، اور مجھے خبر نہ ہوئی
وہ شخص آ کے مرے شہر سے چلا بھی گیا
یہ غربتیں مری آنکھوں میں کیسی اتری ہیں
کہ خواب بھی مرے رخصت ہیں، رتجگا بھی گیا

اسی امید میں ہر موجِ ہوا کو چوما
چھو کے شاید مرے پیاروں کی قبا آئی ہو
یوں سرِ عام، کھلے سر میں کہاں تک بیٹھوں
کسی جانب سے تو اب میری ردا آئی ہو

جب بھی برسات کے دن آئے، یہی جی چاہا
دھوپ کے شہر میں بھی گھر کے گھٹا آئی ہو

کئی رُتوں سے، مرے نیم وا دریچوں میں
ٹھہر گیا ہے ترے انتظار کا موسم

اچھی آنکھیں جو ملی ہیں اُس کو
کچھ تو لازم ہوا وحشت کرنا
کون چاہے گا تمہیں میری طرح
اب کسی سے نہ محبت کرنا
گھر کا دروازہ کھلا رکھا ہے
وقت مل جائے تو زحمت کرنا

میں بچ بھی جاؤں تو تنہائی مار ڈالے گی
مرے قبیلے کا ہر فرد، قتل گاہ میں ہے

رِدا چھنی مرے سر سے، مگر میں کیا کہتی
کٹا ہُوا تو نہ تھا ہاتھ میرے بھائی کا
نہ دے سکا مجھے تعبیر، خواب تو بخشے
میں احترام کروں گی تری بڑائی کا

گونگے لبوں پہ حرفِ تمنّا کیا مجھے
کس کور چشم شب میں ستارا کیا مجھے
زخمِ ہنر کو سمجھے ہوئے ہیں گلِ ہنر
کس شہرِ ناسپاس میں پیدا کیا مجھے

اندھے ذہنوں سے سوچنے والو!
حرف میں روشنی ملاؤ کبھی
بارشیں کیا زمیں کے دُکھ بانٹیں!
آنسوؤں سے بجھا الاؤ کبھی؟

میں ایسے شخص کی معصومیت پہ کیا لکھوں
جو مجھ کو اپنی خطاؤں میں بھی بھلا ہی لگا
جو ثواب دینے پہ قادر تھا، میری نظروں میں
عذاب دیتے ہوئے بھی مجھے خدا ہی لگا

لڑکیوں کے دُکھ عجب ہوتے ہیں، سُکھ اُس سے عجیب
ہنس رہی ہیں اور کاجل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

ابھی سے میرے رفوگر کے ہاتھ تھکنے لگے
ابھی تو چاک مرے زخم کے سِلے بھی نہیں

وہ مجھ کو برف کے طوفاں میں کیسے چھوڑ گیا
ہوائے سرد میں بھی جب مری حفاظت کی

نہ شام ہے، نہ گھنی رات ہے، نہ پچھلا پہر   عجیب رنگ تری چشمِ سرمگیں سے ملیں
تمام عمر کی نامعتبر رفاقت سے   کہیں بھلا ہو، کہ پل بھر ملیں، یقیں سے ملیں
یہی رہا ہے مقدر مرے کسانوں کا   کہ چاند بوئیں اور ان کو گہن زمیں سے ملیں

دامانِ شب کے نام کوئی روشنی تو ہو   تارے نہیں نصیب تو آنسو بکھیریے

وہ تو خوشبو ہے، ہواؤں میں بکھر جائے گا   مسئلہ پھول کا ہے، پھول کدھر جائے گا
مجھ کو تہذیب کے برزخ کا بنایا وارث   جرم یہ بھی مرے اجداد کے سر جائے گا

تری طرح مری آنکھیں بھی معتبر نہ رہیں   سفر سے قبل ہی رستوں میں وہ سراب اُترے

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی   وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا
اسی طرح سے اگر چاہتا رہا پیہم   سخن وری میں مجھے انتخاب کر دے گا
مری طرح سے کوئی ہے ؟ جو زندگی اپنی   تمہاری یاد کے نام انتساب کر دے گا

راکھ کے ڈھیر پہ اب رات بسر کرنی ہے   جل چکے ہیں مرے خیمے، مرے خوابوں کی طرح

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی !   میں اپنے ہاتھ سے اُس کی دلہن سجاؤں گی
سپرد کر کے اسے چاندنی کے ہاتھوں میں   میں اپنے گھر کے اندھیروں کو لوٹ جاؤں گی
بدن کے کرب کو وہ بھی سمجھ نہ پائے گا   میں دل میں روؤں گی، آنکھوں میں مسکراؤں گی
وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لُطف گئے   میں کس سے روٹھ سکوں گی، کسے مناؤں گی
سماعتوں میں گھنے جنگلوں کی سانسیں ہیں   میں اب کبھی تری آواز سُن نہ پاؤں گی
جواز ڈھونڈ رہا تھا نئی محبت کا   وہ کہہ رہا تھا کہ میں اُس کو بھول جاؤں گی

پھر رہے ہیں مرے اطراف میں بے چہرہ وجود   ان کا کیا نام ہے، یہ لوگ ہیں کن ذاتوں کے

پھر دیدہ و دل کی خیر یا رب !   پھر ذہن میں خواب پل رہا ہے

صحرا کے سفر میں کب ہوں تنہا
ہمراہ سراب چل رہا ہے

جس گھروندے میں ہوا آتے ہوئے کترائے
دھوپ آجائے تو تم اس کو مروّت جانو

کیا دُکھ تھے، کون جان سکے گا، نگارِ شب !
جو میرے اور تیرے دوپٹے بھگو گئے

بس یہ ہُوا کہ اُس نے تکلف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لئے

ہاتھ میرے بھول بیٹھے دستکیں دینے کا فن
بند مجھ پر جب سے اس کے گھر کا دروازہ

میں اپنے حصّے کے دُکھ اُس کے نام کر ڈالوں
کوئی تو ہو جو مجھے اس طرح کا پیارا ہو

گر لمس نہیں تو لفظ ہی بھیج
میں تجھ سے جدا رہوں کہاں تک

باہر سے نئی سفیدیاں ہیں
اندر سے مکان ڈھہ رہا ہے

آگے تو صرف ریت کے دریا دکھائی دیں
کن بستیوں کی سمت مسافر نکل گئے

شدّت ہے مزاج میرے خوں کا
نفرت کی بھی دے تو انتہا دے
دل پھٹنے لگا ہے ضبطِ غم سے
مالک! کوئی درد آشنا دے

کھڑکیوں پر دبیز پردے ہوں
بارشیں پھر بھی دستکیں دیں گی

حلقۂ رنگ سے باہر دیکھوں
خود کو خوشبو میں سمو کر دیکھوں

بادل کو کیا خبر ہے کہ بارش کی چاہ میں
کتنے بلند و بالا شجر خاک ہو گئے

جب بھی غریبِ شہر سے کچھ گفتگو ہوئی   لہجے ہوائے شام کے، نمناک ہو گئے

ملبے سے ہر مکان کے، نکلے ہوئے تھے ہاتھ   آندھی کو تھامنے کی بڑی کوششیں ہوئیں

صدف میں اُتروں تو پھر میں گہر بھی بن جاؤں   صدف سے پہلے مگر حلقۂ نہنگ میں ہوں

ہجر - سناٹا - پچھلے پہر کا چاند   خود سے ملنے کے کچھ وسیلے ہیں

بچھڑتے وقت دلوں کو اگرچہ دُکھ تو ہُوا   کُھلی فضا میں مگر سانس لینا اچھا لگا
چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو   ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

اشک آنکھ میں پھر اٹک رہا ہے   کنکر سا کوئی کھٹک رہا ہے
صدیوں سے سفر میں ہے سمندر   ساحل پہ تھکن ٹپک رہا ہے
اک چاند صلیبِ شاخِ گل پر   بالی کی طرح لٹک رہا ہے

شاید کہ چاند بھول پڑے راستہ کبھی   رکھتے ہیں اس امید پہ کچھ لوگ گھر کُھلے

مجھے بارش کی چاہت نے ڈبویا   میں پختہ شہر کا پکّا مکاں ہوں

سڑکوں پہ رواں یہ آدمی ہیں   یا نیند میں چل رہی ہیں لاشیں

میں تو پاؤں کے کانٹے چُنتی رہی   اور وہ راستہ بدلتا رہا

ملے گی آنسوؤں سے تن کو ٹھنڈک   بڑی لُو ہے، ذرا آنچل بھگو لوں

ٹُوٹنے اور بکھرنے کا کوئی موسم ہو   پھول کی ایک دعا — موجِ ہوا! آہستہ

ماتم کی فضا ہے شہرِ دل میں   مجھ میں کوئی شخص مر گیا ہے

تنہا مری ذات دستِ شب میں   اطراف میں خیمے بدوؤں کے !

ترے ہی بھلے کو چاہتی ہوں کہ   میں تجھ کو کبھی نہ یاد آؤں

پھر ہونے لگی ہوں ریزہ ریزہ   آئے — مجھے میرا فن سمیٹے

ہیں تیز بہت ہوا کے ناخن !   خوشبو سے کہو کہ گھر ہی ٹھہرے
اس شہرِ سخن فروشگاں میں   ہم جیسے تو بے ہنر ہی ٹھہرے

تتلیوں کی بے چینی آ بسی ہے پاؤں میں   ایک پل کو چھاؤں میں، اور پھر ہواؤں میں

پیڑ کو دعا دے کر کٹ گئی بہاروں سے   پھول اتنے بڑھ آئے، کھڑکیاں نہیں کُھلتیں
حُسن کے سمجھنے کو عمر چاہیئے، جاناں !   دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کُھلتیں
ماں سے کیا کہیں گی دُکھ ہجر کا، کہ خود پر بھی   اتنی چھوٹی عمروں کی بچیاں نہیں کُھلتیں

آنکھوں پہ آج چاند نے افشاں چُنی تو کیا   تارہ سا ایک خواب تو مٹی میں مل چکا

جھونکے کچھ ایسے تھپکتے ہیں گلوں کے رُخسار   جیسے اس بار تو پت جھڑ سے بچا ہی لیں گے

جو بادلوں سے بھی مجھ کو چھپائے رکھتا تھا   بڑھی ہے دھوپ تو بے سائبان چھوڑ گیا

کچھ تو وہ یاد بھی بہت آیا   کچھ ان آنکھوں میں بھی لہو ہے بہت

اک عمر سے زندگی کا معمول   تنہائی ہے اور خود کلامی

وہ تو جاں لے کے بھی ویسا ہی سبک نام رہا   عشق کے باب میں سب جُرم ہمارے نکلے

پا بہ گِل سب ہیں، رہائی کی کرے تدبیر کون   دست بستہ شہر میں کھولے مری زنجیر کون

نہ جب خوابوں سے پیاری ہو تو ایسے عہد میں خواب دیکھے کون اور خوابوں کو دے تعبیر کون

جتنا ہو فزوں، عطائے رب ہے تخلیق کا کرب بھی عجب ہے
اس خواب کی لَو کو مت بجھانا یہ میرا چراغِ نیم شب ہے

جینے کی تو آرزو ہی کب تھی مرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے
خوشبو کا حساب ہو چکا ہے اور پھول ابھی کھلا نہیں ہے

ہنسی کو اپنی سُن کے ایک بار میں بھی چونک اُٹھی یہ مجھ میں دُکھ چھپانے کا کمال کیسے آ گیا!

ترے سوا بھی کئی رنگ خوش نظر تھے، مگر جو تجھ کو دیکھ چکا ہو وہ اور کیا دیکھے

دعا کبھی میں نے مانگی تھی دونوں وقت ملتے یہ زندگی بھر کا جھٹپٹا کب دھیان میں تھا

بچھڑ کے وہ مجھے لوٹا گیا ہے میرا وجود یہ سانحہ مرے حق میں تو نیک فال ہی تھا

میں نے ہاتھوں ہی کو پتوار بنایا، ورنہ ایک ٹوٹی ہوئی کشتی مرے کس کام کی تھی

ہارنے میں اک اَنا کی بات تھی جیت جانے میں خسارہ اور ہے
اور کچھ پل اس کا رستہ دیکھ لوں آسماں پر ایک تارہ اور ہے

بادباں کھلنے سے پہلے کا اشارہ دیکھنا میں سمندر دیکھتی ہوں، تم کنارہ دیکھنا

آتشِ جاں سے قفس آپ ہی جل جانا تھا قفلِ زنداں! ترا مقسوم پگھل جانا تھا
فصل بروقت نہ کٹتی جو سروں کی پروین آسمانوں نے زمینوں کو نگل جانا تھا

زمیں کی پُشت تحمل سے دوہری ہو جائے اگر وہ بوجھ اٹھائے جو ہم اٹھاتے ہیں

کچھ تو ہوا بھی سرد تھی، کچھ تھا ترا خیال بھی
دل کو خوشی کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ملال بھی
سب سے نظر بچا کے وہ مجھ کو کچھ ایسے دیکھتا
ایک دفعہ تو رُک گئی گردشِ ماہ و سال بھی
دل تو چمک سکے گا کیا، پھر بھی ترش کے دیکھ لیں
شیشہ گرانِ شہر کے ہاتھ کا یہ کمال بھی
اس کو نہ پا سکے تھے جب دل کا عجیب حال تھا
اب جو پلٹ کے دیکھیے، بات تھی کچھ محال بھی
میری طلب تھا ایک شخص، وہ جو نہیں ملا تو پھر
ہاتھ دعا سے یوں گرا، بھول گیا سوال بھی
اس کے ہی بازوؤں میں، اور اس کو ہی سوچتے رہے
جسم کی خواہشوں پہ تھے روح کے اور جال بھی
شام کی ناسمجھ ہوا پوچھ رہی ہے اک پتا
موجِ ہوائے کوئے یار! کچھ تو مرا خیال بھی

آلامِ حیات ٹوٹ آئیں
آسائشیں مجھ کو کھا نہ جائیں
تو مقتلِ شب سے آ رہی ہے
اے صبح! تجھے گلے لگائیں
آسان ہی سہی بچھڑ کے رہنا
پر اُس کا سا دل کہاں سے لائیں
معلوم، کہ چھوڑنا ہے اک دن
پھر بھی یہ لگن کہ گھر بنائیں

لازم تھا گزرنا زندگی سے
بن زہر پیے گزارا کب تھا
کچھ پل اسے اور دیکھ سکتے
اشکوں کو مگر گوارا کب تھا

ہوا سے سرکشی میں پھول کا اپنا زیاں دیکھا
سو جھکتا جا رہا ہے اب یہ سر آہستہ آہستہ

جب ستارے ہی نہیں مل پائے
لے کے ہم شمس و قمر کیا کرتے
وہ مسافر ہی کھلی دھوپ کا تھا
سائے پھیلا کے شجر کیا کرتے

سب رُتیں آ کے چلی جاتی ہیں
موسمِ غم بھی تو ہجرت کرتا

وہ تو اک سادہ و کم شوق کا طالب نکلا
ہم نے ناحق ہی گنوایا اُسے آرائش میں

مرنے اگر نہ پائی تو زندہ بھی کب رہی
تنہا کٹی وہ عمر جو تھی تیرے ساتھ کی

اک ایسی بارش ہو میرے شہر پہ، جو
سارے دل اور سارے دریچے دھو جائے

شاید اس نے مجھ کو تنہا دیکھ لیا ہے   دکھ نے میرے گھر کا رستہ دیکھ لیا ہے

اسی امید پہ ہر شام بجھائے ہیں چراغ   ایک تارا ہے سرِ بام ابھرنے والا

دشت و دریا سے گزرنا ہو کہ گھر میں رہنا   اب تو ہر حال میں ہے ہم کو سفر میں رہنا
دل کو ہر پل کسی جادو کے اثر میں رہنا   خود سے نکلے تو کسی اور کے ڈر میں رہنا
میں تو ہر چہرے میں اب تک وہی چہرہ دیکھوں   اس کو ہر روز تماشائے دگر میں رہنا
وہی تنہائی، وہی دھوپ، وہی بے سمتی   گھر میں رہنا بھی ہوا راہگزر میں رہنا
گھاس کی طرح جہاں بھوک اگا کرتی ہے   اتنا آساں نہیں شاخِ ثمر میں رہنا
کوئی سیفو ہو، کہ میرا ہو کہ پروین، اسے   راس آتا ہی نہیں چاند نگر میں رہنا

آنے میں گھر مرے، تجھے جتنی جھجک رہی   اس درجہ تو میں بے سروسامان بھی نہ تھی
اتنا سمجھ چکی تھی میں اس کے مزاج کو   وہ جا رہا تھا، اور میں حیران بھی نہ تھی
روتی رہی اگر تو میں مجبور تھی بہت   وہ رات کاٹنی کوئی آسان بھی نہ تھی

اک دوسرے کو جان نہ پائے تمام عمر   ہم ہی عجیب تھے کہ زمانہ عجیب تھا

یہ کیسا اذنِ تکلّم ہے، جس کی تاب نہ ہو   سوال کرنے دیا جائے اور جواب نہ ہو
اگر خلوص کی دولت کے گوشوارے بنیں   تو شہر بھر میں کوئی صاحبِ نصاب نہ ہو
ہے مسئلہ مرے سورج مکھی قبیلے کا   کہ صبح نکلے مگر ساتھ آفتاب نہ ہو
چراغِ طاقِ تمنا میں رکھ کے بھول گئی   دعا وہ مانگ رہی تھی جو مستجاب نہ ہو
سکوتِ خلق سمندر کی نیند ہوتا ہے   سکوں نہ جان، بظاہر جو اضطراب نہ ہو

چراغ مانگتے رہنے کا کچھ سبب بھی نہیں   اندھیرا کیسے بتائیں کہ اب تو شب بھی نہیں
جو میرے شعر میں مجھ سے زیادہ بولتا ہے   میں اس کی بزم میں اک حرفِ زیرِ لب بھی نہیں
کمال شخص تھا جس نے مجھے تباہ کیا   خلاف اس کے، یہ دل ہو سکا ہے اب بھی نہیں
یہ دستکیں، یہ مری زندگی کی آدھی رات   ہوا کا شور سمجھ لوں تو کچھ عجب بھی نہیں
یہ دکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلح کی ہم نے   ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

حساب دربدری تجھ سے مانگ سکتا ہے
غریب شہر مگر اتنا بے ادب بھی نہیں

پاسبانی پہ، اندھیرے کو تو گھر پر رکھا
اور چراغوں کو تری راہگزر پر رکھا

پھر تو امکانات پھولوں کی طرح کھلتے گئے
ایک ننھے سے شگوفے کو شجر اس نے کیا

فشار جاں کے بہت ہیں، اگر نظر آئیں
ہر ایک زلزلہ زیرِ زمیں نہیں آتا

کیا ناخنِ مہر ومہ سے کٹتی
جس شب کی گرہ پڑی ہو دل میں

عشق نے سیکھ ہی لی وقت کی تقسیم کہ اب
وہ مجھے یاد تو آتا ہے، مگر کام کے بعد
ہندسے گدھ کی طرح دن مرا کھا جاتے ہیں
حرف ملنے مجھے آتے ہیں ذرا شام کے بعد

جتنی کم سچائی ہوگی، اتنی ہوگی آرائش
جب مضمون سے لفظ ہوں زائد، سمجھو عبارت ختم
دل کے غزال کو سارا رم صحرا کی وسعت دیتی ہے
فکرِ رزق میں آ نکلا اور ساری وحشت ختم

ستارہ ہی نہیں جب ساتھ دیتا
تو کشتی کام لے کیا بادباں سے

ایک سہانی صبح کو شہر جلا ہوا ملا
ہوتی رہیں حفاظتیں خلقِ الہ کے لئے

بزم انجم میں قبا خاک کی پہنی میں نے
اور مری ساری فضیلت اسی پوشاک سے ہے
اتنی روشن ہے تری صبح، کہ ہوتا ہے گماں
یہ اجالا تو کسی دیدۂ نمناک سے ہے

باغ کا حصہ تو میں بھی ہوں مگر میرا وجود
سبز بھی اتنا نہیں ہے، اور کچھ خود رو بھی ہے

ابر برسے تو عنایت اُس کی
شاخ تو صرف دعا کرتی ہے
مسئلہ جب بھی چراغوں کا اُٹھا
فیصلہ صرف ہوا کرتی ہے

صحرا کی طرح تھیں خشک آنکھیں   بارش کہیں دل میں ہو رہی تھی

رہِ حیات میں اب کوئی ایسا موڑ نہیں   کہ جس کے بعد تری رہگذر نہیں آتی

کلہم ایک دیا اور ہوا کی اقلیم   پھیلتی جائے مقدر کی سیاہی کی طرح

خود پھول کی طرح مجھے کھلنے کا شوق تھا   اب تیز ہے ہوا تو ہوا کا قصور کیا

ایک ہی بار یہ گھر راکھ ہو، جاں تو چھوٹے   آگ کم ہے تو ہوا اور مہیا کر لیں

قاتل کو کوئی قتل کے آداب سکھائے   دستار کے ہوتے ہوئے سر کاٹ رہا ہے

زمینِ دل یونہی شاداب تو نہیں اے دوست   قریب میں کوئی دریا ضرور بہتا ہے
گھنے درختوں کے گرنے پہ، ماسوائے ہوا   عذابِ دربدری اور کون سہتا ہے

گردشِ دوراں ترے احسان بہت ہیں   کچھ دیر ترے ساتھ بھی اب رقص کیا جائے
بخیہ گروں میں یہی آئینِ رفو ہے   جو زخم سیا جائے، ادھورا ہی سیا جائے

یہ تیز دھوپ تو چبھتی ہمیں بھی ہے   ہم چپ کھڑے ہوئے ہیں کہ تو سائباں میں ہے

میں تو تا عمر ترے شہر میں رکنا چاہوں   کوئی آ کر مرا اسبابِ سفر تو کھولے

یہ دل میسر و موجود سے بہلتا نہیں   کوئی تو ہو جو مری دسترس سے باہر ہو

خاموشی بھی گرد و پیش میں طاری نہ ہو   دل دھڑکنے کی صدا کانوں میں صاف آنے لگے

تجھ سے جدا رکھتا ہے اور دکھ تک نہیں ہوتا   مرے اندر ترے جیسا یہ آخر کون رہتا ہے

اس چمن زار میں ہم سبزۂ بیگانہ سہی   آپ ہم کو نظر انداز نہیں کر سکتے
عشق کرنا ہے تو پھر سارا اثاثہ لائیں   اس میں تو کچھ بھی پس انداز نہیں کر سکتے

گھر آپ ہی جگمگا اُٹھے گا   دہلیز پہ اک قدم بہت ہے

دعا اب چاہے بامِ عرش چھو لے   ترے در سے تو یہ ناکام آئی

جن چراغوں کو میسّر نہیں اس کی محفل   انتظار اس کا سرِ راہگزر کھینچتے ہیں

مجھ میں کبھی آہٹ کی طرح سے کوئی آئے   اک بند گلی کی طرح سنسان بہت ہوں

کھینچا ہے جب بھی طول وراثت کی جنگ نے   وارث بھی تخت پر نہ رہا، تخت بھی نہیں

پتھّر میں گلاب دیکھتا ہے   کس درجہ ہے مجھ سے خوش گماں تُو

تمام رات مری خواب گاہ روشن تھی   کسی نے خواب میں اک پھول دے دیا تھا مجھے

ابھی تیرے لبوں پر ذکرِ فصلِ گُل نہیں آیا   مگر اک پھول کھلتے اپنے اندر دیکھ سکتی ہوں
مجھے تیری محبّت نے عجب اک روشنی بخشی   میں اس دنیا کو اب پہلے سے بہتر دیکھ سکتی ہوں

اے مری گل زمیں! تجھے چاہ تھی اک کتاب کی   اہلِ کتاب نے مگر کیا ترا حال کر دیا
ممکنہ فیصلوں میں اک ہجر کا فیصلہ بھی تھا   ہم نے تو ایک بات کی، اس نے کمال کر دیا
مدّتوں بعد اس نے آج مجھ سے کوئی گلہ کیا   منصبِ دلبری پہ کیا مجھ کو بحال کر دیا!

ایک لمحے کی توجہ نہیں حاصل اُس کی   اور یہ دل کہ اسے حد سے سوا چاہتا ہے
ریت ہی ریت ہے اس دل میں، مسافر میرے!   اور یہ صحرا ترا نقشِ کفِ پا چاہتا ہے

شبنم رومانی

پروین شاکر کے نام

ب
ت سے شاہکار نفی ہو گئیں
فقط شاعری ہو گئیں

ں
اُداب” کہنا بھی
ادب ہو گیا
جھ بھی چاہا
ہو گیا
سفر
ہو گیا

جلدی میں تھیں
ی نہ دیکھا
اُردو کو تم سے،

تمہارے سبک شعر سے
کس قدر پیار ہے
تم نے یہ بھی نہ سوچا
کہ صد برگ خوشبو سے اب
کس لیے بے سبب
تم کو انکار ہے!

خود کلامی بجا
پر ہمیں یہ بتاؤ ذرا
کیا کوئی اور بھی ایسی زندہ زمیں
آسمانوں کے اُس پار ہے؟؟

قتیل شفائی

پروین شاکر کی یاد میں

اپنی پیاری پیاری غزل کا دھیان نہ کچھ بھی آیا تجھے
زندہ رہنے والے دنوں میں کیوں مرجانا بھایا تجھے

اتنی اچھی شاعری مت کر، تجھ کو نظر لگ جائے گی
سوسو بار ترے غم خواروں، پیاروں نے سمجھایا تجھے

قریہ قریہ پیاس بجھائی تُو نے پیاسے ذہنوں کی
بدلی جیسا قدرت نے ہر دھڑکن پر برسایا تجھے

کبھی نہ ہم جُھٹلا پائے تھے تیرے ہنستے چہرے کو
کہتے ہیں اندر اندر حالات نے بہت ستایا تجھے

ظالم موت نے عمر کی نقدی تجھ سے چھین بھی لی تو کیا
حاصل ہے اب دُنیا بھر کے اشکوں کا سرمایا تجھے

وقت نے جب منہ پھیرنا چاہا تجھ سے لمحہ بھر کے لئے
آنے والے کئی کئی برسوں نے گلے لگایا تجھے

چاہتا ہوگا غزلیں تیری، اہلِ جنّت بھی سُن لیں
اسی لئے اللہ نے شاید اپنے پاس بلایا تجھے

کئے ہیں روشن اُس مرقد پر دئے قتیلؔ کے اشکوں نے
جس مرقد پر سسکیاں لیتی دعاؤں نے دفنایا تجھے

ژانگ شیشوانے (انتخاب عالم)

پروین شاکر کی بے وقت موت پر

وہی "صد برگ" راس آیا خزاں کو
تھا جس پر ناز سارے بوستان کو
ابھی تک آ رہی ہے اس کی "خوشبو"
کیا تھا جس نے نادم زعفران کو
وہ اب بھی "خود کلامی" کی زبان میں
سناتی ہے غزل اہلِ جہاں کو
کرے منسوخ اپنا حُکم آقا!
کہ ہے "انکار" اس سے بندگاں کو
ہوئی "ماہِ تمام" آخر، و لیکن
ادھورا کر گئی وہ داستاں کو

وہ زندہ ہے، سدا زندہ رہے گی
بڑھایا جس نے فن کی آن و شاں کو
چمن خوں رو رہا ہے مرگِ گل پر
کبھی تو رحم آئے آسماں کو
بہت طوفان عالمؔ اٹھ چکے ہیں
خدا محفوظ رکھے کارواں کو

(ایجنگ)

عرفانہ عزیز

اے لبِ احمریں

پروین سے خطاب

لبِ احمریں !
کیا تجھے یاد ہے ؟
ِی معصومیت پر کیے تھے رقم

ف جب
روحِ یزداں کے اسرارِ خاموش نے
دل برسائے تھے تیری آواز پر
ِخرو ماں کی آغوش نے

آج لیکن تہِ کہکشاں
رشکِ پروین
اُفق کے وہی نیلگوں سے دریچے
ہیں نوحہ کناں
جن میں رکھے تھے تُو نے
اُجالوں کے نارنج سے پھُول ــــ وہ
جن کی خوشبو سے مہکی تھی
شہرِ سخن کی ہر اک رہگذر
رنگ نارنج پھُولوں کا اب کھو گیا ہے کہیں

اے لبِ احمریں !
جس سے گزری ہے تیری مہک
شہرِ گُل کی اُسی راہ پر
اِک مُسافر کا میرے لبوں پر ابھی قرض تھا مرثیہ

یہ بھی سچ ہے کہ بھرتا نہیں
موت کا ساتگیں
رس گلوں کا بہاروں میں کر کے کشید
اِک پریخانۂ نورِ خورشید تھا
وہ نگارِ وطن کا جیالا شہید
مثلِ اشکِ رواں عارضِ صبح سے جو جُدا ہو گیا
عرصۂ دہر کی تیرگی میں مگر

میری پروین !
تری شاخِ مژگاں پہ مشعل بکف
جو تھا نجمِ سحر
روئے گیتی سے کیوں وہ خفا ہو گیا ؟

بھٹو شہید

نجیب احمد

سخن آباد سے ایک نظم

پروین کی نذر

ترا شہرِ سخن آباد ہے
الفاظ میں، اوراق میں، نظموں میں، غزلوں میں
ہمارے ذہن کے خوابیدہ خانوں میں
ہماری خاک کے فہمیدہ خانوں میں

ہماری یاد کے آفاق پر روشن
تری سطروں کا سُورج ہے
ہنر ماتھے کا جھُومر ہے
سخن، ہونٹوں کی لالی ہے
غزل آنکھوں کی جھلمل ہے

ترے دستِ ہُنر پر فکر کی مہندی
ترے رنگِ غزل میں جذب کا سونا
تری نظموں میں کم آہنگ رنگوں کا رواں دریا
اور ان جھلمل مناظر میں
تری سوچوں کی چوٹی پر کھڑے ہو کر
مہ و انجم سے دل کی بات کہنا کس قدر آسان لگتا ہے
تری سوچوں کی چوٹی سے
ترے جذبوں کی وادی تک
ترے لہجے کی ہریالی بچھی ہے
اور اس سبزے میں لفظوں کے پرندے
آگہی کا چوگ چُنتے ہیں
ہم اُن کے گیت سُنتے ہیں

اِدھر شہرِ سخن کی آخری حد ہے
اُدھر ملکِ عدم کے باب کا پہلا منارا ہے
اِدھر اک استعارا ہے
اُدھر اک استعارا ہے
اِدھر شہرِ سخن کا آخری گُل ہے
اُدھر ملکِ عدم کا "رابطہ پُل" ہے
یہ دریائے تواتر ہے، روایت کے کنارے پر سخن گُل ہے
وہ امواجِ تسلسل ہیں اور ان موجوں کے اوپر جھولتا پُل ہے

ہَوا میں جھولتا پُل ہے
ہوا میں جھولتے پُل پر کناروں سے بندھی رسّی
ہوا میں جھولتے پُل کی مسافت کا سہارا ہے
مسافر جھولتے پُل پر بندھی رسّی پکڑ کر فن کا دریا پار کرتے ہیں
مگر اس جھولتی رسّی کے ریشے خنجروں کی کاٹ رکھتے ہیں
تری کومل ہتھیلی میں یہ ریشے خنجروں کی دھار کی مانند اُترے ہیں
تری زخمی ہتھیلی نے جہاں رسّی کو چھوڑا ہے
وہاں لفظوں کا توڑا ہے
کہ یہ تیری لحد کی دلدلی مٹّی کا بے آباد رقبہ ہے
یہاں چاروں طرف کافور کی خوشبو کا ملبہ ہے

یہ ملبہ اُڑ رہا ہے
سو اِسے خاکِ لحد میں شام سے پہلے اُتر جانے کی جلدی ہے
تجھے، اے ماہ و انجم آشنا!
ہر شام کی مانند گھر جانے کی جلدی ہے
مگر، گھر گھر، سکوتِ مرگ کی سُونی کلائی میں
تری یادوں کے گجرے ہیں، ترے نوحوں کا گہنا ہے
مگر، اے نکہتِ غم آشنا!
مسمار ہو کر بھی، ہمیں، تیرا، "سخن آباد" رہنا ہے

شاہدہ حسن

پروین کے نام

اے شہرِ سخن کی شاہزادی!
ہیں حرفِ ہنر تری گواہی

صد حیف! یہ کیا خبر ملی ہے!
تُو خون میں تربتر ملی ہے!

چُپ چاپ نہ جانِ جاں رہو تم
کچھ خود بھی زباں سے بول دو تم

کیسا یہ عجیب سانحہ ہے!
آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے!

پہنے ہوئے آنسوؤں کی خلعت
"صد برگ" ہے موسمِ محبّت

کیا کم تھا، وہ رنگِ ناتمامی
وہ گُل بدنی، وہ لالہ فامی

"انکار" کی ساعتیں عجب ہیں
آنکھیں ہیں خموش، گنگ لب ہیں

مٹّی میں کلی ملی یہ کیسی؟
پوشاک نئی سلی یہ کیسی؟

یاد آئی تمہاری خوش خرامی
کرتی ہوں گی لہو سے "خود کلامی"

پروین یہ کیا ستم ہُوا ہے
"خوشبو" کا سفر ہی رُک گیا ہے

کیا جانئے، کون سی اَنی ہے
سینے میں جو آکے گڑ گئی ہے

کس طرح فضا میں ہو گئیں گُم
سب روشنیاں لئے ہوئے تم

کس دل سے یہ ماجرا لکھوں میں
کس طرح یہ مرثیہ لکھوں میں

یُوں خاک میں کیوں اُتر گئی ہو؟
کیوں شہر میں شام کر گئی ہو؟

بچپن کی کسک ہے، کم نہ ہوگی
یہ یاد کبھی رقم نہ ہوگی

احسان اکبر

پروین شاکر کی یاد میں

سمومِ زردرُو گل ریز ہے
ہر ریزۂ گُل سے گزُرتی ہے
گزر جائے
ہوا کے ساتھ ہنستا لہلہاتا پھُول
اپنے شاخچے کے ہم قدم رہتا ہے
گل کیوں شاخ اپنی چھوڑتا ؟
لیکن ملال برگ گل نے
آتے لمحوں کی ہَوا کو
رنگ کی جو راکھیاں باندھیں
ہَوا کے دُوسرے جھونکے نے ساری کھول دیں

سب نکہتیں کلیوں کے دفتر میں بندھی رکھّی رہیں
اس نو بہارِ حسن کا
گل مرگ تک والا سفر
گو قرمزی رنگوں سے کے بکھراؤ کا وقفہ تھا

سفر خُوشبو کا آساں تھا
اُسے چلنے میں قدموں کی تو محتاجی نہ تھی

محُسن بھوپالی

قطعۂ تاریخِ وفات

کِس لیے غم گیں نہ ہوں اہلِ قلم، اہل نظر
ہے ادب کا سانحہ، اِک فرد کا یہ حادثہ

جستجو تاریخ کی جب کی، سروشِ غیب نے
دی ندا "پروین شاکر کی وفاتِ عاجلہ"

۱۴۱۵ھ

ناھید قاسمی

اے عمّو کی بیٹی

یقیناً تُو بہادر تھی
بہت پیاری سی، نازک سی
مؤدب، پُر وقار اور صاحبِ احساس!
تیرے سارے ناز اُٹھائے میرے ابّا جی نے
تو نے حق ادا کرنے میں کوئی بھی کمی رہنے نہ دی
تیری کسی بھی کامیابی پر جب ابّا خوش ہوئے
اور داد دی
تو تیری آنکھوں میں کئی جگنو چمک اُٹھے
تری کوئی بھی بات ان کو نہیں اچھی لگی
تو تُو نے جلدی سے کہا:
”اے میرے عمّو! بس یہ طے ہے
اب کبھی ایسا نہیں ہوگا——
تمہارے صاف دامن پر میں دھبّا تو نہیں ہوں
میں تو خوشبو ہوں“
تو اکثر ننھی بچّی کی طرح انگلی چھڑا کر بھاگ جاتی
دُور سے عمّو کو تکتی، مسکراتی، پھر پلٹ آتی،
لپٹ جاتی، منا لیتی، تو رو دیتی
دُکھی جب بھی ہُوئی

تو تیرے عمّو کے محبّت سے چھلکتے لفظ
تیرے آنسوؤں کو پونچھ لیتے تھے

مگر جب بیٹیوں کو اپنے بابل کے شجر کی چھاؤں سے ہٹ کر
جُھلستے، تپتے، جلتے راستوں پر چلنا پڑتا ہے
دہکتی زندگی کے تجربوں کی دُھوپ ان کے سر پہ تاریں
بُننے لگتی ہے
تو وہ اپنے دُکھوں کو اپنی مُسکانوں کے پلّو میں
چُھپا لینے کی کوشش کرنے لگتی ہیں
امنگوں کو وہ اپنے صبر کی دیوار میں چُنوانے لگتی ہیں
اور اپنے غنچہ غنچہ آنسوؤں کی خوشبوؤں کو
اپنی پلکوں کی گھنیری چلمنوں میں قید رکھتی ہیں

مری پروین! مری بہنا!! تُو اک اک بات اپنے پیارے عمّو کو بتاتی تھی
مگر اب تو بنا پوچھے، بنا بولے صبا رفتار تتلی کی طرح چل دی
تجھے شاید نہیں معلوم، تیرے غم کے روکے ہوئے آنسو
مرے ابّا (ترے عمّو) کے دل میں تیرے دُکھ کی
آبشاریں بن گئے ہیں!

ا۔ سنبل

پروین شاکر کی نذر

ٹوٹنے کیوں دیا سلسلہ چاند کا
کوئی تو روکتا راستہ چاند کا
کچھ پتہ تو چلے مدعا چاند کا
یہ کدھر کو چلا قافلہ چاند کا
میرے ہاتھوں سے نکلا چلا جائے ہے
بادلوں بیچ گھیرے سرا چاند کا
روشنی کی بہار روشنی ہے فقط
تیرگی تو نہیں خوں بہا چاند کا
ہم نے ڈھونڈا بہت پر نہ پایا کہیں
کاش کوئی بتائے پتا چاند کا
پیلی، پھیکی سسکتی ہوئی چاندنی
دل کو بہلائے کیا جھنجھنا چاند کا
ساز و سامان ہو ان کے شایانِ شان
چاند چہروں کو ہو آئنہ چاند کا
بادلوں کے کنارے دمکتا ہوا
دے گیا حوصلہ حاشیہ چاند کا

تصدق شحاد

عُجلت پسند نقّاد سے

پروین شاکر کے حوالے سے

اے مرے دیس کے نقّاد! ذرا دیر ٹھہر
اُس کا برّاق کفن ماند تو ہو جانے دے
اُس کی تربت پہ پڑے پھول تو مُرجھانے دے
ناگہاں حشر کی اُفتاد پڑی ہے جن پر
اُن کو اُجڑے ہوئے گھر کا تو یقیں آنے دے
تعزیت کرتی ہوائیں تو ذرا تھم جائیں
طفلِ کم سِن کی اُداسی کو تو بہلانے دے
فاختہ تھک کے بلندی سے گری ہے یک لخت
چند لمحے تو اُسے چین سے سو جانے دے
پھر بہت وقت ہے یہ دادِ سخن دینے کو
نشترِ تُند پہ مظلوم کا کچھ جبر نہیں
سر اُس کی تضحیک میں تھوڑا سا توقّف کر لے
تجھ کو اِس کارِ شجاعت سے اگر صبر نہیں

پسِ جاں

چاند کیا چھپ گیا ہے
گھنے بادلوں کے کنارے
روپہلے ہوئے جا رہے ہیں! (پروین شاکر)

چاند

ایک سے مسافر ہیں
ایک سا مقدّر ہے
میں زمیں پر تنہا
اور وہ آسمانوں میں (پروین شاکر)

منظر حسین اختر

پروین شاکر کیلئے ایک نظم

جہاں ہوا کے قدم پڑے ہیں
برنگِ صبحِ چمن دیارِ سخن کھلا تو
ہوا نے خوشبو کی سبز گرہوں میں آفتابوں سے خواب باندھے
مسافرت کے عمیق صحرا میں دن ڈھلا تو
سیاہیوں کی اسیر قوسِ مژہ پہ شبنم سا چاند رکھا
وہ تارِ شب میں سحر کی جھلمل پرونے والی
وہ سطرِ دل میں لہو کی رنگت سمونے والی
سخن کی دہلیز پر اندھیروں کو پاسبانی کا اذن دے کر
کدھر نہ جانے چلی گئی ہے

اُداس موسم کی آبرو تھی
میں اُس کی مشفق رفیق نظروں میں
اُس کی اعلیٰ نصاب سطروں کی قید میں ہوں

یہ سوچتا ہوں
جہاں ہوا کے قدم پڑے ہیں
ابھی نہیں تھا وہ اُس کا رستہ
سخن کی دہلیز پر اندھیرے وہی پرانے چراغ ڈھونڈیں
ضیائے سطرِ وصال تو نے چراغ سارے لحد میں اپنی جلا لئے ہیں
کہ واپسی کے جو راستے تھے، نشان ان کے مٹا دیئے ہیں

جاوید حیات

پروین شاکر

چاند ستاروں سے اب باتیں کون کرے
رنگیں نظاروں سے باتیں کون کرے

بادِ صبا اب خالی ہاتھ ہی لوٹ آئے
فطری شہکاروں سے باتیں کون کرے

اب بھی نغمے پھوٹیں گے چشموں جھرنوں سے
لیکن کہساروں سے باتیں کون کرے

تتلی، جگنو، خوشبو آج اُداس ہیں کتن
اب اِن بیچاروں سے باتیں کون کرے

کون دھنک کے رنگ بکھیرے گا شعروں
رنگیں شہپاروں سے باتیں کون کرے

بعد ترے، ساون کی جب بھی بارش ہو
رِم جھم جھنکاروں سے باتیں کون کرے

ممتاز مفتی

احمد بشیر

۲۷ر اگست ۱۹۹۵ء کو شام کے چھ بجے ممتاز مفتی اسلام آباد کے ایک ہسپتال میں مرگیا۔ اسے طرح طرح کے امراض نے گھیر رکھا تھا۔ آخر میں اس کے جسم کے سارے دروازے کھل گئے، جن میں سے گندے زہریلے مواد کی پچکاریاں نکلتی تھیں۔ شاید یہ کثافتیں ہی زندگی کا جوہر ہوتی ہیں۔ اس کی جلد اگیزیے سے سرخ اور سیاہ ہو رہی تھی۔ اس کے سارے دانت نکل چکے تھے۔ اس کی آخری کتاب مکمل ہو چکی تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ اب میری جان چھوٹ جائے گی۔ وہ مرنا چاہتا تھا مگر جینے کی لذت بھی اس کا دامن پیچھے سے کھینچتی تھی۔

مرنے سے دس روز قبل وہ بس میں بیٹھ کر لاہور آیا اور چار دن اس نے راج سنگھاسن پر بیٹھ کر گزارے۔ دن بھر لوگ اس کے آنگن میں بیٹھے رہتے۔ وہ دانش کی باتیں کرتا رہا اور ایک بار بھی اس نے جسمانی تھکن کا اظہار نہ کیا حالانکہ اس کی عمر اب نوے سال سے اوپر ہو چکی تھی۔

اس کے چاہنے والوں میں مرد بھی تھے مگر عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے حسرت بھری مسکراہٹ سے مجھے کہا۔ "جب دانت تھے تو بادام نہیں تھے اب دانت نہیں تو بادام ہی بادام چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں۔" یہ اس کے آخری دور کے بعد کی کیفیت ہے جس میں اس نے "لبیک" لکھی "علی پور کا ایلی" نے چلہ چڑھایا اور "الکھ نگری" نے نشانہ لگایا۔ یہ ممتاز مفتی "چپ" اور "ان کہی" اور "مفتیانے" کا ممتاز مفتی نہیں تھا۔ یہ ایک گنہ گار دیوتا کا آشرم تھا، جس میں رادھا ناچتی اور کرشن بنسری بجاتا تھا۔

ممتاز مفتی پر بادامی آنکھوں والی لڑکیاں جان چھڑکتی تھیں۔ اس کی موت پر جن سے ممکن ہو سکا انہوں نے ہجوم کیا۔ جو دور دراز تھیں انہوں نے آنسو بہائے اور بہت سی جو رہ گئیں، دل پکڑ کر ہی رہ گئیں کہ وہ جوگی کس دیس کو چلا گیا ہے؟

ممتاز مفتی کو دو بڑے بھید معلوم ہو گئے تھے اور یہی وہ بھید ہیں جن کے گرد شمس و قمر طواف کرتے ہیں۔ ایک بھید اللہ اور دوسرا عورت۔ اللہ کو خوش کرنے، اسے پہلو میں بٹھانے اور پیار کی کھڑتال بجا کر اسے لبھانے کا فن اسے آ گیا تھا۔ وہ اس تک رسائی کے لیے زندہ اور زیادہ تر مردہ پیروں کے پیر داتبا، ان کی

خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا اور ان کے حضور میں عاجزی سے گیلا ہو جاتا۔ زندوں میں اس کو ایسے پیر پسند تھے جو شریعت کے پابند ہوں۔ مجذوبوں سے' جن کے منہ سے رالیں ٹپکتی ہیں اور جو بنوں میں بھوکے پڑے رہتے ہیں' وہ ڈرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ انہیں قضا و قدر میں دخل ہے۔ جو کچھ وہ کہہ دیں گے ہو جا گا۔ اب کیا معلوم کہ وہ کس وقت' کس دھیان میں ہوں اور کیا کہہ دیں۔ اللہ کو خوش کرنے کے لیے عبادت اس نے کبھی نہ کی۔ کبھی کبھی پانچ پیسے' جب اس میں وقت خرید تھی' پھر پانچ آنے' جب ان میں قوت خرید تھی' پھر پانچ روپے کی نیاز وہ دیتا تھا۔ مگر نماز روزے سے وہ آزاد رہا۔

اسلام پر اپنے سیاسی شعور کی مجہولیت کے باوجود اسے پختہ یقین تھا اور آنحضرت ﷺ کو و انسان اکمل سمجھتا تھا۔ عالمی سطح پر وہ دین و مذہب کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جذباتی سطح پر وہ اس یقین محکم رکھتا تھا مگر اس کا اسلام تنگ دل' تنگ دست اور تنگ نظر نہیں تھا۔ اس کا اسلام بشریت کے تقاضوں کو کوڑے نہیں مارتا تھا۔ وہ حج پر ضرور گیا۔ اگر اس نے وہاں باقاعدگی سے نماز پڑھی اور کپڑے پاک رکھے تو اسکی وجہ قدرت اللہ شہاب کی رفاقت ہوگی جسے وہ خدا کا رازداں' قطب الاقطاب اور مہدی موعود' مقام دیتا تھا۔ قدرت اللہ شہاب ایک گپت تلوار تھا۔ ممکن ہے نیام اندر سے خالی ہو۔ ممکن ہے دو دھار ہو۔ ممتاز کہتا تھا کہ میں نے اسکی کاٹ دیکھی ہے' تم نے نہیں دیکھی۔ تم نہ مانو' میرے سامنے اس کا انکار کر تب بھی مجھے کچھ اعتراض نہ ہوگا۔ کیونکہ تم محض عقلی آدمی ہو۔

اللہ کو راضی کرنے کی دوسری شکل اس کے نزدیک یہ تھی کہ اسکی مخلوق سے محبت کی جائے او اگرچہ اس کی توجہ صنف نازک کی طرف زیادہ رہی مگر مردوں کی خدمت میں بھی اس نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ وہ اپنے ملنے والوں کے بستر اپنے ہاتھ سے بچھاتا' ان کی شخصیتوں کو ابھارتا اور انہیں وجدان کی باتیں بتاتا۔ اس نے زندگی میں ہر شخص کو تعمیر کرنے کی کوشش کی۔ اس نے لوگوں کو نئے رویے دیئے۔ آج سے اکاون برس قبل جب میں اسے گورداسپور میں ملا تو میں ایک ڈرا ہوا نالہ خام تھا۔ میرے ذہن پر طرح طر کے دباؤ تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ ایک دن میں نے اس سے اپنی داخلی کیفیت بیا کی۔ اس نے نہایت توجہ سے میری داستان سنی' پھر اچانک راستہ چلتے رک کر کہا۔ "So What" یع تمہیں یہاں سے بھی زخم لگے گا' وہاں سے بھی خون بہے گا' تو پھر کیا ہو جائے گا؟

اس "سو واٹ" نے مجھے ایک نیا اور جاندار رویہ دے دیا۔ اسی "سو واٹ" کے سہارے میں نے ساری زندگی ڈٹ کر گزاری۔ میں کسی مہم سے نہیں ڈرا۔ کسی بھوت کے آگے میری ٹانگیں نہیں کانپیں جب بھی میں نے کسی شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالا' میں نے کہا "سو واٹ؟" یہ اس کا اتنا بڑا احسان ہے کہ اس بدلہ کبھی چکا ہی نہیں سکتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اسے پتہ بھی نہیں کہ اس نے میری زندگی کا ڈھرا بدل د ہے۔ اس نے بے شمار لوگوں کی زندگیوں کے ڈھرے تبدیل کئے۔ بے شمار لوگوں کو ان کی خوابیدہ صلاحیتوا سے روشناس کرایا۔ بہت سے نئے لکھنے والوں نے اس کے ڈنڈے کے ڈر سے قلم اٹھایا۔ نیلم احمد بشیر' پروی عاطف اور کئی لوگ اس کی وجہ سے اپنے آپ کو دریافت کر سکے۔ میں جو کسی قابل نہیں تھا' جو تھوڑا بہ

لکھتا ہوں، اسی کی عطا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ تم میں ایک اعلیٰ ادیب کے جراثیم موجود ہیں مگر تم صحافت کے کنجر خانے میں جا نکلے۔ اللہ کی مرضی یہی ہوگی کہ تم ضائع ہو جاؤ۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے ضائع ہونے میں اللہ کی رضا نہیں ہوگی۔ میں اسے کوئی وجودی ہستی نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک اللہ ایک خاص قسم کی تخلیقی انرجی کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے جس میں نور کے فوارے اچھلتے ہیں۔ کسی پر کسی رنگ کا چھینٹا پڑ گیا، کسی پر کسی رنگ کا۔ اللہ سے میرے تعلقات اچھے ہمسایوں جیسے ہیں۔ نہ میں نے کبھی اسکی دیوار پر سوکھنے کے لیے اپنے گیلے کپڑے ڈالے، نہ کبھی اس نے میری دیوار پر سوکھنے کے لیے اپنے گیلے کپڑے ڈالے۔ جب کبھی منڈیر پر میری اس سے آنکھیں چار ہوئیں تو میں سلام کر کے گزر جاتا اور وہ مسکرا دیتا۔

میرے خیال میں اگر میں صحافی کی جگہ ادیب بن جاتا تو بھی اللہ میاں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا اور اگر میں ادیب کی بجائے صحافی بن گیا ہوں تو یہ بھی میرے فطرتی رجحان کا نتیجہ ہے۔ اللہ میرا یار چھوٹی چھوٹی چیزوں میں دخل نہیں دیتا۔ مگر ممتاز مفتی کا خیال تھا کہ بغیر اس کی رضا کے، پتہ بھی نہیں ہلتا اور اسکی رضا کی پگڈنڈیاں زندہ اور مردہ پیروں کے حجروں اور مزاروں سے نکلتی ہیں۔ کہتا تھا تقدیر اٹل ہے۔ ہر شے ازل سے لکھی ہوئی چلی آرہی ہے۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ انسان میں خود تخلیق کی قوت موجود ہے یا وہ اجتماعی طور پر اپنے معاملات پر قادر مطلق ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اللہ میاں نے جب مٹی کے پتلے میں اپنی روح پھونکی تھی تو اس نے اس مٹی کے پتلے کو اپنی تخلیقی قوت میں سے بھی حصہ دیا تھا۔ اس کے اندر محبت کے چراغ روشن کیے تھے۔ اسے چھوٹا سا خدا بنایا تھا۔ وہ اس قسم کی باتیں نہیں سمجھتا تھا کیونکہ یہ اندھے عقیدے کی نفی کرتی ہیں، سوچنے پر مجبور کرتی ہیں، اشیا اور احوال کا تجزیہ کرنے لگتی ہیں اور جذبات اور احساسات کی لذت چھین لیتی ہیں۔

وہ عقل کا بڑی حقارت سے ذکر کیا کرتا تھا اور اس بات کے ثابت کرنے میں کہ عقل، آگاہی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے، جب وہ لاجواب ہو جاتا تو کپڑے جھاڑ کر کہتا تم انٹلکچوئل ہو، تمہیں نہیں پتہ کہ زندگی کسے کہتے ہیں۔ اللہ کو موہنے کا بھید اس نے پا لیا تھا مگر یہ اس نے کبھی نہیں سوچا کہ اللہ کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اللہ کبھی ناراض ہوتا ہی نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی اسکے نور کی پھوار سے دور کھڑا ہو تو کوئی نزدیک آ کر بھیگ جائے۔

ممتاز مفتی جذبوں کی زندگی گزارتا تھا اور جب اس کے دوست کہتے کہ اس عمر میں عشق کا روگ پال کر تم حماقت کر رہے ہو تو وہ کہتا۔ "ہاں بے شک یہ حماقت ہے مگر میں بے اختیار ہوں۔ میں ایسا ہی ہوں۔ میں یوں ہی کروں گا۔ لوگ مجھے دیوانہ کہیں، اینٹ پتھر ماریں۔ تم دیکھتے نہیں کہ تمہارا تو فقط دل دھڑکتا ہے۔ میں طفلوں سے اینٹ پتھر کھا کر پورے کا پورا دھڑک رہا ہوں۔ کیا اس سے بڑی لذت کوئی ہو سکتی ہے۔"

ممتاز مفتی بعض اوقات ایک مجذوب بن جاتا۔ اسکی وجہ اسکے جذبوں کی شدت تھی مگر اس نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ وہ خود کسی روحانی مرتبے پر فائز ہو جائے۔ وہ ایک حقیر، ادنیٰ اور عوامی زندگی گزارنا چاہتا تھا

اور اگرچہ وہ اپنے اردگرد طالبوں کا ہجوم دیکھ کر شیر ہو جایا کرتا تھا مگر اس نے غرور ذات کا گناہ کبھی نہیں کیا۔ اسے شہرت سے بہت نفرت تھی۔ وہ چشمے کے کنارے جہاں انسان گھوڑے، گدھے پانی پیتے ہیں۔ بنی ہوئی ایک کٹیا کا سادھو تھا۔ الکھ نرنجن۔ پھر جوں جوں ممتاز مفتی بوڑھا اور سیانا ہو تا گیا، جوان عورتیں اس پر عاشق ہوتی گئیں۔ اس میں اس کی آخری تین کتابوں کا دخل زیادہ تھا۔ ان میں غیر مادی تصورات، غیر منطقی مشاہدات اور غیر عقلی جذبوں کی ایک ایسی دنیا آباد ہے، جو حقیقی زندگی میں نظر نہیں آتی۔ مگر دل والوں کو آنکھ مارتی رہتی ہے۔ اب عورتوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ جذباتی اور تصوراتی زندگی گزارتی ہیں۔ ایسی دنیا میں رہتی ہیں جس کے درودیوار پر حسن فریفتگی اور رنگوں سروں کی بیلیں چڑھی ہوتی ہیں۔ وہ "ورلڈ آف میک بیلیف" میں رہتی ہیں۔ افسوس کہ اردو میں میری دسترس کوتاہ ہے۔ میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ وہ سوچتی ہیں کہ شب کو ہم جھروکے سے چوٹی لٹکائیں اور کوئی چوٹی پکڑ کر اوپر چڑھ آئے۔ جنسی لذت ان کا بنیادی جذبہ نہیں ہوتا، مگر چاہے جانے کے شوق میں، وہ یہ قیمت بھی ادا کر جاتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ جنسی عمل تو خوبصورت لمحوں کے انجام کا اعلان ہے، مگر وہ ایک لمحے کی چاہت لے کر سب کچھ دے سکتی ہیں۔

ممتاز مفتی عورتوں کو اپنے سفید پروں پر بٹھا کر اسی ورلڈ آف میک بیلیف کی سیر دکھاتا ہے۔ وہ بڑھاپے کی وجہ سے خطرناک نہیں لگتا۔ اس کے مطالبے حد سے نہیں نکلتے حالانکہ جذباتی طور پر وہ ایک منہ زور مگر سبک رفتار براق ہے۔ عورت جب اس پر سواری کرتی ہے تو اسے ساتوں رنگ اور ساتوں سر اپنے بے شمار امتزاجوں کی دھند میں چھپا لیتے ہیں۔ سورج بگل مار لیتا ہے، ستارے آنکھیں مارنے لگ جاتے ہیں اور چاند شرما کر بادلوں کی اوٹ میں چھپ جاتا ہے۔ یہ ممتاز مفتی کی دنیا ہے جس میں لولی، لنگڑی، بدصورت، کوتاہ قد، سیاہ رو عورتیں بھی اپسرائیں بن کر کنول کی پتیوں پر تتکار کرنے لگ جاتی ہیں، اور مجیرے کچھ اور سریلے ہو جاتے ہیں۔ ایسا خالص آدمی میں نے زندگی میں دوسرا نہیں دیکھا، شاید وہ آدم کی آخری اولاد ہو۔ بندر کے بیٹے تو دوسرے ہیں۔ لگتا ہے اللہ نے اس میں محبت کی روح پھونکی، پھر سانس روک لیا۔

جب اس کا وقت آن پہنچا تو اس نے دیر تک اپنے بچوں سے باتیں کیں۔ پھر اس کے جسم نے زہریلا مواد خارج کرنا شروع کر دیا۔ اور اس کے کپڑے آلودہ ہوگئے۔ جب اس کا جسم اندر سے پاک ہو گیا تو اسکی زندگی ختم ہوگئی۔ آخری لمحوں میں اسے اپنی چھوٹی بیٹی ڈاکٹر نقش سے بڑا گلہ ہوا۔ اس نے کہا تم مجھے مرنے کیوں نہیں دیتیں۔ پھر وہ رونے لگا۔ مجھے مرنے کیوں نہیں دیتیں، مجھے مرنے کیوں نہیں دیتیں۔ پھر اس نے اپنے بیٹے عکسی کو بلایا اور کہا، لو بھائی میں نے اپنی پوٹلی باندھ لی۔ تم بھی اپنی پلاننگ کر لو۔ میری موت پر رونا دھونا نہیں۔ میرے جنازے کے آگے بینڈ باجا بجوانا۔ میں نے بھرپور زندگی گزاری ہے۔ عکسی نے کہا یہ میں نہیں کر سکتا۔ آخری ہارٹ اٹیک کے بعد اس نے کہا۔

"Is‘s Finished۔ آئی ایم گوئنگ۔" اور اسکی گردن ڈھلک گئی۔

الوداع ممتاز مفتی! الوداع!

خدا تمہاری ناز برداریاں کرے۔ تمہیں اپنے ہاتھ کی ہتھیلی میں رکھے۔ تمہیں اپنی گود میں بٹھائے۔

حوریں تمہارے سامنے کتھک ناچیں اور تم انہیں اپنے پروں پر بٹھا کر دنیا کی سیر کراؤ، جس کے تم اتنے لوبھی تھے اور جس میں تمہاری جنت آباد ہے۔

الوداع ممتاز مفتی! میں نے تمہارے ساتھ اکیاون بھرپور سال گزارے۔ اس طویل عرصے میں تم نے ایک دن بھی مجھے فراموش نہیں کیا۔ ہم دونوں نے اور ڈاکٹر اشفاق حسین نے، جو ہمارا تیسرا Musketeer تھا، کیا کیا نہیں دیکھا۔ الوداع میرے پیارے دوست! میرے غمگسار! مڑ مڑ کے نہ دیکھ جانی! جا اور سکھ کی سیج پر سو جا۔ بھئی رات بہت تھے جاگے---

عطاالحق قاسمی اور امجد اسلام امجد
کی ادارت میں

معاصر

کا تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

چند لکھنے والے: احمد ندیم قاسمی، مشتاق احمد یوسفی، اشفاق احمد، انتظار حسین، ڈاکٹر سلیم اختر، حمید اختر، بانو قدسیہ، قتیل شفائی، مظفر وارثی، شہزاد احمد، محمد منشایاد، ڈاکٹر صفدر محمود، جمال پانی پتی، سحر انصاری---- اور نئی اور پرانی نسل کے متعدد ممتاز ادیبوں کی تر و تازہ نگارشات

پروین شاکر کے فن اور شخصیت پر خصوصی گوشہ اور نادر تصاویر۔ احمد ندیم قاسمی اور پروین شاکر کی تصویروں اور ان کے آٹوگراف پر مشتمل رنگین پوسٹر

ضخامت: ۹۰۰ صفحات (مجلد، سفید کاغذ، معیاری طباعت)

قیمت: ۳۰۰ روپے

ملک کے کسی بھی اچھے بک سٹال سے طلب کریں

ادارۂ "معاصر" ۴۵۔ اے مزنگ روڈ۔ لاہور
ٹیلی فون: ۷۸۳۲۰۳۷ / ۵۴۱۶۲۶۲ / ۶۳۶۲۱۱۶

ممتاز مفتی کے خطوط

محترم ممتاز مفتی مرحوم مجھ سے مدتوں خفا رہے۔ انہوں نے میرے بارے میں بعض ایسے مضامین بھی لکھے جن میں مجھ پر متعدد الزامات عائد کئے گئے تھے۔ یار لوگوں نے ان کی اس نوعیت کی تحریروں سے منفی فائدہ اٹھایا اور یہ تحریریں مفتی مرحوم کے انتقال کے بعد بھی شائع کر رہے ہیں، جبکہ ۱۹۸۸ء میں یکایک مجھے ان کا ایک خط ملا کہ معافی مانگی۔ مجھے معاف کر دو۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ میں نے فوراً انہیں محبت بھرا خط لکھا اور اس کے بعد ہمارے درمیان متعدد خطوط کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ میرے نام کے جو چند خطوط محفوظ رہ گئے وہ نذر قارئین ہیں------- (ندیم)

مکان نمبر۲۲ ۱.۹.۸۸
گلی نمبر۳۲
ایف ٦-۱
اسلام آباد

برادرم قاسمی صاحب! السلام علیکم

آپ کا خط موصول ہوا۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے میری درخواست قبول کی۔ اللہ آپکو خوش رکھے۔ میں آپ کی وسعت قلبی کا مداح ہوں۔ آپ کے لیے دعاگو ہوں۔

ممتاز مفتی

۱۱-۱۲-۹۰

قاسمی جی۔ خط ملا۔

ایک تکلیف کرو۔ کسی کو گوالمنڈی بھیجو۔ کسی ہومیوپیتھک سٹور سے (Ranunculus Bulbosus (IM طاقت ایک ہزار، کی ایک خوراک منگوا لو۔ صرف ایک خوراک کسی روز صبح نہار کھا لو۔ پھر ۲۰ منٹ تک کچھ نہیں کھانا پینا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن شاید فائدہ پہنچائے۔ چلو جوا ہی سہی۔ فائدہ ہو تو مجھے بتانا۔

ممتاز مفتی

۱۹-۷-۹۲

یار تم میری بات غلط سمجھے۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن ایسا ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں بیوی فوت ہو جائے تو میاں کے لیے جینا اجیرن ہو جاتا ہے۔ میاں فوت ہو جائے تو بیوی جی سکتی ہے۔

تم بات کو اخلاق کے حوالے سے دیکھ رہے ہو۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اکلاپا تمہاری تخلیقی صلاحیتوں کو سلب نہ کر لے۔

کچھ کرو۔ اکلاپے کی تخریب سے خود کو بچائے رکھو۔ زندگی کو اجیرن نہ بننے دو۔

ممتاز مفتی

۱۵/۱۰

قاسمی جی۔ یہ میری دعاؤں کا ہی اثر ہے کہ تخت پر بیٹھے ہو۔ سر پر تاج ہے۔ اللہ جسے چاہے عزت دے اور جسے وہ عزت دے اسکے روبرو سر تسلیم خم!

ممتاز مفتی

۲۵/۱۲

ندیم۔ کل اتفاق سے تمہاری بات چل نکلی۔ میں نے عرض کی۔ عالی جاہ بے شک آپ نے تخت عطا کیا لیکن وہ کہتا ہے یہ تخت تو مٹی کا ہے۔

انہوں نے فرمایا۔ کون سی نعمت ہے جو ہم نے اسے نہیں دی۔ شہرت دی' نیک نامی دی' قابلیت دی۔ کام کی توفیق عطا کی۔ اسے کہو کہ ہفتے میں ایک بار صرف ۳ منٹ کے لیے علیحدگی میں' تنہائی میں' خاموشی میں' ہمیں سامنے بٹھا کر ہمارا شکریہ تو ادا کیا کرے۔

میں نے عرض کی۔ میں چھوٹا ہوں۔ یہ بات کیسے کہہ سکوں گا۔

فرمایا۔ کہہ نہیں سکتے تو لکھ دو۔

ممتاز مفتی

۲۳-۲-۹۳

پیارے قاسمی! السلام علیکم

میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ مجھے آپ جیسوں کی محبت حاصل ہے۔

ممتاز مفتی

۱۴-۷-۹۳

پیارے ندیم۔ السلام علیکم
فنون دیکھا۔ حرف اول میں ذاتی وضاحت پڑھ کر خوشی ہوئی۔ بہت خوشی ہوئی۔

اپنے پرستاروں، دوستوں، بہی خواہوں کو تاکید کر دو کہ وہ اس اعلان کی حرمت کو مدنظر رکھیں، اگر لوگ نکتہ چینی کریں یا خلاف لکھیں تو Ignore it، تمہارا مقام ایسا ہے کہ ایسی باتوں پر Divine Disdain کا اظہار کرو۔

ممتاز مفتی

۱۲-۷-۹۴

پیارے ندیم۔ میں چار ماہ سے بیمار ہوں۔ ۳ مہینے ہسپتال میں رہا۔ ۳ اپریشن ہوئے۔
میں تیری دعا کا محتاج ہوں
درازی عمر کی دعا نہ کرنا۔
دعا کر کہ ورکنگ صحت نصیب رہے۔

ممتاز مفتی

۲۰-۶-۹۵

کپتان جی۔ میں اپنی اننگ کھیل چکا۔ میں نے بورڈ کو اپنی ریٹائرمنٹ کی درخواست دے دی ہے۔ تم سفارش کر دو۔ پھر بات بن جائے گی۔ احمد بشیر آیا تھا۔ اس نے تمہاری ہمشیرہ کی وفات کی خبر سنائی۔ تمہیں دکھ ہوا ہوگا مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ اللہ تمہیں صبر عطا کرے۔

تمہارے بالکے نے مجھے اپنی کتاب شہر در شہر بھیجی تھی۔ سبحان اللہ کیا تماشہ لگایا ہے۔ سبحان اللہ کیا تماش بین ہے۔ بے شک اللہ نے تماشہ تو غضب کا لگایا ہے، مگر دیکھنے کی صلاحیت کم کم دی ہے۔ تمہارا بالکا بڑا تماش بین ہے۔ اسے کہو مجھے کتاب بھیجی مجھ پر احسان کیا۔

مقتدرہ نے سیمینار رچایا
ملاقات کی صورت تھی، میں نہ آ سکا۔
انجمن ترقی اردو نے اب کراچی میں اکٹھ کی تجویز بھیجی ہے، جولائی میں۔ میں نہیں جا سکوں گا۔
اب جانے آنے کی توفیق نہیں رہی۔
لکھنے پڑھنے کی بھی نہیں۔
تم میرے خاتمہ بخیر کی دعا کرو۔

ممتاز مفتی

احمد داؤد — "لا" کا ادراک

خاور نقوی

احمد داؤد اس وقت افسانے کے افق پر طلوع ہوئے جب چھٹی دہائی کا آفتاب لبِ بام پہنچنے کو تھا۔ ان کا پہلا افسانہ "کالا فرشتہ" ۱۹۶۸ء میں روزنامہ "تعمیر" راولپنڈی کے ادبی صفحے میں شائع ہوا۔ بیشتر ادیب فن کی ابتدائی منزل میں کسی سینئر ادیب سے متاثر رہے ہیں۔ احمد داؤد بھی جہانِ فن میں اس سے مستثنیٰ نہیں۔ فن کے ابتدائی مراحل میں وہ بعض سینئر افسانہ نگاروں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ بالخصوص اسلوبیاتی سطح پر اس تقلیدی روش نے بعض مقامات پر مضحک صورت بھی اختیار کر لی ہے لیکن یہ نکتہ خصوصیت کے ساتھ ذہن میں رہے کہ یہ مماثلت احمد داؤد کے ابتدائی دور کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ بعد میں اس دائرۂ اثر سے نکل کر اپنے لیے فن کی الگ راہیں تراشتے دکھائی دیتے ہیں۔

حق کے بارے میں ایک مشہور مقولہ ہے "الحق مُرٌّ" یعنی حق کڑوا ہے۔ احمد داؤد کے ہاں حق اپنی تمام تر کڑواہٹ، حقیقت اور سچائی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ وہ حقیقت اور سچائی کو ملفوف کر کے اس کی اس کی کڑواہٹ میں مٹھاس گھولنے کے قائل نہیں۔ یہ سفاک حقیقت نگاری ان کی تخلیقی مہارت کی کوکھ سے پھوٹتی دکھائی دیتی ہے۔ پروفیسر احتشام حسین افسانے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "جب ہم روٹی، گوشت اور شراب کا ذکر محض روٹی، گوشت اور شراب کی شکل میں کرنا چاہتے ہیں اس وقت وہ کسی بڑے یا اعلا پائے کے ادب کا موضوع نہیں لیکن جب ہم روٹی، گوشت اور شراب کا ذکر ایک ایسے سلسلے میں کریں جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آخری دعوت کے منظر میں پیش ہوا تھا کہ انہوں نے روٹی کے ٹکڑے توڑ توڑ کر اور ذرا ذرا سی شراب اپنے شاگردوں کو دی اور کہا کہ یہ میرا گوشت ہے اور یہ میرا خون، تو روٹی اور گوشت ایک بہت ہی اعلا پائے کے المیہ موضوع بن جاتے ہیں۔"

پروفیسر احتشام حسین اردو افسانہ – ایک گفتگو
مطبوعہ ارتقاء، پروفیسر سید احتشام حسین نمبر ۱۹۹۲ء، ص ۲۰۴

پروفیسر احتشام حسین کی اس گفتگو کے تناظر میں دیکھا جائے تو احمد داؤد کے افسانوں "وہسکی اور پرندے کا گوشت" اور "کمپوزیشن ۹۷ء" کی لفظیات وہسکی، گوشت، نوخیز لڑکیاں اور گالیاں اکہری سطح نہیں رکھتی۔ اس میں ہماری قومی زندگی کی کئی المناک سطحیں ملتی ہیں۔

احمد داؤد کے پہلے افسانوی مجموعے دشمن دار آدمی کے افسانوں میں سیاسی جبر و استبداد، آمریت و استعماریت کے خلاف شدید احتجاج، حق گوئی کی سزا، تہذیبی جمود، تیسری دنیا کے مسائل، مزدور اور جفاکش کا استحصال اور کچلے ہوئے انسان کے

دُکھ جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ فن کی اس منزل پر اُن کے ہاں برہنہ حقیقت نگاری، سماجی سونوگرافی اور جبر و جمود کے اپریشن کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

احمد داؤد کے کرداروں کا مطالعہ کرنے سے یہ نکتہ ابھر کر سامنے آتا ہے کہ ان کے کردار آسمانی سیدھ نہیں، زمینی کھگل ہیں۔ کھگل ایک ایسا سخت جان درخت ہے جو تھل کی بے نم اور کلّیلی سرزمین میں بھی اپنے لئے خوراک حاصل کر لیتا ہے۔ اُسے کار آمد بننے کے لئے کالی ٹاہلی کی طرح بیس پچیس سال انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ اُس کی آبیاری اور حفاظت کا بھی کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جاتا۔ اُس کی ایک قلم زمین میں گاڑ کر اس کے سر پر ہلکا سا گوبر لگا دو، معمولی سا تھالا بنا کر کچھ دن پانی دو، جڑ پکڑ جائے گا۔ بعض اوقات تو بے طلب، بھوڑ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ جوان ہو جائے تو اس سے مکانوں کی چھتوں کا میٹیریل، فرنیچر، جو جی چاہے بنا لو۔ اس کا بُور اونٹوں کی غذا ہے۔ جسم پر چوٹ آئے تو ٹونے ٹوٹکے میں اُسے گرم کر کے باندھ دو۔ اتنے ڈھیر سارے فائدوں کے باوجود اُسے اکثر و بیشتر ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ احمد داؤد کے ہاں ایسے ہی متنوع الصفات کردار ملتے ہیں جن میں حساسیت و ہمدردی وصفِ مشترک ہے۔ لیکن یہ حساس اور ہمدرد کردار حالات و واقعات کے الاؤ میں جلتے دکھائی دیتے ہیں۔

احمد داؤد کے ہاں افسانہ "خوشبو کا زہر" میں ایک طرف وقت کی چکی میں پستا ہوا کردار "مَیں" ہے جس کی جیب میں صرف تیرہ آنے ہیں۔ اُسے ان پیسوں سے بیوی اور بیٹے کا علاج کرانا ہے اور باپ کی روح کو راضی کرنے کے لئے اُس کی قبر پر اگربتیاں بھی سلگانی ہیں۔ دوسری طرف افسانہ "کمپوزیشن ۹، ۷" میں اسی واحد متکلم کی صورت میں ایک ایسا کردار ملتا ہے جو ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف شدید احتجاج، غصے اور بغاوت کے جذبات رکھتا ہے۔ "گل گاھش" میں ہم ایک ایسے کردار سے دوچار ہوتے ہیں جس کے ہمدردانہ اور مخلصانہ جذبے محدود دائرے سے نکل کر پورے معاشرے کا احاطہ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ کردار اپنی انقلابی فکر سے جا اور فرسودہ سوچ کی چٹانیں توڑتا ہے اور لوگوں کے دل و دماغ کی کھیتی کو سرسبز و شاداب کرنا چاہتا ہے لیکن اس پر بغاوت کے فتوے لگائے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ افسانہ اہلِ منبر کی تنگ نظری پر شدید طنز کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ افسانہ داستان "شب رواں کی اس اعتبار سے معنی خیز ہے کہ اس میں احمد داؤد ایک بصیرت افروز نتیجے کی طرف بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ جبر کے ساتھ آزادیٔ رائے پر پابندی لگائی جا سکتی ہے لیکن اسے ختم نہیں کیا جا سکتا، فکر کو دبایا جا سکتا ہے لیکن مٹایا نہیں جا سکتا؛ جسم کو پابندِ سلاسل کیا جا سکتا ہے لیکن سوچ کو قید نہیں کیا جا سکتا۔

احمد داؤد کے دوسرے افسانوی مجموعے "مفتوح ہوائیں" کے افسانوں میں اُن کا فنی و فکری ارتقاء بہت نمایاں ہے۔ اس منزل پر اُن کے ہاں جبر و استبداد، حق تلفی، آزادیٔ رائے پر پابندی جیسے قومی المیے بھرپور معنویت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ افسانہ "وہسکی اور پرندے کا گوشت" کا ایک مختصر اقتباس دیکھیے:

> "عصمت فروش عورت کی انا جو بگڑ جائے تو عصمت دری کے الزام میں پکڑوا سکتی ہے۔ ہماری قومی سلامتی بھی اسی قسم کی چیز ہے۔"

اس افسانوی مجموعے کے مطالعے سے یہ نکتہ واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ احمد داؤد نے افسانے کی ہیئت کو قائم رکھتے ہوئے اُس کے بطون میں تبدیلیاں کی ہیں۔ اُن کے ابتدائی افسانوں میں اسلوبیاتی عنصر زیادہ نمایاں ہے جبکہ اس مجموعے میں سنجیدہ اور متوازن تخلیقی ر کی بدولت فنی پیچ داری کے ساتھ ساتھ فکری تہہ داری کا پہلو بہت توانا دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے ان افسانوں میں معاشرتی انتشار، سیاسی ابتری، استحصال، فرد کی بے بسی، باطنی کشمکش اور کردار کی ٹوٹ پھوٹ جیسے عصری حقائق کو گہری سوچ اور فنی مہارت کے ر

ہے۔ فن کی اس منزل پر ان کے ہاں بلیغ علامتیں اور معنی خیز جملے ملتے ہیں جو انہیں معاصر افسانہ نگاروں میں ممتاز کرتے ہیں۔

احمد داؤد کے افسانوں کا شعری لحن خصوصی توجہ کا متقاضی ہے۔ ان کے ہاں تشبیہہ، استعارہ، علامت اور تمثیل جیسے عناصر اص لفظیات سے آمیخت ہو کر نثر میں شعری آہنگ پیدا کرتے ہیں۔ ان کی نثر کی یہ شعریت ان کے اسلوب کے مخصوص منطقوں سے ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں؛

> "اسے یوں لگا جیسے وہ کسی تاریک پہاڑ کے گلیشیر پر قید ہے جہاں نہ تو دھوپ برف پگھلاتی ہے اور نہ روشنی کا خنجر تاریکی کا سینہ چیرتا ہے۔"
>
> (اپنے گھر کی کہانی)

> "اگر چاہو تو اپنے سر نیزوں پر پرو کر اپنے بعد میں آنے والوں کی خاطر آبِ فرات حاصل کر سکتے ہو"
>
> (داستان شبِ رواں کی)

> "دور شہر کی آوازیں رک رک کر، گھٹ گھٹ کر، ہوا کے طشت پہ تیرتی ہم تک پہنچ رہی تھیں۔"
>
> (جھیل جنگل قدیم بوڑھا)

احمد داؤد کے ہاں طشت کا لفظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ ان کے ہاں طشت ایک ایسی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے سطح پر نظامِ کائنات اور گردشِ ماہ و سال میں ان کی گہری سوچ کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری سطح پر معاشرے کی بے حسی، بے سمتی اور نظ سے پیدا ہونے والی خوفناک صورتِ حال میں ایک اعلامیہ بن کر ابھرتی ہے۔

احمد داؤد عام طور پر جس قدر عجلت پسند تھے، تخلیقی عمل میں اسی قدر سنجیدگی، ٹھہراؤ اور گہری سوچ سے کام لیتے تھے۔ تخلیق رے میں ان کی رائے جچی تلی اور دو ٹوک ہوتی تھی۔ "لا" کی رمز کو اچھی طرح سمجھ کر "الا" کی طرف قدم بڑھاتے تھے۔ ان کے باطن پا ذہین فنکار انہیں بتاتا کہ کیا لکھنا ہے اور کیا نہیں لکھنا۔ بلکہ اس کی زیادہ توجہ "کیا نہیں لکھنا" پر مرکوز رہتی تھی۔ اور اس صنے" کے ادراک نے اس سے ایسے افسانے لکھوائے کہ سب کے سب اپنے آپ کو پڑھواتے اور قاری کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔

خوبصورت شاعر احمد شمیم
کے خوبصورت خطوط
اپنی بیگم منیرہ احمد شمیم کے نام
ہوا نامہ بر ہے
محبت اور رومان سے لبریز یہ خطوط
اردو کے نثری ادب میں ایک بے بہا اضافہ ثابت ہوں گے۔
اشر: عکسی پبلشرز۔ مکان نمبر ۲۵۰ گلی نمبر ۲۱، سیکٹر 1-9 اسلام آباد

حسن عباس رضا

احمد داؤد کیلئے

ابھی کچھ روز پہلے
اُن کی آنکھیں جاگتی تھیں

اور
اُن آنکھوں میں
روشن موسموں، اُجلے دنوں کے
خواب تھے
خوابوں میں
تعبیروں کے ست رنگے مناظر
جھلملاتے چاند تاروں کے جلو میں
اُن کے سینے
اور کشادہ بازوؤں میں رقص کرتے تھے
ابھی کچھ روز پہلے

ابھی کچھ روز پہلے
زندگی اُس کے لئے معشوق تھی
معشوق بھی ایسی
کہ جس کی ہر ادا پر
اپنا تن، من، دھن لُٹانے کے لئے
وہ صبح کی پہلی کرن کا ہاتھ تھامے
رات کے پچھلے پہر تک
خواب بُنتا تھا
وہ شہرِ کم نظر کا
قریہ قریہ چھانتا
سڑکوں پہ یوں آوارگی کرتا
کہ جیسے اُس کی کوئی
قیمتی شے کھو گئی ہو ——
خاک میں گُم ہو گئی ہو
ابھی کچھ روز پہلے .....
..... اور اب یوں ہے
کہ شہرِ کم نگاہاں کی
سبھی سڑکیں
ترس کر رہ گئی ہیں
اُس سبک رفتار
اُس پارہ صفت کو
زندگی جس کے لئے معشوق تھی
جو زندگی سے پیار کرتا تھا
کہ جس کے پاؤں کی آہٹ سے
گھر کا سُونا آنگن جاگ اُٹھتا تھا
وہ گھر، جو گھر نہیں ماتم سرا ہے

..... اور اب یوں ہے
کہ وہ ہم میں نہیں ہے
اُس کا چہرہ
اور اُس کے مسکراتے خال و خد دھندلا رہے ہیں
رفتہ رفتہ
اپنے پیاروں اور یاروں کی نظر سے
دُور ہوتے جا رہے ہیں
وہ، جو کل ہم سب میں شامل تھا
نہ جانے کس گلی، کس موڑ پر گُم ہو گیا ہے
پیار کی تسبیح کا ایک اور دانہ کم ہوا
ایک اور موتی کھو گیا ہے

نثار ترابی

احمد داؤد کے نام

ستارا تھا
فصیلِ شب کی کالی پیٹھ پر جلتا تھا
جلتا تھا
عوام النّاس کے ہمراہ روشن چال چلتا
یعنی چلتا تھا
مگر تاریک موسم دیکھ کر
سمت سفر اپنی بدلتا تھا
ہر اِک نقشِ کفِ پا اُس کا انگارے اُگلتا تھا
وہ اِک "مفتوح[1] موسم کی ہواؤں" میں نکلتا تھا
اِسی خاطر وہ "دشمن[2] دار" تھا —— دارالحکومت
کے عزیمت کوش منظر میں
مگر دلدار تھا میرا —— وہ رشتہ دار تھا میرا
خمیرِ ہست میرا اور اُس کا
ایک ہی بستی[3] سے اُٹھا تھا
مَیں اپنے قریۂ اجداد، کیمبل پُور کو سوچوں
تو یہ سوچوں
ردائے ریگ پر مَیں نے کبھی تارا نہیں دیکھا
تو پھر وہ کون تھا؟؟ داؤد جس کو لوگ کہتے تھے
وہ جس نے ٹوٹتی بنتی کہانی کو سنوارا تھا
دسمبر کی کسی سفّاک شب نے جس کو مارا تھا
دریچہ ذہن کا کھل جائے
یکدم یہ صدا آئے
ستارا تھا
فصیلِ شب کی کالی پیٹھ پر چلتا تھا
جلتا تھا
وہ جب کردار کی دُنیا، سرِ زنجیر لایا تو
اُفق کی سُرخ پلکوں پر —— "رہائی[4]" کا اشارا تھا
مری آنکھوں کے دریا کا —— وہ اِک تشنہ کنارا تھا
ستارا تھا
مرے اہلِ قلم یارو! —— وہ میرا ہی نہیں
وہ تو ہمارا تھا
وہ سُندر موسموں کا استعارا تھا!

---

[1] - [2] : "مفتوح ہوائیں" "دشمن دار آدمی" افسانوی مجموعوں کے نام
[3] "بستی" ناولٹ کا نام بھی ہے اور اس سے نظم نگار کا مرحوم افسانہ نگار سے ہم ضلع ہونا بھی مراد ہے۔
[4] "رہائی" جو بستی کے نام سے بھی چھپا۔ [5] "وہ اختر شاد سندر موسموں کا استعارا"

احسن احمد اشک سے ایک گفتگو

کنیز بتول
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو و فارسی
ڈھاکہ یونیورسٹی (بنگل

نام : احسن احمد
تخلص : اشک
والد کا نام : عبدالمقتدر مرحوم (اورینٹلسٹ)
سنِ پیدائش : یکم جنوری ۱۹۱۸ء
جائے پیدائش : کلکتہ
آبائی وطن : بانس کھالی۔ چاٹگام (بنگلہ دیش)
تاریخ وفات : ۱۷ دسمبر ۱۹۹۲ء
تخلیقات : "برق و باراں" ۱۹۵۵ء ، "جاگتے جزیرے" ۱۹۶۲ء (شعری مجموعے)
ترجمہ : "آہنگِ انقلاب" (مشرقی پاکستان کے انقلابی شعراء کے منتخب کلام کا مجموعہ)

جن بنگالی نژاد اردو شعراء کی طبع آزمائی میں بنگلہ دیش کا مقامی رنگ جھلکتا ہے اور جنہوں نے اس ملک کے فطری مناظر کی ہے اور یہاں کے مفلوک الحال کسانوں اور مزدوروں کے دُکھ درد کا راگ الاپا ہے ان میں احسن احمد اشک کا نام سرِفہرست نظر آتا ہے۔ اشک کی پرورش اردو و فارسی کے آغوش میں ہوئی۔ ان کے والد فارسی کے معلم تھے۔ اشک ، وحشت کلکتوی، جمیل مظہری، لکھنوی ، ناطق لکھنوی، ڈاکٹر عندلیب شادانی جیسے نامور ادبا و شعراء کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ ان صحبتوں نے اشک کی خداد کو جلا بخشی اور وہ بنگلا گو ہونے باوجود اُردو کے ذی حیثیت شاعر بن گئے۔ ان کا کلام مختصر ہے مگر معیاری ہے۔ وہ اپنے مجموعۂ کلام "برق کے "سخن ہائے گفتنی" میں رقمطراز ہیں :

> " دہقان اور مزدور میری شاعری میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں بنگالی ہوں اور بنگال گزشتہ نصف صدی سے طبقاتی کشمکش سے پیدا ہونے والی تحریکوں کا گہوارہ رہا ہے۔ بچپن سے لے کر اب تک میری زندگی یا تو کلکتہ کے ہنگامہ خیز کارخانوں کے اردگرد یا بنگالہ کی رومان انگیز دیہاتی فضاؤں میں گزری۔ چنانچہ بنگلے کی رومانیت اور "مشربِ بغاوت" دونوں ہی میری شاعری پر کافی اثر انداز ہیں۔"

شاعری اور انسانی زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس حقیقت کو اشک نے نبھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری ستھری ہے ہیں کہیں استعارے اور کنایوں میں بھی باتیں کی ہیں۔ سابق پاکستان میں اس وقت کا سیاسی خلفشار اور اس کے دو بازوؤں (مغربی و مشرقی) ں نا اتفاقیوں اور رنجشوں کا جو بحران تھا اشک کی شاعری میں اس کی عکاسی ملتی ہے۔ فطرتاً ان کے دل میں یہ خوف و ہراس پیدا ہوا ہوگا کہ اس سیاسی ناکشی میں کہیں پاکستان کا وجود خطرے میں نہ پڑجائے اور وہ ٹکڑوں میں نہ بٹ جائے۔ چنانچہ وہ اپنی نظم "جزیرہ" میں فرماتے ہیں۔

ناامیدی کے تھپیڑے پے بہ پے کھائے ہوئے
دونوں ننگے، دونوں بھوکے، دونوں گھبرائے ہوئے
اتفاقاً ایک چھوٹا سا جزیرہ مل گیا
سانس لینے کو ہمیں تھوڑا سا وقفہ مل گیا
یاس اور امید کے کل بندھنوں کو توڑ کر
آؤ سو جائیں پرندوں کی طرح سر جوڑ کر

۱۹۷۱ء میں بالآخر ان کی یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔

احسن احمد اشک سے میری پہلی ملاقات ۱۰ نومبر ۱۹۹۲ء کو ان کی رہائش گاہ بی / ۱۲ ایسٹرن ہاؤسنگ اپارٹمنٹ ندھشری ڈھاکہ میں ہوئی۔ دوسری یعنی آخری ملاقات ۲۲ نومبر ۱۹۹۲ء کو دوشنبہ کے دن صبح ۱۱ بجے ابراہیم میموریل ذیابیطس سپتال ڈھاکہ میں ہوئی جب وہ بستر مرگ پر تھے۔ آخری ملاقات کے صرف ۲۵ روز بعد ۱۷ دسمبر ۱۹۹۲ء کو وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ نَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

۱۰ نومبر ۱۹۹۲ء صبح کو فون پر اشک صاحب سے اجازت لے کر میں شام کے چار بجے ان کے گھر گئی۔ اطلاعی گھنٹی بجاتے ہی نوکر نے دروازہ کھولا۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھی انتظار کرنے لگی، اتنے میں اشک صاحب سُوٹ پہنے کمرے میں داخل ہوئے، قلب کے مرض نے اُن کو کمزور کر دیا تھا تاہم ہشاش بشاش اور چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔ ان کا پُرخلوص خلاق اور مہذب اندازِ گفتگو ان کے خاندانی وقار و عظمت اور علمیت کی گواہی دے رہا تھا۔ مزاج پُرسی کے بعد اُنہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کا حال دریافت کیا۔ یہ سُن کر انہیں بڑی مسرت ہوئی کہ نامساعد حالات کے باوجود اب بھی اس شعبے میں اردو اور فارسی کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔ طلباء اردو و فارسی میں بی۔ اے آنرز اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔

۲۲ نومبر ۱۹۹۲ء کو صبح گیارہ بجے میں اُن کی احوال پُرسی کے لیے ہسپتال گئی۔ نرس نے مجھے بتایا کہ آج اشک صاحب سے ملاقات نہیں ہوسکتی کیونکہ انہیں آکسیجن دیا جا رہا ہے۔ یہ خبر سُن کر مجھے بڑا قلق ہوا۔ میں مایوس ہو کر واپس آ رہی تھی کہ اتنے میں ان کی صاحبزادی مس شہناز نے مجھے آواز دی۔ "اندر تشریف لائیے ابا آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں"۔ میں ان کے بستر کے قریب گئی۔ حالات کی نزاکت دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوا کیونکہ ان کی سانسیں پھول رہی تھیں، دم بدم کھانسی آ رہی تھی، نہایت تکلیف سے انہوں نے مجھ سے باتیں شروع کیں۔ اپنی صحت یابی سے مایوس ہو کر کہنے لگے۔ "آپ نے مجھ سے ملاقات کرنے میں دیر کر دی، اب تو اشک نے عزمِ سفر باندھ لیا ہے"۔ انہوں نے مزید کہا۔ پروفیسر نظیر صدیقی نے میری نظم (غالباً "میگھ ملہار") پر تبصرہ لکھا تھا جو "فنون" (لاہور) میں چھپ چکا ہے۔ آپ کو مل جائے تو میری شاعری سے متعلق تمام باتیں بخوبی جان لیں گی۔ اس وقت چند ضروری باتیں آپ سے کہنا چاہتا ہوں، نوٹ کر لیجئے"۔

اس کے بعد اشک صاحب نے رُک رُک کر دھیمی آواز میں میرے تمام سوالوں کا جواب دیا۔ باتوں باتوں میں وہ اپنے پسند اشعار سے دو ایک مصرعے بھی سناتے گئے ؎

میں کوئی سیٹھ نہ قومی لیڈر
نوکروں کا بھی اک ادنیٰ نوکر
اُس پہ بنگال کا اُردو شاعر (اشک)

بتول : آپ کی مادری زبان کیا ہے ؟

اشک : میری مادری زبان بنگلا ہے۔ لیکن میری پرورش اُردو ماحول میں ہوئی۔

بتول : آپ نے تعلیم کہاں سے حاصل کی ؟

اشک : موجودہ صدی کے اوائل میں بنگال میں بنگلا زبان کا چرچا بہت کم تھا۔ مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں دو شعبے تھے۔ ایک عربی کا دوس اینگلو پرشین کا۔ اینگلو پرشین میں ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا لیکن اس شعبے میں ورنکولر اُردو تھا۔ میٹرک میں نے اسی مدرسے پاس کیا۔ بنگلا کے مشہور ناول نگار شوکت عثمان صاحب میرے ہم جماعت تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں بی اے آنر کرنے کے بعد میں نے ۱۹۴۰ء میں فارسی میں ایم اے کیا اور اوّل آیا۔ اس کامیابی پر کلکتہ یونیورسٹی نے مجھے سونے کے تمغے سے ۱۹۴۱ء میں اسی یونیورسٹی سے موڈرن انڈین لینگویجیز (پالی، ہندی، اردو، بنگلا) کے شعبے سے اردو میں ایم اے کا امتح دیا اور یہاں بھی اوّل آیا۔ شوکت عثمان صاحب نے اسی شعبے سے بنگلا میں ایم اے کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا۔

بتول : آپ نے ملازمت کب سے شروع کی اور کس شعبے سے منسلک رہے ؟

اشک : ۱۹۴۴ء میں اردو لیکچرر کی حیثیت سے پریسی ڈنسی کالج میں میرا تقرر ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد مشرقی پاکستان آ گیا اور ڈھاکہ کالج (ڈھاکہ) راجشاہی کالج (راجشاہی) ایم سی کالج (سلہٹ) میں اُردو اور فارسی کا معلم رہا۔ ۱۵ میں میری ملازمت محکمہ تعلقاتِ عامہ میں منتقل ہو گئی۔ مشرقی پاکستان کے چیف سیکرٹری نیاز احمد خاں کی فرمائش پر ا ان ہی کی سرپرستی سے اس دفتر میں پہلے معاون ڈائرکٹر پھر ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے پر ۱۹۶۴ء تک بحال رہا۔ ۶۴ سے ۱۹۸۴ء تک صحافت کا کام انجام دیا۔ ‌دو دن تک پاکستان (روزنامہ پاکستان بنگلا) اور "اتفاق" (بنگلا اخ میں ادارت کا فریضہ انجام دیتا رہا۔ کچھ دنوں تک "نیوز نیشن" انگریزی اخبار کا مینجنگ ایڈیٹر بھی رہا۔ ۱۹۷۲ء اب تک اس ہسپتال میں آنریری خازن کے عہدے پر فائز ہوں۔

بتول : بنگلا دیش کا ادبی حلقہ آپ کو "بنگالی اردو شاعر" کیوں کہتا ہے ؟

اشک : میں "بنگالی اردو شاعر" کی حیثیت سے یکتا اور تنہا ہوں۔ مجھے اردو کا "قومی بنگالی شاعر" کہا جا سکتا ہے۔ یہاں اُرد جتنے شعراء آئے، بسے اور چلے گئے ان کی شاعری میں بنگال کی ثقافت، بنگال کے مقامی رنگ اور آب و ہوا کی ترجمانی ملتی۔ ایک منیر لاہوری (فارسی شاعر) بنگال سے متاثر تھے۔ دو ایک چیزیں میری شاعری میں ایسی نمایاں ہیں جو بنگال کے ک شاعر کے یہاں نہیں۔ میری شاعری کا مجموعہ "جاگتے جزیرے" اپنے عنوان سے بنگال کی سیاسی اہمیت اور جغرافیائی حد کرتا ہے۔ "جاگتے جزیرے" میں بنگال کی سیاسی اہمیت قدرتی مناظر اور غریب کسانوں کے حوصلوں، امیدوں اور ب کی بہت حد تک ترجمانی کی گئی ہے۔ میری ایک نظم کا عنوان بھی "جاگتے جزیرے" ہے، اس نظم کے چند مصرعے ملاحظہ ف

صف بہ صف ہرے پودے
لہلہاتے دھانوں کے
سر اُٹھائے پانی میں
حوصلے کسانوں کے

آسرے تلاطم میں
ڈولتے مچانوں کے

"جاگتے جزیرے" کی پہلی نظم "آئینہ" ایک سیاسی نظم ہے۔ میں نے جس مستقبل کا ذکر اس نظم میں کیا ہے۔ سن ۱۹۷۱ء ں "بنگلہ دیش" کی صورت میں رونما ہوا۔ "ساپنلا" (بنگلہ دیش کا قومی پھول) کو قومی پھول میں نے اس وقت قرار دیا جب کسی کے ذہن ں یہ بات آئی نہ تھی۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۵ء کے درمیان "فنون" (لاہور) کے کسی شمارے میں میری نظم میگھ ملہار شائع ہو چکی ہے، ں نظم میں "ساپنلا" کو قومی پھول کہہ چکا ہوں۔

ول : آپ نے کب سے شعر کہنا شروع کیا اور آپ کی شاعری کا بہترین دور کون سا ہے ؟

ک : میں نے زمانۂ طالب علمی ہی سے شعر کہنا شروع کیا۔ میری شاعری کا پہلا دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۵ء تک ہے، دوسرا دور ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۵ء تک ہے۔ یہ میری شاعری کا بہترین دور ہے۔ "جاگتے جزیرے" (شعری مجموعہ) اسی دور کی یادگار ہے۔ اس دور میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان پاکستان میں برسرِ اقتدار تھے۔ اسی دور میں میری بہترین سیاسی نظمیں "آزادی کے بعد" اور "فیوجیٹو" فنون (لاہور) میں شائع ہوئیں۔ "فیوجیٹو" کو سمجھنا ایک کٹھن کام ہے۔ اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جسے مجھ سے براہِ راست تعلق رہا ہو۔

ل : آپ کن غیر ملکی ادباء و شعراء سے متاثر ہیں ؟

ک : میں نے فرانسیسی شعراء کا کلام پڑھا ہے اور ان سے بے انتہا متاثر ہوا ہوں۔ ایرانی شاعروں میں جلال الدین رومیؔ اور حافظؔ شیرازی کا کلام مجھے خاص طور پر پسند ہے۔

ل : آپ کی شاعری پر کسی نے تنقید کی ؟

ک : دراصل شاعر کی حیثیت سے مجھے آج تک کسی نے بھی نہیں پہچانا۔ ڈاکٹر عندلیبؔ شادانی نے ایک جگہ میرے متعلق کہا کہ "اشکؔ کی شاعری میں غنائیت اور موسیقی ہے"۔ شادانی بھی اشکؔ کا مطالعہ نہ کر سکے۔

ل : کیا آپ کو کسی بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر یا ادیب سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے ؟

ک : ہاں مجھے ٹیگورؔ اور قاضی نذر الاسلام سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ قاضی نذر الاسلام اپنے کلام کے اُردو تراجم سے مطمئن نہ تھے۔ ان کی خواہش پر میں نے ان کے کلام کے کچھ قدر اُردو ترجمے کئے جو انہیں پسند آئے۔ ٹیگور نے دورانِ گفتگو مجھ سے پوچھا کہ اُردو والوں میں ان کی شاعری کس حد تک مقبول ہے ؟ میں نے بتایا کہ اُردو میں ان کی بہت کم چیزوں کے ترجمے ہوئے ہیں مگر اُردو والے اُن کے پیاسے ضرور ہیں۔

ل : سُنا ہے کہ آپ نے "برق و باراں" (شعری مجموعہ) کے بیشتر حصے کو اپنی شاعری سے خارج کر دیا ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے ؟

ک : ہاں! "برق و باراں" میں "دہقان" "ہلال عید" "جوگن" اور "نذرِ عقیدت" کے عنوان پر جو نظمیں ہیں انہیں بحال

رکھ کر باقی تمام نظموں اور غزلوں کو خارج کر دیا ہے؟ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے بھی اپنی شاعری کا کچھ حصہ خارج دیا تھا۔ آپ نے غالب کے بارے میں یہ سوال کیوں نہیں کیا؟ اشک سے کیوں کر رہی ہیں۔ یہ میری مرضی ہے۔

بتول : کیا آپ کی طبیعت نثر نگاری کی طرف بھی مائل ہوئی؟

اشک : میری طبیعت نثر نگاری کی طرف کبھی خاص طور پر مائل نہیں ہوئی۔ ویسے تو میں نے چند مقالے لکھے ہیں جو مختلف رسالوں شائع ہوئے۔ افسوس اس وقت مجھے ان رسالوں کے نام یاد نہیں صرف تین کے نام یاد آ رہے ہیں۔ "خادم" (کلکتہ "عصرِ جدید" (کلکتہ)، "کلیم" (دہلی)

بتول : آپ کی زیرِ نگرانی کوئی اُردو رسالہ شائع ہوا ہے؟

اشک : میری زیرِ نگرانی ڈھاکہ سے "قلم کار" (رسالہ) شائع ہوا۔ اس رسالے کا صرف ایک شمارہ اس وقت شائع ہوا جب مل (پاکستان) میں مارشل لاء تھا۔

بتول : کیا شاعری آپ کا مشغلہ ہے؟

اشک : شاعری میرا مشغلہ نہیں لیکن میں نے تفریحِ قلب کے لئے شاعری نہیں کی۔ میرے اشعار دُکھے ہوئے دلوں کی صدا ہیں۔ شاعری کی تہہ میں میرا مقصد پوشیدہ ہے۔

بتول : کیا آپ نے آزاد نظمیں بھی لکھیں؟

اشک : اردو شاعری میں ایک نیا دَور آیا جس میں آزاد نظمیں لکھی گئیں۔ لیکن ان آزاد نظموں سے تو توبہ ہی بھلی۔ اشک کی آزا ان جدید آزاد نظموں کی روش سے بالکل مبرا ہیں۔

بتول : آپ نے آرام کا وقت ضائع کرکے مجھے انٹرویو دیا۔ اس کے لیے بہت بہت شکریہ!

اشک : نہیں بیٹی! شکریہ کس بات کا۔ آپ لوگ خوش رہیں بس یہی میری تمنا ہے! بنگلہ دیش میں شمعِ اُردو روشن

معیاری تنقید کے قارئین کو مژدہ!

نامور نقاد **مظفر علی سیّد** کا پہلا مجموعۂ مضامین

تنقید کی آزادی

شائع ہو گیا ہے

قیمت: ۱۸۰/- روپے

ناشر: **دستاویز مطبوعات**، کوٹھی رتن باغ۔ لاہور

احسن احمد اشک

◆

پھر وہی کنجِ چمن، پھر وہی فرصت مانگے
زندگی پھر وہی کھوئی ہوئی جنّت مانگے

جانے کب پَو پھٹے، کب رات کا جادو ٹوٹے
چشمِ بے خواب وہی زلف کی نکہت مانگے

عشق شرمندۂ بے مایگی و ناداری
حسن اک نیم نگاہی کی بھی قیمت مانگے

حوصلہ ہو جسے، اس شہر میں چل کر دیکھے
صورتِ حال مری دیدۂ عبرت مانگے

مئے اخلاص بچا رکھی ہے کچھ سینے میں
مفت دے دوں جو کوئی بہرِ ضرورت مانگے

اشک چہرے پہ ترے وقت کے ناخن کے نشاں
آئینہ پھر وہی اک چاند سی صورت مانگے

◆

انملے اُلجھے خیالات اُبھرتے کیوں ہیں
خواب بن کر گھنی زلفوں میں بکھرتے کیوں ہیں

قسمت آئینہ ہو زلف و لب و رخسار اگر
آپ ہر روز سرِ شام سنورتے کیوں ہیں

ڈھالنا جن کو ہو الفاظ کے سانچوں میں محال
خواب کے پردے میں وہ نقش اُبھرتے کیوں ہیں

موت جب آئے گی، آئے گی، سو ٹلنے کی نہیں
لوگ کچھ موت سے پہلے بھلا مرتے کیوں ہیں

ہو نہ ہو کوئی تو ہے اشک کا منظورِ نظر
ورنہ اک رہ سے کئی بار گزرتے کیوں ہیں

(بنگلہ دیش)

محسن نقوی کی شاعری

احمد ندیم قاسمی

محسن نقوی کرب باطن کا شاعر تھا مگر وہ اس کرب کو محض اپنی داخلیت کی پیداوار نہیں سمجھتا تھا بلکہ اسے علم اور احساس تھا کہ انسان کا باطن، بعض نسلی جبلتوں کے باوجود ظاہر، یعنی خارج کے اثرات سے صورت پذیر ہوتا ہے۔ وہ اگر معاشرے سے کٹ کر اور آبادیوں سے ہٹ کر، کسی غار میں بیٹھ کر بھی تخلیق فن کرے گا تو اس کی خاص خارجی صورت حال اس کے جذبہ و احساس میں سے چھن چھن کر اس کے باطن پر اپنے عکس ڈالتی رہے گی۔ اسی لیے محسن نقوی نے کمال فن کے عناصر میں، جہاں جذبہ و خیال کی سچائی کو شامل کیا، وہاں شعور کی پختگی، مشاہدے کی وسعت اور تجربے کی گہرائی کو بھی ان عناصر میں شمار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ محسن کی شاعری میں یہ تمام عناصر بدرجہ وافر موجود ہیں۔ اس کے نزدیک کمال فن کا پانچواں عنصر، اظہار کی توانائی ہے اور یہ عنصر اسے قدرت کی طرف سے اتنی مقدار میں ودیعت ہوا کہ مجال ہے جو اس کا کوئی مصرع کہیں ڈھیلا پڑ جائے، یا اس کا کوئی شعر تشنہ رہ جائے، یا اس کے الفاظ بول نہ رہے ہوں اور اس کے حروف بج نہ رہے ہوں۔ کمال فن کے ان عناصر خمسہ نے یک جا ہو کر محسن کی شاعری میں جگہ جگہ بے پناہ جادو جگائے۔ کلاسیکیت اور جدت کا جو متوازن اور متناسب امتزاج محسن کے ہاں ملتا ہے، وہ اس دور کی شاعری میں کچھ زیادہ عام نہیں ہے۔ یہ کلاسیکیت اور یہ جدت محسن کے طرز اظہار میں بھی ہے اور موضوع اظہار میں بھی۔ وہ ایک ایسا شاعر تھا جو مستقبل کی طرف اعتماد اور اہتمام سے بڑھ رہا تھا کہ اس کے ہمراہ ماضی کی روشن روایات بھی ہیں اور حال کی غیر مشروط حقیقت پسندی بھی۔

دراصل محسن نقوی ایک ہمہ جہت شاعر تھا۔ اس کی غزلوں اور نظموں کے علاوہ اس کے مرثیے، اس کے نوحے، اس کی منقبتیں اور اس کے سلام بھی پختہ اور بھرپور شاعری کے نمونے ہیں۔ اتنی بہت سی اصناف سخن کو کامیابی سے برت کر اس نے اظہار پر قدرت کاملہ حاصل کر لی تھی۔ کوئی نازک سے نازک جذبہ اور کوئی مبہم سے مبہم احساس بھی اس کی ہمہ گیر لفظیات کی گرفت سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جہاں متعدد دیگر شعراء ایک خاص جذبے یا ایک خاص احساس کے اظہار کے لیے پینترے پر پینترے بدلتے رہ جاتے ہیں، وہاں محسن نقوی اس جذبے یا اس احساس کا اظہار اتنی بے ساختگی اور بے تکلفی سے کرتا تھا جیسے اس نے بالکل سامنے کی بات کہہ دی ہے، حالانکہ یہ سامنے کی بات نہیں ہوتی تھی، بہت اندر

، بہت گہرائی کی بات ہوتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی بھی انسانی جذبے کو بے اظہار نہیں رہنے ے گا۔ اس کی غزلوں میں جو بے پناہ تنوع ہے، اس کے مصنف کے مشاہدے میں جو حیرت انگیز وسعت ہے اس کے فکر و احساس میں جو کامل ہم آہنگی بلکہ یک جاں ہو جانے کی کیفیت ہے، وہ بہت کم شعراء کے ر میں آتی ہے۔

محسن نقوی کو اس دور کا ایک منفرد شاعر بنانے میں متعدد عناصر کو دخل حاصل ہے۔ اول خود محسن کا ا اور رسیلا مزاج تھا۔ پھر اس کے وطن مالوف کے مناظر کی وسعتیں، پھر اس کا سدا، پا بہ رکاب رہنا تھا کہ مردان سے مکران تک گھومتا پھرتا تھا اور اپنے مشاہدوں اور تجربوں کے خزانوں میں اضافے کرتا رہتا تھا ب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے فن کی دنیا سے عقل و خرد کو خارج نہیں کیا تھا بلکہ اردو غزل میں عقل و ان کے مشترکہ آہنگ کی جو روایت مرزا غالب نے شروع کی تھی اسے محسن نے بڑے سلیقے سے برتا، اور اقاعدہ اعلان کر کے برتا کہ تخلیق فن کے محرکات کو اپنے شعور میں کھپائے بغیر کوئی بھی شاعر، بڑا شاعر نہیں سکتا۔ اس طرح کا اعلان صرف وہی شعراء کر سکتے ہیں جو اپنے کشف کو کوئی ماورائی چیز نہیں سمجھتے اور جن کردار میں استقامت اور جن کے عقاید و نظریات میں صلابت ہوتی ہے۔ محسن نقوی کا کلام اس استقامت صلابت کا ناقابل تردید ثبوت ہے اور یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں ہے۔ یار لوگوں نے تو یہ اعزاز حاصل نے کے لیے اپنی عمریں بھی گنوا دیں مگر پھر بھی اس سے محروم رہے۔ ادھر محسن تھا کہ غزل کے ایک ہی ر میں بھی شعور و جذبہ، فکر و احساس، مشاہدہ و تجربہ اور حقیقت و صداقت کو یک جا اور یک جان کر دیتا تھا۔ ں کا فن زندہ و پائندہ ہے اس لیے وہ خود بھی زندہ و پائندہ ہے۔ آخر میں اس کا ایک غیر فانی شعر:

یہ کس نے ہم سے لہو کا خراج پھر مانگا
ابھی تو سوئے تھے مقتل کو سرخرو کر کے

شاعر اور ادیب
دل نواز دل
کے تقریباً پانچ سو ہائیکو کا معرکتہ الآرا مجموعہ
"تکونا سورج"
بے مثال شاہکار شاعری
اردو شاعری میں گراں قدر اور گراں بہا اضافہ
اس کا حرف حرف دل پر نقش ہونے والا ہے
التحریر۔ کبیر سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

محسن نقوی

تمہیں کیا؟

تمہیں کیا .....
زندگی جیسی بھی ہے —
تم نے تو اِس کی ہر ادا سے رنگ کی موجیں نچوڑی ہیں
تمہیں تو ٹوٹ کر چاہا گیا — چہروں کے میلے میں
محبت کی شفق برسی تمہارے خال و خد پر
آئینے چمکے تمہاری دید سے
خوشبو تمہارے پیرہن کی ہر شکن سے
اِذن لے کر ہر طرف وحشت لٹاتی تھی،
تمہارے چاہنے والوں کے جھرمٹ میں .....
سبھی آنکھیں تمہارے عارض و لب کی کنیزیں تھیں!
تمہیں کیا .....
تم نے ہر موسم کی شہ رگ میں اُنڈیلے ذائقے اپنے
تمہیں کیا .....
تم نے کب سوچا؟
کہ چہروں سے اٹی دنیا میں، تنہا سانس لیتی
ہانپتی راتوں کے بے گھر ہم سفر
کتنی مشقّت سے گریبانِ سحر کے چاک سیتے ہیں؟
تمہیں کیا — !
تم نے کب سوچا؟
کہ تنہائی کے جنگل میں .....
یہ لمحوں کی چبھتی کرچیوں سے کون کھیلا ہے؟
تمہیں کیا!
تم نے کب سوچا .....
کہ چہروں سے اٹی دنیا میں
کس کا دل اکیلا ہے؟

محسن نقوی

○

بے تم نے اپنایا ، اس طرح کا ہو جانا
ب کو جاگتے رہنا، دن میں تھک کے سو جانا

ریں تو مجھ جیسی بے شمار آنکھیں ہیں
بھی خیر سے جاؤ، تم نہ اِن میں کھو جانا

ل کے کٹہرے میں جرُم بول پڑتا ہے
غ داغ دامن سے کچھ لہو تو دھو جانا

کی شاخ شاخ اب کے چُور ہے گلابوں سے
بھی اپنے حصّے کے پھُول کچھ پرو جانا

رے بعد کا رستہ تم سے کٹ نہ پائے گا
بھی اجنبی دیکھو، اب اُسی کے ہو جانا

ب کبھی پہاڑوں میں چاند ڈوبتا دیکھوں
ھ کو یاد آتا ہے تیرے شہر کو جانا

ہ نہ کچھ تو وِرثے میں چھوڑنا بھی ہے محسنؔ
یت ریت کھیتوں میں کچھ نہ کچھ تو بو جانا

○

سانسوں کے اِس ہُنر کو نہ آساں خیال کر
زِندہ ہوں، ساعتوں کو مَیں صدیوں میں ڈھال کر

مالی نے آج کِتنی دعائیں وصول کیں
کچھ پھُول اِک فقیر کی جھولی میں ڈال کر

اے گرد باد ، لَوٹ کے آنا ہے پھر مجھے
رکھنا مرے سَفر کی اذیّت سنبھال کر

محراب میں دِیے کی طرح زندگی گزار
مُنہ زور آندھیوں میں نہ خود کو نڈھال کر

شاید کسی نے بُخلِ زمیں پر کیا ہے طنز
گہرے سمندروں سے جزیرے نکال کر

یہ نَقدِ جاں کہ اِس کا لُٹانا تو سَہل ہے
گر بَن پڑے تو اس سے بھی مشکل سوال کر

محسنؔ برہنہ سَر چلی آئی ہے شامِ غم
غربت نہ دیکھ، اس پہ ستاروں کی شال کر

صمد انصاری کی غزل

احمد ندیم قاسمی

غزل کا حسن اس کی تنوع میں ہے۔ اس زمانے میں اس تنوع کو آزاد تلازمہ خیال کا تحفظ بھ حاصل ہو گیا ہے۔ بہرحال یہ اردو شاعری کی وہ صنف ہے جس نے ہر جارحیت کا نہایت کامیابی سے مقابلہ ہے اور آج کل عموماً صرف وہی شعرا غزل سے نفرت کرتے ہیں جنہیں قدرت کی طرف سے غزل کہنے مزاج ہی ودیعت نہیں ہوا ہے۔ رہے غزل کے مخالف نقاد، تو وہ اپنے ہتھیار ڈال چکے ہیں۔ اب غزل معترض ہونے کو ان کا جی چاہے تو وہ صرف یہی کہہ پاتے ہیں کہ غزل سطحی جذبات کی یا محض مجرد جذبے شاعری ہے اور غزل گو کسی بھی مسئلے، کسی بھی جذبے کی گہرائی میں نہیں جاسکتا کیونکہ وہ غزل کے صرف ا شعر کی فصیل میں محبوس ہوتا ہے اور دو مصرعوں میں کسی بڑی حقیقت کو گرفت میں لانا کسی بھی شاعر امکان سے باہر ہے۔ ان حضرات کے سامنے میر، یا غالب، یا اقبال کی غزل کا کوئی ایک شعر رکھ دیجئے تو ا سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔ جذبے کو فکر میں سمونے اور فکر کو جذبے سے ہم آہنگ کرنے کی یہ روا اردو غزل کی ایک پرانی روایت ہے اور صمد انصاری اسی روایت کے ایک کامیاب علمبردار تھے۔

فکر کو شاعری کا روپ دینے کے لیے غزل ایک بلیغ صنف اظہار ہے۔ یقیناً اس دور میں غزل لفظیات میں بھی تبدیلی آرہی ہے اور اس کی تشبیہوں اور استعاروں کی صورتیں بھی بدل رہی ہیں مگر شاعری کا جو حسن اس صنف کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے، وہ ان تبدیلیوں کے باوجود غزل میں اپنے وجو اثبات کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بلند اور گہرے اور ہمہ گیر افکار غزل میں اظہار پاتے ہیں تو قا اور سامع کے دل و دماغ میں نفوذ کرتے چلے جاتے ہیں۔ حق بات یہ ہے کہ غزل ہی نے اردو میں فکا شاعری کو مقبول اور ہر دلعزیز بنایا ہے ورنہ فکر محض کو منظوم کرتے چلے جانے سے زیادہ بیکار کام شاید تک کسی کو نہیں سوجھا۔

صمد انصاری غزل کے شاعر تھے مگر ساتھ ہی وہ مسائل سے بدکنے یا ان سے فرار اختیار کر بجائے ان سے پنجہ آزما ہونے والے شاعر بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صمد کے ہاں جذبہ اور فکر متضاد ہو بجائے متحد تھے اور ان میں اتنا آہنگ اور توازن تھا کہ صمد کی غزل میں جذبے کو فکر سے، یا فکر کو جذبے جدا کرنا، گوشت سے ناخن کو جدا کرنے کے مترادف ہے۔ صمد اپنے نقاد کو مجبور کر دیتے تھے کہ وہ ان کے

ا تجزیہ کرنے بیٹھے تو دل اور دماغ سے بہ یک وقت کام لے، اور اس صداقت کو اپنے اندر اتار لے کہ جو پچھ انسان کے دل میں ہے، وہ اس کے دماغ ہی کی کارفرمائی ہے، اور جو کچھ اس کے دماغ میں ہے اس میں ے دل کی اثر آفرینی کو خارج نہیں کیا جاسکتا۔ انسانی شخصیت صرف دل یا صرف دماغ نہیں ہوتی، دل و دماغ ے اتحاد و آہنگ ہی کا نام انسان ہے اور صمد انصاری کی شاعری اسی محسوس کرنے اور سوچنے والے انسان کی اعری تھی۔

صمد انصاری شاید درویشانہ غزلت نشینی کے تو قائل نہ ہوں مگر شاعری کی حد تک وہ خود ایک خاص عیت کے گوشہ نشین تھے کہ شعر اتنے تواتر اور شدت سے کہتے تھے جیسے عبادت میں مصروف ہوں مگر جب زل مکمل کر لیتے تھے تو اسے اپنی بیاض میں محفوظ کر کے جیسے اپنے فن کارانہ منصب سے سبک دوش ہو اتے تھے۔ یہ بے نیازی کم سے کم اس دور میں تو گوشہ نشینی ہی کہلائے گی۔ صمد آج کے غزل گو شعراء میں یک بلند مرتبہ رکھتے تھے اور اس بلند مرتبے کی بنیاد ان کی غزل کا حسن بھی تھا، سچائی بھی تھی، اور گہرائی بھی ی۔ ہر دور کی طرح اس دور میں بھی بہت کم غزل گو ایسے ہیں جن کی غزل فن اور فکر کے معاملے میں اتنی لنشین اور بلیغ ہو جیسے صمد انصاری کی غزل ہے اور پھر ایسے شعراء کی تعداد بھی بہت کم ہے جنہیں فن شعر ے معاملے میں صمد انصاری کی سی مثبت اور ناقابل شکست، خود اعتمادی اور بصیرت حاصل تھی۔

عہد ساز شاعر
اختر حسین جعفری
کا آخری مجموعۂ کلام
"جہاں دریا اترتا ہے"
"آئینہ خانہ" کے بعد ان کے انتقال تک کا سارا بے مثال کلام
"جہاں دریا اترتا ہے"
میں شامل ہے۔ آرڈر اس پتے پر بھجوائیں۔ قیمت: ۱۲۰ روپے
فردا پبلشنگ ہاؤس لاہور

ڈاکٹر سمد انصاری مرحوم
کا آخری خط

غنی لاج
2/I-E-4
ناظم آباد
کراچی - 74600

محترمی و مکرمی و محبی جناب قاسمی صاحب--- سلام و رحمتہ

آپ کا خط موصول ہوا۔ آپ کی تحریر میرے لیے باعث عزت اور موجب رحمت ہے۔

آپ کی شاعری اور فن اس قدر بسیط ہے کہ اس میں زندگی کے بے شمار زاویے سمٹ آئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ پر ایک وسیع تر پس منظر میں بات کی جائے اور تمام معاصرین کو بھی شامل کیا جائے تاکہ آپ نے جو اثر اپنے "عصر" پر چھوڑا ہے اور جس طرح زندگی کو محسوس کیا ہے، برتا ہے اور بیان کیا ہے، سامنے آئے۔ اس میں زندگی کے زیادہ سے زیادہ پہلو سامنے آئیں۔ آپ کی شاعری دراصل اقدار کی شاعری ہے جس میں "فن" اپنی پوری لطافت اور نزاکت کے ساتھ جلوہ آراء ہے۔ میرے خیال میں آپ کا بنیادی جوہر، غزل ہے۔ اور غزل مضمون کو اس طرح بیان کرتی ہے کہ وقت کے ساتھ اس کی پرتیں کھلتی جاتی ہیں۔ اس طرح شعر کبھی پرانا نہیں ہوتا۔ آپ کا ایک قرض بلکہ ادب اور انسانیت کا ایک فرض مجھ پر واجب ہے۔ مجھے آپ پر، آپ کے فن پر، اور آپ کے شعر میں جو Message ہے اس پر لکھنا ہے، اس کا مطالعہ کرنا ہے۔ یہ ایک بڑا کام ہے۔ میں کئی سال سے اس پر سوچتا رہا ہوں۔ میں نے آپ کی کتابوں "دشت وفا"، "شعلہ گل"، "محیط"، "دوام" اور "لوح خاک" سے کوئی دو سو اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ ان میں زندگی اور زندگی کے متعلقات بے شمار زاویوں سے بیان ہوئے ہیں۔ ایک ایک شعر میں فنی، جمالی اور معنوی محاسن اور خصوصیات اس قدر ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا دشوار ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ جب آپ کا معاملہ ہوتا ہے تو دوسرے مشاہیر بھی سامنے آتے ہیں، یعنی نگاہ میر پر بھی جاتی ہے، غالب پر بھی جاتی ہے، حکیم الامت علامہ اقبال پر بھی جاتی ہے اور فیض صاحب پر بھی جاتی ہے۔ پھر دنیا کی دوسری زبانوں کی شاعری بھی سامنے آتی

ہے۔

اس کے علاوہ آپ کے یہاں علامات کا استعمال، ساختیاتی مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ "آئینہ" آپ کے یہاں کن کن معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس کا معنوی پھیلاؤ کہاں تک جاتا ہے۔ معاصر ادب میں یہ پھیلاؤ کہاں تک ہے۔ آپ اپنے فن میں کیا Material (لفظی اور معنوی) استعمال کرتے ہیں۔ کن الفاظ کو آپ نے کیا معنی دیئے ہیں۔ قاری تک آپ کا مطمع نظر پہنچنے کے لیے یہ سب بہت ضروری ہے۔ مثلاً:

اسیر رہتے ہیں حالات کی چٹانوں میں
وہ آئینے جنہیں آئینہ گر نہیں ملتا

آپ کے اس شعر میں اسیر، حالات، چٹان، آئینہ اور آئینہ گر، سبھی علامات ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں مذہبی، تاریخی، سیاسی، سماجی اور موجودہ زمانے کے رجحانات، سب کا شعور ملتا ہے۔ آئینہ کی روایت ہمارے ادب میں بہت قدیم ہے۔ اس میں صورت گری، تزئین جمال، حیرت، عکاسی، شکستگی اور بہت سے عناصر شامل ہیں۔ لیکن اس شعر میں آئینہ بالکل مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے۔ علامہ نے فرمایا ہے:

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اس شعر میں ایک قسم کی رجائیت اور پرامیدی پائی جاتی ہے، لیکن اس کا عمل خود کار یا آٹومیٹک ہے، لیکن "لوح خاک" کے شعر میں، ایک سماجی عمل ہے جس میں موجودہ زمانے کے علوم کا پورا دخل ہے۔ اس کے علاوہ "چٹان" کا استعارہ بڑا یونیورسل ہے۔ دنیا کی ہر قیمتی شے کسی نہ کسی چٹان (Rock) میں بند ہے۔ سب سے بڑی دھات "تیل" چٹانوں ہی کے اندر محفوظ ملتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں Ore کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے جس میں تمام قیمتی دھاتیں پائی جاتی ہیں، لیکن اپنی منزہ اور قابل استعمال حالت میں (یعنی انہیں آئینہ بنانے میں) انسانی علوم سائنس اور ٹکنالوجی کا دخل ہے جس کے لیے آئینہ گری اور آئینہ گر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے اپنے معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ اس آئینہ گر یعنی "لیڈر شپ" کی کمی ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں یہ صورت حال ہے۔ اس کے علاوہ اس شعر میں ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ جو آئینہ اور آئینہ گری کے اسباب اس وقت موجود ہیں ناکافی اور ناکام ہیں۔ دراصل اب سیاسی اور سماجی انتظامیات کا زمانہ گزر چکا ہے۔ معاشرے کو اب سیاسی حکومتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی جگہ رفتہ رفتہ سائنس اور ٹیکنالوجی آجائے گی۔ یہ عمل شروع ہوچکا ہے۔ اگر مقامی طور پر یہ آئینہ گری میسر نہیں آئے گی، تو دوسرے ممالک سے یہ متاع عزیز در آئے گی۔ عنقریب ہی ایک عالمی برادری کا تصور زیادہ اجاگر اور فعال ہو جائے گا۔ تمام زمین اور اس کے خزانے، پوری انسانیت کا سرمایہ بن جائیں گے۔ اگر پاکستان اپنی نہروں کو سیمنٹ سے Line Up نہیں کرسکتا تو دوسرے ممالک یہ کام کریں گے تاکہ یہ زمین Water Logging سے محفوظ رہے اور اس عظیم دولت کو برباد ہونے سے بچایا جائے۔ اسی طرح اگر ہم

بلوچستان کی دولت سے مستفید نہیں ہو سکیں گے تو دوسری عالمی قوتیں اسے باہر نکال لیں گی جیسے عرب مما میں تیل کے معاملے میں ہوا ہے۔ اب ملک پر کسی ملک کے قبضے کا مسئلہ اور فوجی معرکوں کا زمانہ گزر گیا۔ مختصراً یہ کہ اب حالات کی چٹانیں ضرور ٹوٹیں گی اور تمام خفتہ امکانات کو آئینہ گر میسر ہوں گے۔

یہ "لوحِ خاک" کے ایک شعر کا جزوی مطالعہ ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو ان اشعار نقل بھیج سکتا ہوں جو میں نے منتخب کیے ہیں۔ بڑی شاعری کو تعارف کی ضرورت بھی ہوتی ہے یعنی اسے "آئینہ گر" ملنا چاہیے ورنہ وہ عوام بلکہ خواص تک کی بے خبری کی چٹانوں میں بند رہ جاتی ہے۔

میں بفضلہ خیریت سے ہوں، آپ کی ہمت کو داد دیتا ہوں۔ آپ کی درازی عمر و صحت کے دعاگو ہوں۔ زیادہ حد نیاز

آپ کا مخل
صمد انصاری

ظہیر بابر
کی متنوّع تخلیقی شخصیت کا ایک اور رُوپ
ساتواں صفحہ
جو بے مثال ہفت روزہ "لیل و نہار" میں
ہر ہفتے اشاعت پذیر ہوتا تھا
اب کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے
شائستہ ادبی مزاح اور نکیلے سیاسی طنز کا مرقع
قیمت : ۲۲۰ روپے
ناشر: فرنٹیر پوسٹ پبلیکیشنز۔ شاہراہِ فاطمہ جناح۔ لاہور

ڈاکٹر صمد انصاری

○

کنارِ صبح ، شبِ رفتگاں رہے نہ رہے
کسی چراغ کی لَو پر دھواں رہے نہ رہے
وہ جس میں مانگی گئی خیرِ صبحِ مقتل تک
وہ ایک رات بھی اب درمیاں رہے نہ رہے
بچھی ہوئی ہے زمیں تو ہمارے پاؤں تلے
ہمارے سر پہ کوئی آسماں رہے نہ رہے
رہینِ درد ہیں ہم ، درد کا بھروسہ کیا
بہار میں کوئی رنگِ خزاں رہے نہ رہے
لہو کی بُو تو رہے گی ہوائے مقتل میں
کسی دہن میں سلامت زباں رہے نہ رہے
رہے گی سجدے کی خُو تو ابھی جبینوں میں
جہاں میں باقی کوئی آستاں رہے نہ رہے
رواں رہیں گی یونہی کشتیاں زمانے کی
ہوا کی زد پہ کوئی بادباں رہے نہ رہے
رہیں گی راہگذاریں ، نگر نگر آباد
سفر میں کوئی شجر مہرباں رہے نہ رہے
سمجھ رہے ہیں جسے شہرتِ دوام صمدؔ
زبانِ خلق پہ وہ داستاں رہے نہ رہے

○

اُفتادگیِ خاک نہیں، دشت و در نہیں
یہ ارضِ کم سواد ، مقامِ بشر نہیں
کب تک رہیں گے ہم پہ یونہی روزوشب حرام
مانا ہمارے حال سے وہ بے خبر نہیں
کرکے رہے گی خاک اُسے نفرتوں کی آگ
وہ شہر جس میں شخص کوئی معتبر نہیں
یارب دھنک کے رنگ بھی یکجا نہ رہ سکیں
اتنی بھی کائنات تِری منتشر نہیں
کب سے حرم کی خستہ کتابوں میں بند ہیں
وہ اہلِ عِلم جن میں متاعِ ہنر نہیں
ساقیِ شب کا فیض زمانے پہ عام ہے
اب دورِ ماہتاب کسی نام پر نہیں
آنکھوں میں گونجتی ہے بہت لو چراغ کی
لیکن پسِ چراغ کسی کی نظر نہیں
کب تک وفا کرے گا امیدِ دل کا حوصلہ
نامہ نہیں، پیام نہیں، نامہ بر نہیں
پھوٹی ہے اب کے نخلِ شبِ تار سے صمدؔ
وہ شاخِ آفتاب کہ جس پر سحر نہیں

کچھ دلدار پرویز بھٹی کے بارے میں

امجد اسلام ا

(دلدار کی زندگی میں "دلدار کے ساتھ ایک شام" میں پڑھا گیا)۔

دلدار بھٹی کے بارے میں بات کرنا جس قدر آسان ہے، لکھنا اتنا ہی مشکل ہے کہ یہ پارے کو مٹھیوں میں بند کرنے کا عمل ہے۔ ٹی د
سے اُس کی شخصیت کا ایک ہی رُخ نمایاں رہا ہے اور وہ ہے پنجابی کے سٹیج شوز کا بہترین اور مقبول ترین میزبان۔ کمپیئرنگ کے حوالے
اُردو کے بہت سے کامیاب پروگرام بھی پیش کئے ہیں لیکن "ٹاکرے" سے لے کر "پنجند" تک جو عوامی مقبولیت اُسے پنجابی زبان کے پروگ
ملی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ منی سکرین کے حوالے سے اس کا چہرا پاکستان کے چند سب سے معروف چہروں میں سے ہے۔ شاید اسی لئے وہ
کہ اگر کوئی شخص اُس کے چہرے سے اُسے نہیں پہچانتا تو وہ اس سے اپنا تعارف بھی نہیں کراتا۔

دلدار سے میری پہلی ملاقات آج سے تقریباً بیس برس قبل اس وقت ہوئی جب وہ تازہ تازہ ایم اے انگریزی کرنے کے بعد ایم اے
میرا کولیگ بنا تھا۔ تب سے اب تک وہ میرے چند بہت اچھے اور گہرے دوستوں میں شامل ہے۔ دوستی کے ابتدائی دنوں میں ہم دونوں
میدانوں میں جگہ بنانے کی جدوجہد میں تھے سو ہم میں ایک رشتہ، مشترکہ محرومیوں، ناکامیوں اور SET BACKS کی سانجھ کا بھی تھا۔ میری
بطور ڈرامہ نگار باقاعدہ انٹری ۱۹۷۴ء میں ہوئی اور تقریباً اسی زمانے میں دلدار کا "ٹاکرا" بھی شروع ہوا۔ پھر ایک زمانے میں شہزاد احمد، ظ
میں اس پروگرام کے ایڈوائزر بھی رہے۔ ہم اُسے کیا ایڈوائز کرتے تھے یہ ایک ایسا سربستہ راز ہے جس کا پتہ نہ ہمیں ہے اور نہ دلدار کو۔ یہ کچھ اس
تھا جیسے آج کے اخبار میں گورباچوف کے حوالے سے ایک دلچسپ خبر میں پیش کیا گیا ہے۔ گورباچوف نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا ک
کی سو بیویاں تھیں اُن میں سے ایک ایڈز کی مریضہ تھی مگر بدقسمتی سے صدر کو پتہ نہ تھا کہ وہ کون سی ہے۔ اسی طرح ایک اور صدر کے سو باڈی گا
جن میں سے ایک دہشت گرد اور غدار تھا مگر اس صدر کو بھی علم نہ تھا کہ وہ کون سا ہے۔ میں بھی ایک صدر ہوں میرے پاس بھی ایک سو ما
ہیں۔ اُن میں سے ایک دانش مند اور ذہین ہے مگر افسوس مجھے بھی پتہ نہیں کہ وہ کون ہے۔"

آج کی یہ محفل دلدار کے ساتھ ایک شام ہے جس کا مقصد اس بے مثال فنکار کو خراجِ عقیدت پیش کرنا اور اس کی فنی خدمات ک
میں اپنی اس گفتگو کو اُس کی شخصیت کے صرف ایک پہلو تک محدود رکھوں گا کیونکہ اس طرح کی محفل کسی مفصل یا سنجیدہ تنقیدی مضمون کی متح
اور وہ خوبی ہے دلدار کی برجستہ گوئی۔ وہ اپنی گفتگو کے دوران جس فی البدیہہ مزاح، طنز، ذکاوت اور PUN کا مظاہرہ کرتا ہے اور مختلف
حاضرین کے سامنے تقریب کے موضوع کے مطابق جو نوکیلی، چٹکیلی اور مزاحیہ باتیں کرتا ہے وہ کسی سکرپٹ رائٹر کی مرہونِ منت نہیں ہوتی
مقدار میں طبع زاد مزاح تخلیق کرنا کوئی چھوٹی بات نہیں۔ یورپ اور امریکہ میں اس طرح کے سٹیج شوز کرنے والوں کے پیچھے سکرپٹ رائٹرز اور S
CONTRIBUTORS کی ایک فوج ظفر موج ہوتی ہے جو اس کے لئے بھاری معاوضے پر دن رات محنت کر کے اچھی اچھی اور پُرلطف باتی
جبکہ دلدار یہ سارا کام اکیلا اور تنہا کرتا ہے۔ اُس کی برجستہ گوئی کے یوں تو بے شمار واقعات ہیں اور اُن میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں شاید زیاد
میں سُنانا خلافِ تہذیب سمجھا جاتا ہے مگر ہنسنے ہنسانے کے معاملات میں کبھی کبھی اس قسم کے تجاوزات ہو ہی جاتے ہیں۔ گڑبڑ اُس وقت

کوئی شخص باقاعدہ نیت اور منصوبے کے ساتھ اس طرح کی باتیں کرنے لگے اور میں یہ بات پورے وثوق اور اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ دلدار نے ایسا کبھی نہیں کیا ــــ اس وقت میں وقت کی قلت کے پیشِ نظر صرف دو واقعات آپ کو سناؤں گا :

اسلام آباد میں فنکاروں کا ایک بہت بڑا اجتماع تھا۔ فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں سے لوگ مدعو کئے گئے تھے اور رات کے کھانے کے بعد لیاقت ہال پنڈی میں اُن کے لئے ایک شو ترتیب دیا گیا تھا جس کے وہ خود ہی مہمان تھے اور خود ہی میزبان ــــ دلدار کمپئرنگ کر رہا تھا اور سامنے ایک ایسی آڈیئنس تھی جس کا ہر فرد خود بھی اپنے اپنے فن کا مانا ہوا ماہر تھا۔ ان میں غلام فرید صابری قوال بھی تھے جو اپنی بھاری اور منفرد آواز میں وقفے وقفے کے ساتھ "اللہ" اس طرح کہتے تھے کہ سب لوگ اُن کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ اُن کی اس حرکت سے دلدار بہت ڈسٹرب ہو رہا تھا کیونکہ اس سے اُس کی اپنی اور سٹیج پر موجود فنکار کی پرفارمنس بہت بُری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ جب صابری صاحب نے کوئی پانچویں بار "اللہ" کا نعرہ لگایا تو دلدار سٹیج سے بولا :

"صابری صاحب ! اللہ کو اتنا بھی یاد نہ کریں کیونکہ اُس نے آپ کو یاد کر لیا تو پچھتائیں گے !"

اسی محفل میں آزاد کشمیر کے ایک لوک گلوکار بھی ایک کشمیری گیت پیش کرنے آئے۔ کچھ تو شاید گیت ہی لمبا تھا اور کچھ وہ ایسے منتخب سامعین کو دیکھ کر پریشان بھی ہو گئے سو انہوں نے جو گیت شروع کیا وہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ گیت کے خاتمے پر دلدار سٹیج پر آیا اور کچھ یوں گویا ہوا :

"خواتین و حضرات ! ابھی آپ نے جناب فلاں فلاں سے ایک کشمیری لوک گیت سُنا۔ تشریف تو یہ آزاد کشمیر سے لائے تھے مگر گانا انہوں نے پورے کشمیر کا سُنا دیا ہے !"

دلدار کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک نیا پہلو بطور ایک کالم نگار کے حال ہی میں سامنے آیا ہے۔ اُس کی شگفتہ نثر اس میدان میں تازہ ہوا کا ایک جھونکا ہے اور اُس کی اُٹھان سے پتہ چلتا ہے کہ اگر وہ اسی طرح لکھتا رہا تو بہت جلد ہم اُسے ایک مستند اور منفرد نثر نگار کے طور پر بھی دیکھیں گے۔ متعلقہ احباب ہوشیار رہیں۔

میں اپنی اس مختصر تحریر کو دلدار کی ڈائری کے اُس اقتباس پر ختم کرنا چاہتا ہوں جو اس تقریب کے دعوت نامے کی پُشت پر بھی چھپا ہوا ہے۔ میرے خیال میں یہ نثر کا ایک لاجواب ٹکڑا ہے کہ دلدار نے چند سطروں میں ہمارے قومی کردار کے بارے میں ایسی شوخ، معنی خیز اور اہم باتیں ایسے ماہرانہ اختصار کے ساتھ کی ہیں جو ہمارے ان تمام دانشوروں کے لئے ایک سبق ہے جو ان موضوعات پر بے شمار کاغذ ضائع کرتے ہیں مگر پھر بھی پڑھنے والے کے پلّے کچھ نہیں پڑتا ــــ دلدار لکھتا ہے :

"میرا خاندان بہت مختصر تاریخ رکھتا ہے۔ میرے بزرگ محمد بن قاسم کے ساتھ نہیں آئے تھے۔ نہ ہی شاہوں کی اولاد تھے۔ ہم نے قائدِ اعظم سے کبھی ملاقات نہیں کی۔ نہ ہی اُنہوں نے یا کسی اور مردِ قلندر نے ہمیں خواب میں بشارت دی ــــ ہم نے پاکستان بالکل نہیں بنایا نہ اس کے لئے کوئی قربانی دی۔ یہ ہمیں بنا بنایا مل گیا تھا۔ تایا فوج میں تھے۔ وہ ہمارے قافلے کو بحفاظت امرتسر سے لاہور لے آئے۔ اس طرح ہمارا قافلہ لٹنے سے بچ گیا (افسوس !)۔ یہاں آکر مزے سے پراٹھے کھائے، گھر الاٹ کرایا، اور دوبارہ گوجرانوالہ میں آباد ہو گئے۔ "دوبارہ" اس لئے کہ ہم یہیں سے نقل مکانی کر کے امرتسر میں آباد ہوئے تھے۔ ابا کو ایک دفعہ تانگے میں سوار ہوتے ہوتے ایک گولی لگتے لگتے رہ گئی۔ یہ گولی اُس ٹانگ کو نشانہ بنا رہی تھی جو وہ پائدان پر رکھ چکے تھے۔ گولی چلانے والا کوئی اناڑی تھا۔ بدمست سکھ تھا ورنہ زخمی ٹانگ کے بدلے میں خان لیاقت علی خان سے ایک آدھ مربع تو مل ہی جاتا ــــ اصل میں ہماری زندگی ایسے ہی CHANCES MISSED سے عبارت ہے !"

ماجد صدیقی

دلدار پرویز بھٹی

جو ہنساتا تھا ہمیں، وہ یار اب ہم میں نہیں
وہ کہ تھا اک خلق کا دلدار، اب ہم میں نہیں

نیم وا آنکھیں تھیں جس کی زہر کربِ ذات سے
وہ کہ آتا تھا نظر میخوار، اب ہم میں نہیں

وہ کہ جس کے بول یوسف کی طرح انمول تھے
وہ کہ تھا سجتا سرِ بازار، اب ہم میں نہیں

وہ کہ جس نے جان دے ڈالی سفر میں خیر کے
خیر ہی جس کا رہا بیوپار، اب ہم میں نہیں

وہ کہ لے لیتا تھا جو شاہوں تلک کی چٹکیاں
گونجتا تھا جو سرِ دربار، اب ہم میں نہیں

ایوب خاور

دلدار کے لیے ایک نظم

کیوں نہیں ہنستے ہو؟
اِتنے سارے روتے ہوئے لوگوں کے بیچ
کیوں اب چُپ کا کورا لٹھا تان کے لیٹے ہو؟
کیوں نہیں ہنستے ہو؟

اپنی اِتنی بڑی بڑی آنکھوں میں
کِتنا درد چھپا لوگے؟
کِتنے خواب بجھا لوگے؟
کِتنے رازِ حیاتی والے خاک میں یار ملا لوگے؟
کِتنے ہجر سنبھالو گے؟
کِتنے لوگ رُلا لوگے؟
کِتنی دیر تلک دلدارا! موت کا ڈھونگ رچا لوگے؟
آنکھیں کھولو
ایک دفعہ کلکاری مار کے ہنس دینے کا
کیا لوگے؟

اوپندرناتھ اشک

○

زندگی ختم ہوئی اب یارو، دانائی سکھلانا کیا
عمر گنوا دی نادانی میں، اب اس پر پچھتانا کیا
اتنا عرصہ جی آئے ہیں کیسے، یہ بتلانا کیا
جو بھی گزری اچھی گزری، اس کا رنج منانا کیا
کھڑکی اگر کھلی ہو اے دل، جی بھر کر دیدار کرو
بند کواڑوں سے ٹکرا کر آنکھوں کو پتھرانا کیا
نفرت کے ہیں بیس بہانے، الفت کا تو کوئی نہیں
آنکھیں ملیں دلوں نے سمجھا، کوئی اور بہانہ کیا
راز چھپائیں یاروں سے تب کس سے دل کی بات کریں
جن پر جان چھڑکتے ہوں، پھر ان سے بھید چھپانا کیا
اے میرے ہم وطنو! تم تو سدا ہے میرے دل میں
لیکن کبھی کسی نے پوچھا میرا ٹھور ٹھکانا کیا؟
روٹھے یار بڑی مشکل سے مانا کرتے ہیں لیکن
جن کے قدموں پر سر رکھنا، پھر ان سے شرمانا کیا
اشک جی عشق بڑھاپے کا ہوتا ہے مارک ٹون کہیے
اتنے روگوں کے چلتے یہ مہلک مرض لگانا کیا

○

پیہم مصیبتوں سے ملے، تو قرار لیں
یادوں کے بتکدوں کو ذرا پھر سنوار لیں

دن تھے، فلک شگاف تھے جب اپنے قہقہے
پھر مل سکیں تو دن وہ کہیں سے ادھار لیں

ساقی سے گر نگہ نہ ملے، ہم نہ جام لیں
اور جب ملے تو دوڑ کے دیوانہ وار لیں

اک آگ ہے کہ دل میں سلگتی ہے ہر گھڑی
چاہو تو اس کو ایک غزل میں اتار لیں

غم کے لیے پڑی ہے ابھی ایک عمر اشک
آؤ یہ چند ساعتیں ہنس کر گزار لیں

سیّد یٰسین قدرت

اُس نے مجھ سے کہا تھا

نیلگوں آسماں
ملگجی ارضِ غم
اور افق تا شفق
سرمئی بادلوں میں اُداسی کے رنگ
اس کے کمرے کے ماحول میں
اِک ملال آفریں کیفیت
اس کے بستر میں مسلی ہوئی
باسی کلیوں کی بُو
اس کی بیباک آنکھوں میں واضح
حنائی نشاں

(الاماں!)
اس کا غنچہ دہن
اَدھ کھلے پھُول سا
اس کے رُخسار پر
سُرخیوں کی پھبن
اس کی آنکھیں کنول
بھیگی بھیگی غزل
اس کی زُلفیں
گھنے پیڑ کی چھاؤں
اور گورے ہاتھوں پہ رکھی ہُوئی
زندگی
(مری زندگی!)

درد کے سلسلے ہر طرف
پھُول افسردہ
کلیاں نڈھال
کھنڈر کی مثال
بام اُجڑے ہوئے
حیرتوں کے نگر
ہجرتوں کے سفر
آج درپیش
بے رنگ، پژمردہ اطراف کی ہاؤ ہُو
اس کی یادوں کے دُکھ
اس کی دُوری کے دُکھ
میں جو پلٹوں تو ماضی کی بیزاریاں
بال کھولے ہوئے ہیں
مرے سامنے
ایک دن
جبکہ کمرے میں بیٹھے تھے سب
اُس نے مجھ سے کہا تھا، کہ
"کمرے کے باہر کا موسم
بہت دلنشیں ہے!"

مگر اس کا مفہوم کچھ ~~اور تھا~~
جو میں سمجھا نہ تھا!!!

پروفیسر احمد علی ــــــ حیات اور خدمات

محمد کامران

پروفیسر احمد علی سال نو کے دوسرے عشرے میں اپنے ہم وطنوں کی بے حسی کا گلہ کرتے ہوئے اس دنیا سے رخ ہوئے تو ہمارے ذرائع ابلاغ کو اچانک علم ہوا کہ ہم ایک عظیم شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں۔ ہر بڑے تخلیق کار کی طرح پروفیسر بھی COMPLEX PERSONALITY کے مالک تھے۔ ترقی پسند تحریک سے تعلق اور آخری عمر میں مکمل گوشہ نشینی ان کی شخصیت کے اسرار میں اضافہ کر دیا تھا۔ پروفیسر احمد علی کے حوالے بعض ترقی پسندوں سے استفسار کیا تو ناک بھوں چڑھ لیے "کون احمد علی؟ وہ جو ہمارا ساتھی تھا یا وہ جو ہم سے دامن چھڑا کر بھاگ گیا؟" عرف عام میں رجعت پسند کہلانے والوں سے تو جواب ملا "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔" ادبی تذکروں سے رجوع کیا تو ڈیڑھ دو سطروں میں درج یہ جواب ملا کہ پسند مصنفین تحریک کے کارواں کے سالاروں میں شامل تھے۔" 'انگارے' میں اپنے دو افسانے شامل کر کے اپنے خلاف کف فتوے لگوائے اور باقی عمر اس "گناہِ عظیم" کی تلافی میں گزار دی۔

پروفیسر احمد علی کی شخصیت اور ادبی خدمات کے حوالے سے اپنے تحقیقی مقالے کی تکمیل کے دوران جب نے احمد علی سے ملاقات کی تو انھوں نے ابتدا ہی میں مجھ پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ شارٹ کٹ کے ذریعہ کسی تخلیق کے تخلیقی سفر میں شرکت کے خواہش مند ساحل پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ پروفیسر احمد علی نے مجھے اپنی حیات اور تخلیقات سمندر کی شناوری کا لائسنس دیتے ہوئے کہا تھا کہ میری تحریروں میں میری حیات عکس در عکس بکھری ہوئی ہے، اس لیے آ آئینہ خانے سے عکس ریزوں کی تلاش کرتے ہوئے اس تخلیقی فضا میں EXIST کرنے کی کوشش کرنا جس کا کرب تخلیق تخلیق پر آمادہ کرتا ہے۔ پروفیسر احمد علی کا نام اردو ادبیات میں ایک ایسے بے مثل تخلیق کار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے جس اردو اور انگریزی ادبیات کے بہت سے شعبوں میں نمایاں کارنامے انجام دیئے خصوصاً اردو کے افسانوی ادب کو ایسا اعتبار عطا کیا کہ ان کا شمار "نئے ادب" کے اماموں میں ہونے لگا۔ ان کی حیثیت اردو ادب کے افق پر طلوع ہونے وا آفتاب کی ہے جس کی کرنوں نے مشرق و مغرب کے دھندلکوں میں اپنی فکرِ جمیل کی روشنی بکھیر دی۔ "انگارے" کے افسانو قرآنِ مجید کے انگریزی ترجمے تک پروفیسر احمد علی کا سفرِ حیات مسلسل جستجو کی نہ ختم ہونے والی داستان ہے۔

احمد علی یکم جولائی ۱۹۱۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین سید شجاع الدین اور کنیز اصغر بیگم کے ہاں بڑی مرادوں کے بعد یہ اولاد پیدا ہوئی تھی اس لئے ان کی پیدائش پر بے انتہا خوشیاں منائی گئیں۔ ابھی ان کی عمر نو برس کی تھ والد وفات پا گئے اور نزع کے عالم میں احمد علی کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اپنے بڑے بھائی کو سونپ گئے۔ اپنے تایا کے ان کی پرورش انتہائی فرسودہ اور گھٹے ہوئے ماحول میں ہوئی۔

۱۹۲۳ء میں احمد علی گورنمنٹ ہائی سکول علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے لئے انھیں منٹو سرکل میں داخل ہونا پڑا۔ جہاں ان کی ملاقات ممتاز ماہر تعلیم شیخ عبداللہ کے بیٹے محسن عبداللہ سے ہوئی۔ محسن عبداللہ کی بڑی بہن رشید جہاں (۱۹۰۵ء-۱۹۵۲ء) سے ان کی ملاقات دوستانہ مراسم میں ڈھل گئی۔ ۱۹۲۶ء میں احمد علی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے جہاں ان کی ملاقات انگریزی کے معروف شاعر اور پروفیسر ایرک سی ڈکنسن سے ہوئی جن کی حوصلہ افزائی کی بدولت احمد علی میں انگریزی ادبیات کا ذوق پروان چڑھا۔ ۱۹۲۹ء میں ان کا پہلا انگریزی افسانہ "WHEN THE FUNERAL WAS CROSSING THE BRIDGE" (جب جنازہ پل پر سے گزر رہا تھا) لکھنؤ یونیورسٹی جرنل میں شائع ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں انھوں نے ایم۔ اے انگریزی کے امتحان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کر کے" جھلا ور گولڈ میڈل حاصل کیا۔

ان کا پہلا اردو افسانہ "مہاوٹوں کی ایک رات" اپنے وقت کے معروف ادبی جریدے "ہمایوں" میں شائع ہوا۔ اسی دوران احمد علی، سجاد ظہیر (۱۹۰۵ء-۱۹۷۳ء) کے قریب آ گئے۔ دونوں کی انقلابی سوچ کا ثمر "انگارے" کی صورت میں سامنے آیا۔ "انگارے" کے مصنفین میں محمود الظفر اور رشید جہاں بھی شامل تھے۔ "انگارے" کی کہانیوں میں سماجی رجعت پرستی، دقیانوسیت اور دوہرے معاشرتی معیاروں کے خلاف ان تعلیم یافتہ باشعور اور "نئی سوچ" سے متاثر نوجوانوں کا بھرپور ردعمل تھا۔ ان نوجوانوں نے جہاں جنس کے جن کو بوتل سے آزاد کر دیا وہاں مذہب کی آڑ میں کیے جانے والے استحصال کا پردہ چاک کیا۔ "انگارے" میں شامل احمد علی کی پہلی کہانی "مہاوٹوں کی ایک رات" میں شعور کی رَو کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ مصنف نے اس کہانی میں ایک غریب عورت کے جذبات کو INTERIOR MONOLOGUE کے ذریعہ فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی دوسری کہانی میں ایک ANGRY YOUNG WOMAN کی ذہنی رد کا انکشاف نظر آتا ہے، جو معاشرتی گھٹن، معاشی عدم مساوات اور مردوں کے استحصالی ہتھکنڈوں کے خلاف ہندوستانی عورت کا بھرپور ردعمل ہے۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر سجاد ظہیر اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ احمد علی بھی پیش پیش تھے۔ کانفرنس کے بعد کے ایک اجلاس میں احمد علی نے "A PROGRESSIVE VIEW OF ART" کے عنوان سے ایک مقالہ بھی پڑھا۔ احمد علی کا پہلا افسانوی مجموعہ "شعلے" پہلی بار نیا سنسار الہ آباد سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا[1] "شعلے" میں کل بارہ افسانے شامل ہیں جنھوں نے اس صدی کی تیسری دہائی میں ادبی حلقوں میں ہلچل مچا دی۔ یہ افسانے بنیادی طور پر مذہب، سماج اور جنس کے دائروں میں گھومتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند افسانے کے ابتدائی دور میں تحریر کیے جانے والے ان افسانوں میں فنی اور تکنیکی لحاظ سے بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں، مگر جس دور میں یہ کہانیاں عصری شعور کی کٹھالی سے گزر کر منصۂ شہود پر آئیں، اس کے تناظر میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کے بغیر ہمارا موجودہ افسانوی ادب مکمل نہیں ہوتا۔

۱۹۳۸ء میں احمد علی نے انجمن ترقی پسند مصنفین سے قطع تعلق کر لیا، اس علیحدگی کے بہت سے اسباب تھے، مگر سب سے اہم اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ سجاد ظہیر اس ادبی تحریک سیاسی / مارکسی رنگ دینا چاہتے تھے مگر احمد علی کو یہ منظور نہ تھا، کیونکہ وہ پہلے ایک تخلیقی فن کار تھے اور بعد میں ترقی پسند۔

۱۹۴۰ء میں احمد علی کا مشہورِ زمانہ ناول TWILIGHT IN DELHI ہوگارتھ پریس لندن سے شائع ہو کر

---

[1] پروفیسر احمد علی نے راقم الحروف کو جو ٹائپ شدہ BIO-DATA فراہم کیا، اس کے مطابق "شعلے" کا سال اشاعت ۱۹۳۴ء ہے۔ مگر کارلو پولا نے مختلف مضامین میں اس مجموعے کا سالِ اشاعت ۱۹۳۶ء لکھا ہے۔

منظرِ عام پر آیا تو بہت سے چوٹی کے نقادوں نے اسے تنقیدی توجہ کے قابل سمجھا۔ ای۔ ایم فارسٹر، ایڈون میور، بونامی ڈابرا اور بہت سے دوسرے نقادوں کے تبصرے مختلف برطانوی اخبارات میں شائع ہوئے۔ اس ناول کا اردو ترجمہ احمد علی کی زوجہ محترمہ بلقیس نے کیا، جو ۱۹۶۳ء میں "دلی کی شام" کے عنوان سے عکاش پریس کراچی سے شائع ہوا۔ انگریزی اور اردو کے علاوہ اس ناول کی مقبولیت کا دائرہ دنیا کی دیگر زبانوں تک پھیل گیا۔ چنانچہ فرانسیسی زبان میں اس ناول کا ترجمہ ۱۹۸۹ء میں پیرس سے اور ہسپانوی زبان میں اس ناول کا ترجمہ ۱۹۹۱ء میں بارسلونا سے شائع ہوا۔ یہ ناول برصغیر میں مسلم تہذیب و ثقافت کا نثری شہر آشوب ہے جس کے پس منظر میں اس نئی زندگی اور نئی تہذیب کا خواب پنپ رہا تھا جس کی کوکھ سے صبحِ پاکستان طلوع ہوئی۔

بہت سے اردو نقادوں کا خیال ہے کہ اگر یہ ناول پہلی بار اردو میں شائع ہوتا تو پریم چند کے بعد جدید اردو ناول نگاری کا آغاز اسی سے ہوتا۔ اس ضمن میں راقم کے استفسار پر احمد علی نے (اگست ۱۹۹۲ء میں) بتایا کہ ان کا اس ناول کو انگریزی زبان میں لکھنے کا فیصلہ درست ثابت ہوا کیونکہ اس طرح انھیں قارئین کا ایک وسیع حلقہ میسر آیا اور مغربی د کو ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی رنگارنگی اور اس کے زوال کے ساتھ ساتھ ان حقائق سے بھی آگاہی حاصل ہوئی جو برطانوی سامراج نے ہندوستانی قوم کو اپنا محکوم رکھنے کے لیے روا رکھے ہوئے تھے۔ دلی کے متعفن کوچوں میں ٹوکے تھپیڑے کھاتی زندگی کو مایوسی کے اندھیروں سے امکانات کے اجالوں تک جس جس انداز سے احمد علی نے دیکھا، برتا اور لکھا۔ اس کی مثال اردو کے افسانوی ادب کی تاریخ میں مشکل سے ہی ملے گی۔ "دلی" اس ناول کے نظامِ شمسی کا وہ سورج ہے جس کے گرد ایک زوال پذیر تہذیب اور اس کے کردار گھومتے ہیں۔

احمد علی نے ٹی ایس ایلیٹ کی شاعری کا خصوصی مطالعہ کیا اور اس حوالے سے MR. ELIOTS PENNY - WORLD OF DREAMS. کے عنوان سے ایک مقالہ قلمبند کیا جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ نومبر ۱۹۴۲ء میں ان کے افسا مجموعہ "ہماری گلی" کی اشاعت اردو کے افسانوی ادب میں نئے رجحانات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس مجموعہ میں شامل پہلی کہا "ہماری گلی" کو احمد علی کا نمائندہ افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ "معیار" میں ممتاز شیریں کے افسانہ کو اردو کے چند اچھے افسانوں میں شمار کیا ہے "ہماری گلی" احمد علی کے وسیع مشاہدہ اور سماجی شعور کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس میں زندگی کے خارجی حقائق کو موضوع بنایا گیا ہے جبکہ مجموعے میں شامل ایک اور کہانی "میرا کمرہ" میں مصنف نے داخلی دنیا کے حوالے سے خارجی ماحول کی مختلف جہتوں تک ر حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

"قید خانہ" احمد علی کے اردو افسانوں کا آخری مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں وہ ایک وقیع افسانہ نگار کی صورت میں ابھر کر سامنے آئے۔ اس میں شامل ان کی طویل چاروں کہانیاں حیات و کائنات کے فلسفہ کی گہرائی اور گیرائی میں اتر کر اظہا کے بہترین امکانات کی تلاش کی عمدہ کاوشیں ہیں۔ تلاش کے اس سفر میں یہ کہانیاں شعور کی بھٹی سے گزر کر زندہ تخلیق کے کند میں ڈھلتی محسوس ہوتی ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل طویل کہانیوں میں سے "پریم کہانی" میں انھوں نے محبت کا فلسفہ پیش کیا ہے۔ "قلعہ" میں تمثیلی انداز سیاست کو فلسفیانہ انداز میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "قید خانہ" میں احمد علی نے علامتی انداز میں انسان کے تشخص کے بحران کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ "گزرے دنوں کی یاد" میں اُنھوں نے نوسٹلجیائی شعور کی مدد سے ماضی کی پُرا اور حیران کن بازگشت سننے کی کوشش کی ہے۔ ان کا افسانہ "قید خانہ" رمزیت کے حوالے سے ایک شاہکار افسانہ قرار

جا سکتا ہے۔ اس افسانہ میں کافکا کی رمزیت اور طریقۂ اظہار سے مناسبت پائی جاتی ہے۔ "قید خانہ" میں شامل کہانیوں کے حوالے سے ممتاز شیریں لکھتی ہیں:

> "احمد علی کا تصور آفاقی ہے اور ان کے یہ وقیع افسانے جو ہمارے ادب میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں، طویل افسانوں کی ایسی مثالیں ہیں جو مغربی ادب کے بڑے افسانوں کے مقابل میں پیش کی جا سکتی ہیں"۔

دسمبر ۱۹۴۵ء میں ان کی طویل افسانوی تحریر "موت سے پہلے" شائع ہوئی۔ کارلو کوپولا نے، اسے "ناولا" قرار دیا ہے۔ اس کے پس منظر میں ان کا ایک اہم ترین مضمون "آرٹ، سیاست اور زندگی" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس ناولٹ میں موت و حیات کے فلسفے کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ممتاز شیریں اس ناولٹ کو ایک طرح کا بھیانک رمزیہ قرار دیتی ہیں۔ طارق رحمان اس ناول کو سرریئلزم کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، جبکہ صفدر میر اسے ایک علامتی کہانی قرار دیتے ہیں،

احمد علی نے انڈونیشیا اور مسلم چائنا کی جن نظموں کو انگریزی کے قالب میں ڈھالا، انھیں مارچ ۱۹۴۹ء میں فرینڈز آف انڈونیشیا ری پبلک سوسائٹی کراچی نے " THE FLAMING EARTH " کے عنوان سے شائع کیا۔ اسی برس ان کی کتاب MUSLIM CHINA شائع ہوئی۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں ان کی معروف کتاب THE FALCON AND THE HUNTED BIRDS۔ شائع ہوئی۔ ۹ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو وہ بلقیس جہاں رؤف علی سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ جنوری ۱۹۵۱ء میں وہ حکومت پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے چین گئے اور سفارتی تعلقات قائم کرنے کے سلسلہ میں اہم پیش رفت کی، چنانچہ حکومتِ پاکستان نے انھیں پیکنگ میں COUNSELLOR CHARGED AFFAIRS نامزد کر دیا۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں، احمد علی حکومتِ پاکستان کی جانب سے رباط کے لئے روانہ ہوئے، جہاں انھیں مراکش کے لئے COUNSELLOR CHARGED AFFAIRS. نامزد کیا گیا تھا۔ جنوری ۱۹۶۰ء میں سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان نے انھیں سرکاری ملازمت کے بندھن سے آزاد کر دیا۔ اسی برس ان کے چینی نظموں کے انگریزی تراجم PURPLE GOLD MOUNTAIN کے عنوان سے شائع ہوئے۔

۱۹۶۴ء میں ان کا دوسرا انگریزی ناول OCEAN OF NIGHT. شائع ہوا۔ یہ ناول لکھنوی تہذیب کے زوال اور کھوکھلے پن کو اجاگر کرتا ہے، اس ناول کو بوجوہ زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ اس ناول کا نظرثانی شدہ ایڈیشن WHEN LOVE IS DEAD. کے عنوان سے اشاعت کا منتظر ہے۔

احمد علی کو غالب اور دوسرے کلاسیکی شعرا سے عشق تھا۔ غالب کو تو وہ اپنا مرشدِ معنوی سمجھتے تھے۔ انھوں نے غالب کی منتخب غزلوں کے انگریزی تراجم GHALIB- SELECTED POEMS کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں روم سے شائع کرائے۔ ۱۹۷۳ء میں ان کی کتاب THE GOLDEN TRADITION (AN ANTHOLOGY OF URDU POETRY میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انھوں نے اردو کے کلاسیکی شعری سرمائے کو جس مہارت اور خوش سلیقگی سے انگریزی کے قالب میں ڈھالا ہے اس کے لئے وہ بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

احمد علی کی زندگی کا اہم ترین کام قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ ہے۔ اس کام کو ایک چیلنج کی حیثیت سے قبول کرتے ہوئے انھوں نے تقریباً دس سال کی محنتِ شاقہ کے بعد ۱۹۸۰ء میں مکمل کیا، اس دوران انھوں نے عربی زبان سے واقفیت حاصل کی اور قرآن مجید کے صحیح مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

۱۹۸۱ء میں بغداد میں منعقد ہونے والے ادیبوں کے اٹھارہویں بین الاقوامی اجلاس میں پروفیسر احمد علی کو پاکستا کی نمائندگی کا اعزاز حاصل ہوا۔ ۱۹۸۱ء ہی میں حکومت پاکستان نے ان کی ملکی خدمات کے صلے میں انھیں "ستارۂ امتیاز" کا اع دیا۔ احمد علی کی بین الاقوامی شناخت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انھیں امریکہ کی ریاست نبراسکا کی اعزازی شہریت دی گئ ۱۹۸۵ء میں ان کا تیسرا اور آخری ناول۔ RATS AND DIPLOMATS شائع ہوا۔ اس ناول میں انھوں نے سفارتی زندگی کے پس منظر میں مکر و فریب کی ان چالوں کو بے نقاب کیا ہے جن کی بدولت بڑی طاقتیں اپنا استحصالی نظا چلاتی ہیں۔ اس ناول میں دنیا کے عمومی انحطاط کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں خصوصاً تیسری دنیا میں بسنے والے ان انسا کا ذکر کیا ہے جو صدیوں سے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اس ناول کا عمومی مزاج طنزیہ ہے اور بعض جگہوں پر یہ طنز نشتریت روپ دھار لیتا ہے۔ احمد علی کے بہت سے تنقیدی مضامین، افسانے، تراجم اور انگریزی نظمیں بین الاقوامی رسالوں کی زینت بنتے رہے ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کی آواز کو بین الاقوامی ایوانوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

وہ ایک معتدل ترقی پسند تھے اور ترقی پسندی کو ایک وسیع تناظر میں دیکھتے تھے۔ انھوں نے سوشلزم کے زوال بہت پہلے نشاندہی کر دی تھی، انھوں نے ترقی پسندی کے نقاب میں چھپی ہوئی انتہا پسند مارکسیت کو پہچان لیا تھا، چنانچہ انھوں نے کو مارکسیت کی عینک سے دیکھنے کی بجائے زندگی کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اسی لئے وہ آخری دم تک ایک سچے ترقی پ فن کار رہے۔

اپنے افسانوی فن کے حوالے سے احمد علی بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنی افسانہ نگاری کی بدول اردو ادب کو اس وقت سماجی شعور اور فکر و نظر سے آشنا کیا جب اردو کا نثری بحیثیت مجموعی خواب و خیال اور جمال آفرینی و پرستی کی فضا میں ڈوبا ہوا تھا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی ہشت پہلو شخصیت کا سحر، فکر و نظر کے جہانِ نو کا تخلیقی پیش خیمہ بن کر ا ادب کی تاریخ میں چراغِ راہ کی حیثیت سے نور پھیلاتا رہے گا۔

انور شعور کی منفرد غزلوں کا پہلا مجموعہ
اندوختہ
زیرِ اہتمام: ڈائلاگ پبلی کیشنز۔ کراچی
تقسیم کار: ویلکم بُک پورٹ، اُردو بازار۔ کراچی

احسان اکبر

اختر حسین جعفری کے لیے

ہوئے آفتاب !
ے سفر کڑے
ے دن بڑے تھے
ے تہِ آب اُن جزیروں کو کھوجنا تھا
ں ابھی روشنی نہ پہنچی تھی
حوادث کو موم کرنا تھا
د کی کِرن کو رَستے میں روکتے تھے
ن سخن تیرا حرفِ سیّال
ے در باب
ی والا استعارہ
بز پا نقش ڈھونڈتا تھا
پا آفتاب !
ں کو خبر ہے
منظرِ اُفق میں
اُداسیوں کی طویل راتیں
خموشیوں کے طویل پہرے
غیابِ حرف و بیاں کے بے مہر سلسلے
تیری رَوشن آواز کو جوازِ کلام دیتے ہیں
لوگ جس کو
ترے ہُنر، فن، ترینہ داری کا نام دیتے ہیں
تیرے سینے کے داغ کا
گرم اِستعارہ ہے
نرم کِرنوں سے
بے ستونِ شبِ اَلَم کاٹنا
جگر داریوں کا قِصّہ تھا
تیرا حِصّہ تھا
اُن دنوں
جب سفر کڑے اور دن بڑے تھے

شجاعت علی راہی

وہ سائباں کہاں گیا!

اُستادِ محترم **ایوب صابر** مرحوم کی یاد میں

سیاہ بادلوں کے پیچھے روشنی کا آسماں
وہ اپنے سر کا سائباں
کہاں گیا
وہ جس کے پاس آگہی کے خواب تھے
گلاب تھے
وہ جس کے حرف تیر تھے، وہ جس کے لفظ صاعقہ
کدھر گیا وہ خوش نوا
وہ سُرمگیں پہاڑ تھا
فضا کی دھند نے جسے چھپا لیا —— نگل لیا
وہ جیسے تھک کے سو گیا تو تیرگی میں کھو گیا
جو افتخارِ خاک تھا، وہ آج رزقِ خاک ہے
کہاں گیا وہ شخص جو عدوئے کج کلاہ تھا
جو اِک پناہ گاہ تھا، فصیل تھا، حصار تھا
بلند کوہسار تھا
وہ ایک شہریار تھا، وہ ایک شہ سوار تھا
وہ شیرِ کارزار تھا، چمکتی ذوالفقار تھا
وہ ایک مرغزار تھا
سراپا زخم زخم تھا مگر سدا بہار تھا
گرجتا آبشار تھا
وہ برف موسموں میں جیسے زندگی کی دھار تھا
وہ آتشِ چنار تھا
وہ برف باریوں کی رُت میں آگ تھا، الاؤ تھا
وہ شہرِ زمہریر تھا، وہ مہرِ زر نگار تھا
مبارزت، مناقشے، نبرد آزمائیاں
لہو نہیں تھا، اُس کے دل میں اک بھڑکتی آگ تھی
وہ سر کشیدہ پیڑ تھا
جھلس کے اپنی ہی تپش میں عُود بن گیا تھا جو
اکیلے ساری زندگی کا زہر پی گیا تھا وہ
وہ شخص کیا گیا کہ جیسے ایک بازو کٹ گیا
یہ دل کا آئینہ ہزار کرچیوں میں بٹ گیا
ہے روح پارہ پارہ جیسے، دل لہولہان ہے
نہ موسموں کے ذائقے
نہ رونقیں، نہ زمزمے
کہاں گیا، وہ مہرباں
کہاں گیا وہ آسماں؟
وہ آسماں کہاں گیا؟

(جدہ)

رضا ہمدانی

نکلے تھے اپنے آپ کو پانے
ہم کو چھوڑا نہ لغزشِ پا نے

زلف و رخسار کے جھمیلوں میں
ڈال رکھا ہے دوش و فردا نے

کر کے فردِ جنوں میں کچھ ترمیم
مطمئن ہو گئے ہیں فرزانے

اتنی سی بات منہ سے نکلی تھی
بن گئے ہیں، ہزار افسانے

خونِ ناحق کبھی نہیں چھپتا
کوئی پہنے، ہزار دستانے

مردہ پیکر سمجھ کے مجھ کو رضاؔ
نہ ہلاؤ مرے جواں شانے

عبداللہ یزدانی

رضا ہمدانی کیلئے ایک نظم

پھُول تھا اور پھول کی مہکار تھا
آدمی تھا اور چمن آثار تھا

اپنے دشمن سے بھی اُس کو پیار تھا
اس کے جینے کا عجب معیار تھا

فکر و فن سب جمع تھے اُس شخص میں
خوُبیوں کا اِک حَسِیں شہکار تھا

دوسروں کا تھا مسیحا، خُود مگر
چشمِ نرگس کی طرح بیمار تھا

وقت کے ہر شمر سے میرا رضاؔ
مرتے دم تک برسرِ پیکار تھا

مجذوب فرنگی ـــــــــ ۵

(بیاد اختر حسین جعفری)

محمد ارشاد

گزشتہ اقساط میں نیطشے کے افکار کے جن گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، علمیات (Epistemology) اور وجودیات (Ontology) سے متعلق ہیں۔ اس کے فلسفے کا یہ حصہ جس قدر پر پیچ اور پریشان کن ہے اسی قدر اہم تر بھی ہے۔ دراصل کسی بھی فلسفی کے فلسفے کا یہی حصہ اس کے مقام اور مرتبے کی تعیین اور اس کی شناخت میں پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

چونکہ بعض ذی فہم اور اہل علم قارئین نے گزشتہ اقساط کے بعض مقامات کے اشکال کی شکایت کی ہے، اور ان کی شکایت بیجا نہیں، اس لیے افہام کی تسہیل کی خاطر بعض امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

علمیات فلسفے کا، بالخصوص ما بعد الطبعیات کا، اہم ترین شعبہ ہے۔ فلسفے کی اس شاخ میں علم، صداقت اور یقین کی نوعیت و ماہیت سے بحث کی جاتی ہے۔ علم کیا ہے؟ آیا علم شے مشابہ بہ شے ہے؟ کیا پہاڑ کا تصور (Idea) پہاڑ کے مشابہ ہے؟ جسامت کے لحاظ سے دونوں مختلف ہیں۔ پہاڑ کا تصور ہمارے سر میں سما سکتا ہے، پہاڑ نہیں سما سکتا۔ مواد (Stuff) کے لحاظ سے بھی دونوں مختلف ہیں۔ پہاڑ مٹی اور پتھر کا بنا ہوا ہے، چوٹیاں اور گھاٹیاں رکھتا ہے۔ پہاڑ کا تصور ان اجزا اور اوصاف پر مشتمل نہیں۔ صورت کے لحاظ سے بھی دونوں مختلف ہیں۔ پہاڑ تین ابعاد رکھتا ہے، ہم اسے دو ابعاد میں دیکھتے ہیں۔ نیز پہاڑ مکان و زمان میں ہے جب کہ اس کا تصور صرف زمان میں۔ زمانی استمرار کے لحاظ سے بھی دونوں مختلف ہیں۔ پہاڑ لاکھوں سال قائم رہ سکتا ہے، اس کا تصور پل دو پل سے زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔

پس ہمارا علم کسی شے کی نوعیت، حقیقت اور ماہیت کو کس حد تک اس شے کو ہم پر عیاں کر سکتا ہے؟ ہمارے ذرائع علم کیا ہیں؟ ان کی اور ان سے حاصل ہونے والے علم کی حدود و ثغور کیا ہیں؟ برٹرینڈ رسل کی (Human Knowledge - Its Scope and Limits) علمیاتی مسائل سے بحث کرتی ہے۔ لیکن اس میں بیان کیا گیا نقطہ نظر صرف برٹرینڈ رسل کا ہے، تمام فلسفیوں کا نہیں۔ ہیوم کی لاادریت (Agnosticism) کانٹ کی مظہریت (Phenomenalogism) بارکلے کی موضوعی تصوریت

(Subjective Idealis ہیگل کی معروضی تصوریت(Objective Idealism) برگساں کی انیت(Intuitionism) ولیم جیمز کی عملیت(Pragmatism) اور برٹرینڈرسل کی بے طرفہ یت (Neutral Monism)، جسے نو واقعیت(Neo - realism) بھی کہا جاتا ہے، علمیاتی مسائل بارے میں ان کی پوزیشنوں کے متفرق نام ہیں۔

وجودیات جن سوالات سے بحث کرتی ہے یہ ہیں۔ ہستی(Extistence) اور وجود(Being) کیا ؟ اس کی نوعیت، حقیقت اور ماہیت کیا ہے؟ خود حقیقت (Reality) کی حقیقت کیا ہے؟ آیا حقیقت نہائی ود ہے؟ اگر ہے تو ہم کیونکر اسے جان سکتے ہیں۔ آیا وجود ایک ہے یا متعدد؟ وجود کن اوصاف سے متصف ؟ جوہر کیا ہے؟ اعراض کیا ہیں؟ علائق کیا ہیں؟ دیکارت کی ثنویت (Dualism) سپینوزا کی بے طرفہ یت (Neutral Monism) دمقراطیس کا مادیت (Materialism) لائب نتز کی یت(Spiritualism) فلاطینوس کی بروزیت(Emanationism) وجودیاتی سوالات کے ات کی نمائندہ مثالیں ہیں۔ یہ مثالیں بھی محض تفہیم مسائل کی خاطر دی گئی ہیں ورنہ علمیاتی اور وجودیاتی ئل باہم پیوست رہتے ہیں۔ برگساں کا فلسفہ، مثال کے طور پر، صرف علمیاتی سوالات کا جواب ہی نہیں، یات اور کونیات(Cosmology) سے بھی بحث کرتا ہے۔

اگر ہم تمام سوالات کو ایک سوال میں ڈھالنا چاہیں تو ہمیں یہ پوچھنا پڑے گا کہ فکر کی ت(Structure of thought) کس حد تک وجود کی ساخت(Structure of being) کی دگی کرتا یا کرسکتا ہے؟ آیا ہم ساخت فکر کو ساخت وجود پر محمول کر سکتے ہیں۔ فلسفہ ما قبل نیطشے کا جواب با اثبات میں ہے۔ سبھی نظام ساز فلسفی، افلاطون و فلاطینوس ہوں یا کانٹ اور ہیگل یا فائر باخ اور کارل س، ذہن کی مادے پر فوقیت کے قائل ہوں یا مادے کی ذہن پر فوقیت کے، ان کی شروعات کسی بھی سمت ہوں اور ترجیحات کسی بھی قسم کی، ساخت فکر اور ساخت وجود میں تفریق کے قائل نہیں رہے۔ فلسفہ ت میں وحدت تلاش کرنے کی کوشش ہے۔

افلاطون کی مثالیت، بارکلے کی تصوریت، دمقراطیس اور مارکس کی مادیت، کثرت میں وحدت کی صورتیں ہیں۔ چاہے ہم ان کو علمیاتی سطح پر رکھیں یا وجودیاتی یا کونیاتی سطح پر۔ مختلف مکاتب فکر ہمیں ر کتنے ہی مختلف نظر کیوں نہ آتے ہوں، بقول نیطشے، ایک ہی سورج کے مدار میں چکر لگا رہے ہیں۔ یہ ج منطق کا یا فکر انسانی کا وہ اصول اول ہے جسے منطق کی زبان میں اصول عینیت Law of Identi) کہا جاتا ہے۔ کسی بھی مکتبہ فکر کے فلسفیوں نے ان اصولوں کی صحت پر آج تک وشبہ کا اظہار نہیں کیا۔ یہ اصول علم انسانی کی بنیاد ہیں۔ اصول عینیت یہ ہے کہ ہر چیز جو کہ وہ ہے، وہی جو کہ وہ ہے۔ کسی بھی چیز پر ان گنت تغیرات و حوادث گزر سکتے ہیں اور اس میں ہر طرح کی تبدیلیاں پیدا کتے ہیں لیکن اس کے باوصف جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ تبدیلیاں فلاں چیز میں رونما ہوئی ہیں تو ہمارے ایسا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے جو جملہ تبدیلیوں سے گزری ہے نہ کوئی اور چیز۔ گویا اس چیز نے

جملہ تبدیلیوں کے باوصف اپنی عینیت برقرار رکھی ہے۔ اصول مانع اور اجتماع نقیضین یہ ہے کہ کوئی چیز بیک وقت دو متناقض صفات، مثلاً وجود و عدم، کی حامل نہیں ہو سکتی اور اصول خارج الاوسط یہ ہے کہ کوئی چیز دو متناقض (Contradictory) صفات میں سے یا تو ایک کی بیک وقت حامل ہو گی یا دوسری کی۔ منطق کے ان اصولوں کو بدیہی (Self -evident) اور قبل مشاہدہ (a priori) سمجھا جاتا ہے۔ انہیں مشاہدے سے اخذ نہیں کیا جاتا جیسے دیگر سائنسی قوانین اخذ کیے جاتے ہیں۔ دیگر تمام قوانین مشاہدے پر مبنی ہیں اور مشاہدہ ان اصول ثلاثہ پر مبنی رہے۔

اگر یہاں تک میرا بیان واضح ہے اور میں یہی گمان کرتا ہوں کہ واضح ہے، تو پھر، نیطشے کے حوالے سے یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دوام و خلود نیز کثرت میں وحدت کی طلب کی بنیاد منطق یا فکر انسانی کا یہی اصول اول یعنی اصول عینیت ہے۔ خواہ یہ دوام و خلود، مادی ہو یا روحانی اور وحدت کی نوعیت بھی مادی ہو یا روحانی۔ اسی طرح نمود(Appearance) اور حقیقت(Reality) مادے اور ذہن، جسم و روح، شے (Phenomena) اور شے فی نفسہ (Noumena) کا فرق و امتیاز بھی اسی بنیاد پر قائم ہے۔

نیطشے پہلا فلسفی ہے جس نے علم انسانی کی ان بنیادوں کو چیلنج کیا ہے۔ گزشتہ اقساط ان بنیادوں پر نیطشے کے اعتراضات کی تفصیل ہیں، چنانچہ اس کے بقول منطق اور ریاضی (Applied logic) کی بنیاد ان مفروضوں پر ہے جن کی تصدیق موجود عالم سے نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ مفروضے جنہیں ہم منطق اور ریاضی کے بدیہی اصول اور بنیادی سچائیاں خیال کرتے ہیں اور کسی بھی سچائی کو سچائی ماننے کے لیے ان اصولوں سے مطابقت ضروری ٹھہراتے ہیں، وہ بنیادی مفروضے زندگی کے تحفظ اور بقا اور نشرو شیوع کے لیے ضروری تھے۔ انسان کو ذہن کائنات کا معمہ حل کرنے کے لیے نہیں دیا گیا بلکہ اس کا مقصد حیاتیاتی ہے۔ منطق اور ریاضی کے بدیہات اور یقینیات ہمارے سوچنے کے اس انداز کا نتیجہ ہیں جو حیاتیاتی لحاظ سے ضروری تھا۔ اگر انسان سوچنے کا مختلف انداز اختیار کرتا تو نوع انسانی کبھی کی ناپید ہو چکی ہوتی۔ نوع انسانی کی بقا اور تحفظ کے لیے یہ باور کرنا ضروری تھا کہ اشیاء تمام تر تبدیلیوں، تغیرات اور حوادث کے باوصف اپنی عینیت (Identity) نہیں کھوتیں، اور یہ کہ کثرت میں وحدت پائی جاتی ہے، اور یہ کہ اشیا اور اجسام جیسی کہ وہ ہیں ویسی ہی موجود ہیں اور یہ کہ ہمارا ارادہ آزاد ہے اور یہ کہ جو میرے لیے خیر ہے فی نفسہ خیر ہے۔ یہ عقائد نامہ جو علمی لحاظ سے نادرست ہے ہمیں نسل در نسل منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، ہمارے نظامہائے افکار کی بنیاد ہے......... ایسا لگتا ہے کہ نسل انسانی سچائی(یہ کہ یہ عقائد نامہ جھوٹ ہے) کے ساتھ منافقت و مطابقت پیدا کرکے زندگی گزارنے کے قابل نہیں تھی۔ انسانی عضویے نے، اس کے حواس اور حیات نے، چند بنیادی غلطیوں سے مطابقت اور موافقت پیدا کرلی تھی۔ گویا سچ نام ٹھہرا ہر اس بات کا جو زندگی کے تحفظ اور بقا میں ممد ومعاون تھی۔ اس کے برعکس جو کچھ تھا ناسچ تھا۔ ہم نے ان اکاذیب کو، جو منطق اور ریاضی کی بنیادیں ہیں، اور جن کا مقصد زندگی کی بقا اور تحفظ تھا، نظام افکار کی بنیاد بنالیا اور کائنات کا معمہ حل کرنے لگ گئے، حالانکہ ان کی اہمیت حیاتیاتی تھی اور ان پر مبنی سوچ یا ان کے مطابق سوچ کی اہمیت بھی صرف اور

اسی قدر تھی۔ پس انسان کا یہ عقیدہ کہ اشیا تبدیلیوں کے باوصف وہی ہیں جو کہ وہ ہیں (اصول ت) اور یہ کہ کثرت میں وحدت پائی جاتی ہے اور یہ کہ انسان فاعل مختار ہے اور ارادے کی آزادی رکھتا ، اگر درست باور نہ کیے جاتے اور ان پر مبنی استدلال کی صحت میں انسان یقین نہ رکھتا تو اپنی زندگی کو ت میں ڈال لیتا۔ یہ عقائد زندگی کو لاحق خطرات سے بچاؤ اور خوراک کے حصول کے لیے ضروری تھے۔ ان عقائد کو بنیاد بنا کر کائنات کا معمہ حل کرنے کی کوشش لایعنی عمل ہے۔ یہی وہ غلطیاں ہیں جو نہ ہمارے علم پر اثر انداز رہی ہیں بلکہ ہمارے علم کی نہج اور رخ بھی متعین کرتی رہی ہیں۔ پس ہمارے ں طاقت اور قبولیت کا دارومدار سچائی (یہ کہ ہماری بدیہات اور یقینیات ناچ ہیں) اور سچائی کے مدارج بن، بلکہ اس سچائی کے علم کی قدامت پر، اس کے اس کردار پر ہے کہ وہ کس حد تک زندگی کے تحفظ اور ر ترویج کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

نیٹشے اگرچہ پہلا آدمی نہیں ہے جس نے علم انسانی کی ان بنیادوں کو اکاذیب ٹھہرایا ہے، اس سے یونان کے الیاطی (Eleatic) فلاسفہ بھی ان بنیادوں میں شک کو راہ دے چکے ہیں لیکن نیٹشے کے بقول ں نے اس خیال کے باوجود کہ ان غلطیوں سے بچ کر بھی زندگی گزاری جاسکتی ہے، اپنے آپ کو ایک نئی کے سپرد کردیا۔ "انہوں نے ایک ایسے صاحب عرفان کو وضع کرلیا جو تغیرپذیری اور تعین و تشخص سے قلی ادراک کا مالک اور اس علم کے برعکس علم کا حامل ہے جسے اب تک علم کہا جاتا رہا ہے۔ وہ اس علم کو ں حیات ٹھہرانے لگ گئے۔" یہ ایک ایسی ٹھوکر تھی جس سے وہ اپنے آپ کو بچا نہیں سکے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر علم و افکار انسانی کی محولہ بنیادیں اکاذیب ہیں اور یہ اکاذیب تی مقاصد پورے کرتے تھے تو آیا یہ سچ اور علم کہ علم و افکار انسانی کی محولہ بنیادیں اکاذیب ہیں اب علمی سے اور حیاتیاتی اعتبار سے کس قدر و قیمت کی حامل ہیں؟ آیا اس سچ کو علم انسانی کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے اس بنیاد پر فلسفے کی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے۔ نیٹشے کا جواب ہاں میں ہے اور اس کا فلسفہ اسی بنیاد پر ہے۔ لیکن اس بنیاد پر فلسفے کی جو عمارت اس نے کھڑی کرنے کی کوشش کی ہے اس کے تمام نقوش ں طرح واضح نہیں۔ پہلے سوال کا جواب وہ یوں دیتا ہے کہ اب "علم بجائے خود زندگی کا حصہ ٹھہر چکا ہے ں قدرت (Power) میں مسلسل طور پر اضافہ کناں ہے۔ حتیٰ کہ علم اور وہ بنیادی غلطیاں (جو علم انسانی یاد رہی ہیں) جو زندگی کی محافظ اور معاون تھیں، بالآخر ایک شخص (فلسفی اس مفہوم میں جس میں خود فلسفی ہے، نہ کہ کانٹ اور ہیگل وغیرہ) میں حیات کی صورت میں، قدرت کی صورت میں، باہمہ گر صف ہو چکی ہیں۔ مفکر وہ شخص ہے جس کے اندر سچائی (نیٹشے کے مفہوم میں) کی حاجت اور زندگی کو تحفظ والی غلطیاں جنہیں سچائیاں سمجھا جاتا چلا آرہا ہے اور علم انسانی کی بنیاد باور کی جاتی رہی ہیں) اپنی پہلی لڑ رہی ہیں۔ اس لیے کہ سچائی (بمفہوم نیٹشے) نے بھی بنیادی غلطیوں کی طرح اپنے آپ کو زندگی کو دینے والی طاقت ثابت کردیا ہے۔ اس باہمی پیکار کے نتیجے کا انحصار اس بات پر ہے کہ سچائی زندگی میں حد تک شمولیت حاصل کرسکتی ہے۔"

نیطشے چونکہ علم و فکر انسانی کی محولہ بنیادوں کو اکاذیب سمجھتا ہے اور کثرت میں وحدت کے عقیدے کو حیاتیاتی ضرورت، اس لیے اس کا اپنا فلسفہ کثرت میں وحدت کی طلب و تلاش نہیں۔ اس لیے اس نے جو پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے وہ بھی اس وصف وحدت سے عاری ہے۔ پس نہ اس کے افکار میں وہ وحدت موجود ہے جو کارل مارکس تک کے افکار میں پائی جاتی ہے اور نہ اس کے پیرایۂ بیان میں وہ وحدت موجود ہے، جو فلسفہ ماقبل نیطشے کی پہچان رہا ہے۔ جب تک ہم ان نکات کو پیش نظر نہیں رکھیں گے، اس کے بارے میں الجھن کا شکار رہیں گے۔

چونکہ فلسفیانہ کی بنیاد ایک غیر متغیر حقیقت اور غیر متبدل سچائی کے تصور پر چلی آرہی ہے، اور نیطشے کے نزدیک، حقیقت اور صداقت کے ان تصورات کی بنیاد اصول عینیت پر ہے، اور اصول عینیت کسی مطلق سچائی پر مبنی نہیں، بلکہ اس میں یقین نوع انسانی کی حیاتیاتی ضرورت ہے، اس لیے عالم ظاہری اور عالم حقیقی کی تقسیم جو اس عقیدے کا شاخسانہ ہے، واہمہ ہے۔ یہ عالم ظاہری ہی حقیقی عالم ہے۔ وہ صفات جو مزعومہ عالم حقیقی کی بیان کی جاتی ہیں، لاشے کی صفات ہیں۔ نمود (Appearance) اور حقیقت (Reality) باہم متناقض نہیں۔ مزعومہ عالم حقیقی اخلا تبصری (Moral - optical illusion) التباس ہے۔ یہ موجودہ زندگی سے بیزاری، اس کی بے قدری اور اس کے بارے میں بیجا الزام تراشی کا نتیجہ ہے۔ ہم موجودہ زندگی سے بدلہ چاہ رہے ہوتے ہیں، اس سے بہتر زندگی کی صورت میں۔

ہرچند نیطشے نمود اور حقیقت میں دوئی اور غیریت کا قائل نہیں اور وہ عالم ظاہری ہی کو حقیقی عالم سمجھتا ہے لیکن وہ مادئین فلاسفہ کی طرح یہ عقیدہ نہیں رکھتا، کہ اس عالم ظاہری کی "حقیقت" ہم پر منکشف ہو سکتی ہے۔ اس کائنات کے بارے میں ہمارا علم محض ترجمانی ہے جو ایک خاص منظر (Perspective) کے حوالے سے ہے۔ کائنات کو لا متناہی مناظر کے حوالے سے جانا جاسکتا ہے لیکن خدا کی نظر سے (God's eye view) کائنات کو دیکھنا انسان کے لیے ممکن نہیں۔ ہم کائنات کی ماہیت سے اسی صورت آگاہ ہو سکتے ہیں۔ جب لامتناہی مناظر سے اس پر نظر ڈال سکیں اور لامتناہی مناظر سے اس پر نظر ڈالنا ممکن نہیں۔

نیطشے اپنے سے پہلے کے فلسفیوں کو فلسفی نہیں مانتا، انہیں مزدوران فلسفہ کہتا ہے، ان کی اور ان افکار کی اہمیت اس کے نزدیک صرف اس قدر ہے کہ ان کی عمارتوں کو ڈھا دینے کے بعد ان کا ملبہ فلسفے کی عمارت اٹھانے کے لیے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ یہ نیا فلسفہ جس کے خطوط پوری طرح واضح نہیں، حیاتیا اکساہٹوں اور عضویاتی ضرورتوں سے بالاتر فلسفہ ہو گا۔ کائنات کو ایک نئے اور مختلف طریقے سے سمجھنے ایک کوشش ہو گا۔ لیکن ان تحفظات کے ساتھ کائنات کے بارے میں ہمارا علم، مطلق عل (Absolute Knowledge) نہیں ہو گا۔ "ہمیں اس خطرناک 'قدیم' خود ساختہ عقیدے سے بچ کر ر ہو گا جس کی رو سے جاننے والے (Knowing subject) کو بے لوث، ورائے زمان اور انتھک فرض کر جاتا ہے۔ ہمیں عقل خالص (Pure reason)، روحانیت مطلقہ (Absolute spirituality) اور علم

ہ (Knowledge in itself) کے جال سے بھی بچنا ہوگا۔ کیونکہ یہ چیزیں ہم سے اس بات کی خواہاں ں کہ ہم ایک ایسی آنکھ کے بارے میں سوچیں جو ہماری سوچ کی حدود ہی سے باہر ہے۔ ایک ایسی آنکھ جو ی سمت نہ پڑے اور فعال اور مترجم قویٰ سے محروم ہو، درآں حالیکہ دیکھنا ہمیشہ کسی سمت سے کسی سمت ں ہوتا ہے اور نظر کسی خاص منظر (Perspective) ہی سے پڑتی ہے" Geneology of morals. III 1) کسی چیز پر جس قدر زیادہ مناظر سے نظر ڈالی جائے گی اس کا تصور ی واضح اور معروضیت سے قریب تر ہوگا۔ "سائنسی طرز فکر کے پیچھے بہت سی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ تمام قوتیں الگ الگ دریافت ہوئیں، عمل میں لائی گئیں اور مرتقی ہوئیں۔ ان کی یکجائی نے اس طرز کو غ دیا جو سائنسی طرز فکر کہلاتا ہے سائنسی طرز فکر میں ہر قوت دوسری قوت کو اس حد سے باہر نہیں نکلنے ں۔ حتی کہ اب بھی وہ وقت بہت دور دکھائی دیتا ہے جب فنکارانہ توانائیاں (Artistic energies) اور رگی کی عملی دانائی، سائنسی طرز فکر کے ساتھ مل کر ایک ایسے برتر Organic system پر منتج ہوگی جس ، حوالے سے سکالر (گزشتہ فلسفی) اطبا (فزیشنز)، فنکار اور مقنن، جیسا کہ ہم انہیں اس وقت (ایک دوسرے ، ممتاز و مختلف) جانتے ہیں۔ قصہ پارینہ ہوں گے اور ماضی کے آثار" (G.S. 113) پس نیطشے کے نزدیک تقبل میں فلسفہ، جملہ انسانی علوم و فنون، ہر دو کو محیط ہوگا۔ وہ مختلف مناظر سے کائنات پر نظر ڈالے گا۔

ان باتوں میں سے بعض باتیں مجھے پہلے کہنی چاہییے تھیں اور بعض باتیں بعد میں لیکن نیطشے کے ار کی تفہیم میں اس پس منظر کو بیان کرنا بہت ضروری ہے جس میں وہ بات کہہ رہا ہے۔ زیر نظر مضمون جو شبہ کئی اقساط پر مشتمل ہے، کا پلان میرے سامنے تو واضح ہے، لیکن قارئین کو بھی اس سے آگاہ کرنا نہایت روری تھا۔

فلسفہ یوں تو کئی بلکہ بے شمار موضوعات کو محیط ہے لیکن کسی فلسفی کے افکار کے بیان میں تین امور پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک علمیات کے بارے میں اس کا نقطہ نظر، دوسرے وجودیات کے بارے ں اس کا نظریہ، تیسرے قدریات (Axiology، اخلاقیات، جمالیات وغیرہ) کے باب میں اس کی آراء۔ ر نظر مضمون میں یہی ترتیب ملحوظ نظر ہے۔ اس ترتیب کو ملحوظ رکھنے کی وجہ ایک اور بھی ہے۔ ینڈرسل کا نیطشے کے بارے میں کہنا ہے کہ

Nietzsche' though a professor was a litrary
rather than an academic philosopher.
He invented no new technical theories in ontology
and epistemology. His importance is primarily
in ethics and secondly as an acute historical critic.

آج یورپ تو کیا، برطانیہ میں بھی فلسفیانہ حلقوں میں نیطشے کے بارے میں رسل کے بیان سے کوئی ق نہیں رکھتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نیطشے نے فلسفیانہ مسائل پر فلسفیانہ اسلوب، جس کی نیطشے سے

رسل کو توقع تھی، اختیار نہیں کیا اور وہ اکیڈمک فلسفی یقیناً نہیں۔ اگر یہ سوال کیا جائے علمیاتی مسائل
برٹرینڈ رسل کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے لیے رسل کو کونسی کتابیں دیکھی جائیں تو ہم رسل کی "علم انسا
کے علاوہ "مسائل فلسفہ" کا نام لے سکتے ہیں۔ یہی سوال اگر نیطشے کے بارے میں کیا جائے تو ہم اس کی
خاص کتاب کا نام نہیں لے سکتے تاہم ایسا بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس نے علمیاتی مسائل کے بارے میں گفتگو
نہ کی ہو۔ یہ گفتگو اس کی جملہ تصانیف میں بکھری ہوتی ہے۔ اور ان میں بعض ایسے مسائل کی بھی نشاندہ
ہے جن کی اس سے پہلے کسی کو خبر تک نہ تھی۔ الفاظ اور معانی، نشانات اور علامات میں تفتیش و تحقیق
ضرورت سے سب سے پہلے اسی نے آگاہ کیا ہے اور اس طرح ہمعصر فلسفے کی ایک نئی شاخ mantics
وجود میں آتی ہے اور جس پر خود رسل کی ایک کتاب inquriy into Meaning and Truth
موجود ہے، نیطشے کا فیض ہے۔ اسی طرح دیکارت کے اس قول میں سوچتا ہوں پس میں ہوں، کا تجزیہ ر
نے بھی وہی کیا ہے جو نیطشے نے کیا ہے۔ ان مثالوں میں ضرورت پڑنے پر مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ افلا
کی وہ تصانیف جن میں اس نے فلسفیانہ اسلوب بیان اختیار کیا ہے، اور اکیڈمک فلسفی کی حیثیت سے لکھا
ناپید ہیں۔ ان کے نام تک کسی کو معلوم نہیں۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اکیڈمک فلسفی کی حیثیت سے اس
کوئی کتاب لکھی بھی ہے یا نہیں۔ اس کے مکالمات جو عالمگیر شہرت رکھتے ہیں، ادبی شہکار ہیں اور تمام و
موجود ہیں۔ ان مکالمات کا اسلوب بیان فلسفیانہ نہیں شاعرانہ ہے۔ فلسفے میں شاعرانہ اسلوب عیب ہے
نہیں۔ افلاطون ہمیشہ ان مواقع پر استعارے استعمال کرتا ہے جہاں ان کی سرے سے ضرورت نہیں ہوتی
اساطیر لے آتا ہے۔ استعارے اور اساطیر ابہام پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افلاطون کا نقطۂ نظر ٹھیک
معلوم کرنا دشوار رہا ہے۔ اس کے موقف تک رسائی حاصل کرنے میں صدیوں محنت صرف ہوئی ہے۔
اسلوب بیان کے باوصف افلاطون فلسفیوں کی صف میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اگر افلاطون کے افک
ارسطو کی تنقید موجود نہ ہوتی تو شاید ہم اس کے افکار سے اس کے اسلوب بیان کی بنا پر ناواقف رہتے۔
برآں کسی بھی مسئلے پر افلاطون کے موقف سے مکمل آگاہی اس کے کسی ایک مکالمے کے حوالے سے
نہیں۔ ایک سے زیادہ مکالمات دیکھنے کی احتیاج ہمیشہ رہے گی۔ نیطشے کا اسلوب اس کے افکار سے لگا
ہے۔ اس کا اسلوب اس کے فلسفیانہ موقف کے عین مطابق ہے۔ جس طرح علم انسانی میں اس کے نز
وحدت مفقود ہے اسی طرح اس کے بیان میں مفقود ہے۔ نیطشے کے پاس، اس میں کوئی شک نہیں کہ،
اور وجودیاتی سوالات کے اس طرح کے حتمی جوابات موجود نہیں جن کی رسل کو اس سے توقع ہے۔
رسل نے اپنی کاوشوں کی مثال کچھوے کو ہاتھی پر سوار کرنے سے دی ہے۔

نیطشے نے ان خطوط کو ضرور واضح کیا ہے جن پر علمیات اور وجودیات کی عمارت کھڑی کی
ہے۔ وہ مختلف مناظر کی بات کرتا ہے اور جب بات مختلف اور لاتعداد مناظر کی ہو تو عملیات اور وجودیا
کوئی ٹیکنیکل نظریہ جو تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہو ممکن نہیں رہتا۔ اگر نظریے سے مراد اس طرح کا
ہو جو رسل نے پیش کیا ہے۔ نیطشے کے نظریات اس پہلو سے ٹیکنیکل ہیں کہ وہ اس تکنیک کی طرف

کرتے ہیں جو خود اس نے علمیاتی اور وجودیاتی مسائل کی تفہیم میں اختیار کی ہے، اگرچہ یہ ٹکنیک بیک جنبش ہم پر جملہ مسائل کا حل پیش نہیں کرتی لیکن سوچ کی، فکر کی نئی بنیادی ضرور فراہم کرتی ہے۔ نئی راہوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ وہ راہیں جو اس سے پہلے کسی نے طے نہیں کیں۔

نیٹشے اس علم کو علم نہیں مانتا جسے دنیا علم کہتی آئی ہے۔ اس کے نزدیک یہ علم نہیں تعبیر(Interpretation) ہے۔ ہمارے تمام نظامہائے افکار، مثالیت، تصوریت، مادیت، تعبیریں ہیں۔ ایک تعبیر دوسری تعبیر سے بہتر ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ خیال کہ کوئی ایک تعبیر مکمل اور درست تعبیر ہے، نیٹشے کے نزدیک واہمہ ہے۔ اس کے نزدیک جدید سائنس اور سائنسی انداز فکر بھی صرف ایک منظر(Perspective) سے نظر ڈالتا ہے اور مفروضے پر مبنی ہے۔ ایک ایسے مفروضے پر جس کی بنیاد ناقص ہے۔ "یہ عقیدہ جو آج کل بہت سے مادیت پرست سائنس دانوں کے لیے موجب اطمینان ہے، ایک ایسی کائنات میں عقیدہ ہے جس کے بارے میں یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ یہ فکر انسانی کے مساوی ہے، اور اسے انسانی فکر اور انسانی اقدار گری (Valuation) سے ناپا تولا جاسکتا ہے........گویا دنیا کی واحد قابل جواز تعبیر وہ تعبیر ہونی چاہیے جو گننے، حساب کرنے، ناپنے تولنے، دیکھنے، چھونے کی اجازت دیتی ہو، کسی اور بات کی نہیں۔ یہ اجڈپن بھی ہے اور بھولپن بھی۔"[1] (Gay science 313)

نیٹشے کے نزدیک یہی حال مسیحی مفکرین کا بھی رہا ہے جن کے خیال میں صرف خدا حق ہے (God is Truth) باقی سب باطل ہے(All is false)۔ نیٹشے کو ان تعبیروں کی عملی سچائی (Pragmatic Truth) سے انکار نہیں۔ وہ ان کی مطلق سچائی کا منکر ہے عملی سچائی سے اس کی مراد حیاتیاتی افادیت ہے۔ ولیم جیمز کے فلسفے کا تخم نیٹشے کا فراہم کردہ ہے۔ (باقی)

---

(1) رینے گینوں کی The Reign of Quantity اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ م۔ ا

مسعود مفتی کی دو نئی کتابیں
ہم نفس: (رپوتاژ) مشرقی پاکستان میں
پر شور اقلیت کے ہاتھوں خاموش
اکثریت کی شکست کی داستان
سالگرہ: (افسانے) روایت سے الجھنے والی
سوچ کی گونج
ناشر: فیروز سنز، لاہور

پانچ جدید شاعر ــــ ایک خط

ساقی فارو

پیارے بھائی اور دوست حمید نسیم۔ آپکی مذہبی کتابوں کو تو خیر میں نے دیکھا ہی نہیں مگر آپکے میرے مشترک دوستوں کا کہنا ہے کہ ان میں آپ معرفت، حلم، علم کلام اور تحیر کی عجیب عجیب منزلوں گزرے ہیں۔ اب رہیں آپکی ادبی کتابیں (آپ بیتی، مضامین، شاعری) تو آپکے دو خطوط کے مطابق وہ نے پچھلے سال مجھے بھیجیں بلکہ بجوائیں بھی مگر ضیا جالندھری صاحب کے سدھائے ہوئے ڈاکیوں نے وہ چ مجھ تک نہیں پہنچنے دیں کہ مبادا میں استفادہ کر لوں۔ مگر اس بار ضیا جالندھری آئے تو "پانچ جدید شاعر"[1] جلانے کے لیے لیتے آئے سو چند سطریں اس کتاب کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ میرے دل میں آپ کی محبت بسی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی۔ وہ ہے آپ کی عزت۔ یہ صرف اس لیے نہیں کہ آپ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں بلکہ یہ عزت نے کمائی ہے ان پچیس تیس غزلوں کی وجہ سے جو آپ نے ۵۸ء اور ۶۳ء کے درمیان لکھیں۔ (افسور تازہ غزلوں میں آپ وہ Vivacious Exuberance قائم نہ رکھ سکے۔ مگر اس پر بات آپکی غ کی کتاب پڑھ کر تفصیل سے کروں گا۔ آج اس کا موقع نہیں۔)

"پانچ جدید شاعر" میں آپکا علم، فراست، زبان و بیان پر آپکا کنٹرول، لغت، مغرب و مشرق و ما حال سے آگاہی، جمالیات سے آشنائی اور سب سے بڑھ کر آپکی نثر کی روانی---- ایسی چیزیں ہیں ک جیسا کٹر قاری بھی آپ کو سلام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

روزنامہ "جنگ" کے ذریعے میں الطاف گوہر کی ایک رائے سے واقف ہوں۔ آپ کو دکھی کی ضرورت نہیں کہ جہاں تک ادب کا تعلق ہے وہ ایک Dead Duck ہیں۔ (مگر میں ادب کے زیادتی کروں گا اگر ایک ہی سانس میں یہ نہ کہہ دوں کہ میراجی سمیت انکے دو مضامین ایسے ہیں جن مر رہنے کی بو باس ہے)

---

[1] پانچ جدید شاعر: مصنف حمید نسیم، قیمت ۱۳۰ روپے۔ ناشر: فضلی سنز لیمیٹڈ، کراچی۔

اصل میں قصہ یہ ہے کہ الطاف گوہر میں اور آپ میں ایک چیز مشترک ہے۔ ۳۰ برس تک "ادب باہر" رہنا اور آخری وقت میں ادب میں داخلے کی کوشش۔ "روٹی پلانٹ" ہو کہ "P.I.A کا طائفہ" اصل میں دونوں ایک ہیں۔ (بلکہ بقول شخصے قید و حیات و بند و غم اصل میں چاروں ایک ہیں) آپ دونوں "رزق نکالے" کے بعد مذہب سے محبت اور عاقبت سے منافقت کرتے نظر آتے ہیں۔ لاریب کہ یہ ایک اسلامی مسئلہ ہے۔

میراجی، فیض اور راشد پر پچاسوں مضامین لکھے جاچکے ہیں اور لکھے جائیں گے کہ وہ تینوں اقبال کے بعد جدید شاعری کے سب سے اہم ستون ہیں۔ آپ چونکہ اس زمانے میں اللہ کے طلسم میں گرفتار تھے اس لیے شاید آپ کے علم میں نہ ہو کہ ان تینوں کو ایک ساتھ نتھی کرنے کا فریضہ میں نے انجام دیا تھا۔ ۳۰، ۳۵ سال پہلے۔ گواہ ضیا جالندھری اور مشفق خواجہ اور ۱۹۶۱ء کا "نیا دور"۔ آفتاب احمد کو مجھ سے شکایت ہونی چاہیے نہ کہ آپ سے کہ میں وہ پہلا آدمی ہوں جس نے "میرے بھی ہیں کچھ خواب" کو مارٹن لوتھر کنگ کی تقریر کا ماخذ بتایا تھا۔ (۱۹۶۱ء)۔ حوالے کے لیے میری کتاب "بازگشت و بازیافت" کافی ہے جو مشفق نے ۷ سال پہلے شائع کی اور ضیا جالندھری نے آپکو پڑھوائی۔

راشد اور فیض پر آپکے مضامین نہایت خوبصورت ہیں مگر ان مضامین میں گاہے گاہے آپ ان کے بارے میں اس طرح گفتگو کرتے ہیں جیسے وہ آپ کے برخوردار تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ ان کے برخوردار ہیں اور رہیں گے۔

میراجی والا مضمون آپکی شریعت کے خلاف ہے۔ اندر سے آپکا جمالی شاعر انہیں ناپسند کرتا ہے مگر میراجی کا زبان و بیان کے جھول کے باوجود، اہم ہو جانا ایسا کرشمہ ہے کہ آپ بھی انکی متابعت کرتے نظر آتے ہیں (کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا) ممکن ہے کہ آپ ضیا جالندھری کی رائے سے متاثر ہوگئے ہوں۔ یا اپنے دشمن الطاف گوہر کی رائے سے یا میری رائے سے۔ (یاد رکھئے کہ میرا "میں" آپ کے "میں" سے کم نہیں)۔ ثالث اپنے اعجاز بٹالوی۔ اگر وہ میرے "دعویٰ" کو رد کر دیں گے تو میں شکست قبول کر لوں گا کہ میں ان کا مرید ہوں۔

ضیاء جالندھری کو میں (غزل اور نظم دونوں وجوہات کے باعث) مدنی سے اہم شاعر سمجھتا ہوں مگر "پانچ جدید شاعر" میں ضیاء بھی نہیں آتے کہ اختر الایمان، مجید امجد، ناصر کاظمی، یہاں تک کہ منیر نیازی تک نے زبان و بیان کے الجھاوے کے باوجود (ناصر کو چھوڑ کے) نہ جانے کیا کرتب دکھایا ہے کہ جدید اردو شاعری میں معتبر ٹھہرے ہیں۔ ان کا اعتبار کب تک رہے گا، یہ نہیں معلوم۔ نہ جانے کون سا جادو ہے جو شاعروں کو اہمیت دیتا ہے۔ میراجی نے اپنی تمام خامیوں کے باوجود اپنا مقام کیوں بنایا، یہ خدا کو ہی معلوم ہے مگر
He is There

مدنی والے مضمون میں آپکی محبت اس طرح پھوٹی ہے کہ آپ کی انگلیاں چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ مدنی کی غزل کو آپ نے جس طرح اٹھایا ہے وہ اسکی اس سے بھی زیادہ مستحق تھی۔ خوش رہیے۔ وہ کمال کے

اور ضیاء سے بڑے غزل گو تھے۔ انکی نظم پر آپ بڑھوتی میں ایمان لائے۔ مگر خیالات اور علم اور ٹیکنالوجی شاعری نہیں ہیں۔ خیالات اگلنے، علم بگھارنے اور ٹیکنالوجی کی اصطلاحات اختیار کرنے سے نظم نہیں بنتی بلکہ ان تمام چیزوں کو اپنی ذات میں اتار لینے کے بعد تمام تر جمالیات کے ساتھ ان کا اظہار نظم کے مصرعوں کو سیال اور سریع الحرکت کرتا ہے۔ مدنی ۵ یا ۷ نظموں میں کامیاب ہیں، بقیوں میں منجمد۔ (یہ سب میں اس بنگلوری محمود ایاز کے رسالے میں ۲ سال پہلے لکھ چکا ہوں، آپ نے بھی پڑھ لیا ہوگا۔ اس پر یاد آیا کہ اس نے ۳۰ سال پہلے یوسف ظفر پر میرا ایک مضمون اپنے نام سے چھاپ دیا تھا اور مجھ سے یہ کہا کہ "کاتب" سے غلطی ہوگئی مگر اس کی تصحیح آج تک نہیں کی) ضیا کا علم اور فکر انکے ہر مصرعے میں رچابسا ہوتا ہے مگر کیا مجال ہے کہ بہاؤ کو ذرا سی بھی ٹھیس لگے۔ وہ آٹھ دس سال تک ٹی وی کی صحافت اور "نوکر شاہی" کی لعنت میں مبتلا رہے جو انکی شخصیت پر داغ ہے مگر اپنے درویشانہ مزاج کے باعث وہ ہمیشہ ادب کے مرکزی دھارے میں بہتے رہے اور جبریہ خاموشی کے بعد واپس آئے تو مصرعہ وہاں سے اٹھایا جہاں چھوڑا تھا بلکہ نظم ہو کہ غزل، دونوں کی تہہ داری بڑھ گئی ہے۔ دو چار باتیں اور۔ نقاد کو اس پر ناز نہیں کرنا چاہیے کہ وہ تیس سال تک "ادب باہر" رہا اس لیے اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ اس درمیان کیا ہوتا رہا۔ یہ فخر کا نہیں بلکہ شرمندگی ک مقام ہے۔

مذہب کی طرف آپکی مراجعت سے میں سمجھتا تھا کہ آپ نے "میں" کو دفن کر دیا ہوگا مگر کتاب میر گاہے گاہے عزیزی قمر جمیل، عزیزی ہمدانی بلکہ بیٹی شفقت تک (کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اس رشتے سے ظ جالندھری آپ کے داماد ٹھہرے) دیکھ کر رنجور ہوا ("میں" کو مجھ جیسے غیر مذہبی چنگیزیوں کے لیے چھو دیجئے) شعری تنقید میں بڑائی "عمر رسیدہ" ہونے کی وجہ سے نہیں "شعر رسیدہ" ہونے کی وجہ سے آتی ہے کتاب کا سب سے بڑا سقم اس کا سیاق و سباق والا المیہ ہے یعنی Point of reference کہ یہ ان پا شاعروں پر ہے جو اقبال کے بعد آئے اور اپنی غزل کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی نظم کی وجہ سے جدید ہیں سعدی، حافظ، قتیل، صائب، نظیری، کو ان لوگوں نے نیو کے طور پر ضرور استعمال کیا مگر ان شعرا کا اصل حوا پونڈ، ملارے، کافکا، جوائس، ایلیٹ، رانبو، پارا، نرودا، لارنس، آڈن بلکہ تھامس اور لارکن تک ہیں۔

مگر فی الحال ان باتوں کو بھول جائیے اور مجھے کہنے دیجئے کہ آپ کی لگن، محنت، دوربینی، علم (افسو کہ حلم نہیں) نظموں کی کلید کی فراہمی (Unlocking the text) ایسی خوبیاں ہیں جو کتاب کو معتبر بنا ہیں اور نظم کی تنقید میں اضافہ ہیں۔ پہلے تین شاعروں کے مقام سے صد فی صد متفق ہوں مگر ضیا اور مدنی مقامات کے تعین میں آپ نے عجلت سے کام لیا ہے۔ آپ افضل التفضیل کا صیغہ استعمال کرنے میں نہایہ سخاوت سے کام لیتے ہیں مثلاً اپنے خط میں مجھے آپ نے لکھا کہ "ساقی، ۳۳ برس پہلے جو مطلع تم نے لکھا ویسا کراچی کا کوئی شاعر آج تک نہیں لکھ سکا" یا "فنون" میں خالد احمد کے بارے میں زمین آسمان کے قلا ملا دیئے۔ ظاہر ہے، میں بھی اچھا شاعر ہوں اور "جوانوں" میں خالد احمد نے بھی چند عمدہ نظمیں غزلیں لا ہیں مگر آپ کی تعریف گمراہ کن ہے۔ اس سے تعریف کرنے والے کے بارے میں لوگ بدظن ہو جاتے ہیں

ضیا اور مدنی کی ایسی "بے مہار" تعریف کر کے آپ نے Backlashing کے لیے راہ ہموار کی ہے۔

یوں ہے کہ ضیا سے آپ کے زیادہ اور مدنی سے میرے زیادہ ذاتی تعلقات رہے۔ مگر ان دونوں کی محبت میں ہم دونوں برابر ہیں۔ مدنی صاحب چلے گئے (وہ عجب بے چین روح تھے) مگر میری "بھابی بہن" اور دوست اور آپکی بیٹی شفقت اور میرے "بہنوئی بھائی" اور دوست اور آپکے "داماد" ضیا صاحب جب ملتے ہیں تو آپ کا ذکر ضرور کرتے ہیں اور نہایت محبت اور گرمجوشی کے ساتھ۔ اب کے شفقت نے بتایا کہ آپ نے "ایک نہایت خوبصورت داڑھی اگا رکھی ہے۔" (جو بار انا سے ہلتی بھی ہوگی)۔ آپ نے لکھا ہے "جلد آؤ کہ میں آخری بار (یہ آپ کا آخری بار ہے کہ میرا آخری بار) تمہیں سینے سے لگانا چاہتا ہوں۔" میں بھی آپ کو کلیجے سے لگانا چاہتا ہوں چاہے ریش دراز درمیان میں حائل ہی کیوں نہ رہے۔ بے شمار محبتوں کے ساتھ۔

آپ کا ساقی

انیسویں صدی کے ایران کی شہرہ آفاق شاعرہ اور ایشیا میں حقوق نسواں کی اولین علم بردار

قرۃ العین طاہرہ

جسے علامہ اقبال نے "خاتون عجم" کا لقب دیا۔ ای۔ جی براؤن نے "نادرۂ روزگار" لکھا۔
لارڈ کرزن نے انیسویں صدی کا "معجزہ" قرار دیا۔

جس نے

ناصرالدین شاہ کی ملکہ بننے سے انکار کر دیا اور جو قید و بند کی صعوبتیں جھیل کر دار و رسن کی زینت بن گئی۔

اس نا.غہ روزگار شاعرہ کے کارناموں پر برصغیر کے اہل قلم کی تحریریں

"خاتون عجم"

میں پڑھئے جسے بلند پایہ محقق ڈاکٹر صابر آفاقی نے بڑی محنت اور لگن سے مرتب کیا ہے۔

رابطہ: "ادبیات" مظفر آباد' آزاد کشمیر

نیطشے اور محمد ارشاد

غلام قادر آزاد (مانچسٹر)

ہمیں یہ تحریر "اختلافات" میں شامل کرنے کے لیے ملی ہے مگر اس کی ایک اپنی الگ اہمیت کے پیش نظر اسے بطور مضمون درج کیا جا رہا ہے۔ ادارہ

"فنون" ملتا ہے، علم و ادب یعنی علم اور علم محسوس، روشنی اور گرمی کا موجب ہوتے ہیں تو "اختلافات" میں یہی روشنی اور گرمی وسعت پذیر ہو کر فکر و خیال کی سرگرمی پیدا کرتی ہے۔ یہاں موسم میں کسی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔

تازہ شمارے (فنون نمبر ۴۲) کی فضا بھی انہی کی بدولت تابناک ہے۔ محمد ارشاد صاحب نیطشے پر اٹھائے گئے جس اعتراض کا جواب دے رہے ہیں، نیطشے پر اس سے کہیں شدید اعتراضات وارد ہوتے ہیں اور ہوں گے، لیکن نیطشے کی فکر و نظر کی اہمیت نہ صرف ان کی وجہ سے بھی ہے بلکہ ان کے باوجود بھی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ نیطشے نے انسانی زبان، انسانی شعور اور خصوصاً" ایشیائی بنیادوں پر استوار مسیحی نظام اخلاقیات کے مسلمات پر ایک کاری ضرب لگائی اور تشکیک سے آگے بڑھ کر اپنے زور یقین سے ان کے مقابلے میں فکر و نظر کی ایک نئی دنیا آباد کی۔ اس نے زبان کی سراب نمائی اور انسانی شعور کی افسانہ طرازی واضح کی اور الہیاتی نظام اقدار کے مقابلے میں غیر الہیاتی بنیادوں پر استوار ایک نئے نظام اخلاقیات پر زور دیا۔ مگر اس ساری جرات رندانہ کے پیچھے زندگی زوال آمادہ زندگی کا وہ درد و کرب بھی اور عشق بھی موجود ہے جو موجود سے قطعی ناآسودہ، مضطرب اور بے قرار ہو کر "موعود" کے خوابوں کا عذاب جھیلتے ہوئے ایک جہان تازہ کی نمود و کشود کی طرف بڑھتا ہے جسے ہم ندیم کے الفاظ میں یوں سمجھ سکتے ہیں۔

زندگی کو سنبھالنے کی مہم کب مقدر کے اختیار میں ہے
یہ زمین یہ خلا کی رقاصہ آدم نو کے انتظار میں تھے

نیطشے کے یہاں حیات پر جو زور ہے اور حیات آفرینی کی جو تڑپ ہے، اسی کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے ایک ہم عصر، دیوان حافظ کے انگریز مترجم جان پین کی دوسری باتوں کے علاوہ (جنہیں دیکھئے "چند یادیں چند تاثرات" از عاشق حسین بٹالوی میں) یہ جامع رائے ہے کہ "وہ بڑا آدمی تھا۔ اس کا فلسفہ میرے نزدیک زندگی کا محرک ہے، دستور العمل نہیں۔" نیطشے اور اس کے ہم عصر کی وفات کے بعد یہی فلسفہ مغرب

ے علمی دوائر میں دستور العمل بن کر نہ جانے کن کن علوم کی بنیادیں اٹھا رہا ہے اور کئی بنیادوں کو ڈھا بھی رہا ہے۔ مابعد الطبیعات اور تصوریت جن میں سب سے نمایاں ہیں اور اس کے محرک حیات ہونے کا اعتراف تو ان چین سن کری ہی چکے ہیں' جس کے اثرات مغرب کے ادبی دوائر میں تسلیم شدہ حقیقت ہیں۔ یہ درست ں سہی کہ نیطشے نے مابعد الطبیعات کے انہدام کا اہتمام کیا مگر یہاں آسانی والی بات بھی کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں اقبال نے فارسی اردو شاعری میں جو آٹھ نو جگہ نیطشے کی بابت اپنے تاثر کو شعری اسلوب ں سمیٹا ہے وہاں وہ کسی اکہرے۔ یک پرتی یا یک رخ نہیں بلکہ ایک تہہ دار فکری جذبی مرکب تجربے سے لزرتے نظر آتے ہیں' جہاں تنقید ہے تو تحسین و احترام کی آمیزش بھی ساتھ ہی ساتھ نظر آتی ہے۔ ایک لرف اس کا دماغی کفر انہیں روکتا ہے تو دوسری طرف اس کی زندگی پر ایمان انہیں کھینچتا بھی ہے اور یوں وہ لفر طرازی کے باوجودی اقبال سے قلب مومن کا حامل ہونے کی فضیلت و امتیاز کا اعتراف یافتہ بھی ہے۔

نکہ بر طرح حرم بت خانہ ساخت قلب او مومن دماغش کافراست!

جہاں تک نیطشے کی بے الہ اخلاقیات (Godless morality) ہے تو وہ بھی ہماری لئے کسی کری عدم تحفظ کا خوف پیدا نہیں کرتی کہ یہاں گوتم بدھ کے مثال موجود ہے (اقبال اور مغربی مفکرین از جگن اتھ آزاد) مگر ان سے بھی اہم خود ہماری اپنی دینی' تہذیبی' ثقافتی اور علمی روائت (کلیسا کے خوف علم کے ویوں کے برعکس جس کی اپنی ایک تاریخ ہے جس نے کتنے ہی گل کھلائے اور رد عمل کے طور پر مغرب نے یک قطعی دوسرا رویہ بھی اختیار کیا)۔ بہرحال ہماری روائت علم پر قدغن اور اس پر احتساب کی روائت نہیں کہ وہ تو آگے بڑھ کر علم کو سینے سے لگانے کی جرات اور حوصلہ عطا کرتی ہے اور احتساب کی بجائے انتخاب کو پناتی ہے کہ انتخاب میں انسانی آزادی کا استعارہ ہے' جس کے بغیر تمام اخلاقیاتی نظام اور اخلاقیاتی تصورات بے معنی ہو جاتے ہیں۔ علم اور زندگی کے اس رشتے پر اگر ہم مولانا روم کا مشہور زمانہ شعر سامنے رکھیں تو سی انتخاب کی اہمیت ہم پر کھلتی ہے۔

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

مار اور یار کے الفاظ فطرت اور انسانی ذہن کی طرف لے جا رہے ہیں کہ علم کا فطری فروغ تو روکا ہیں جا سکتا لیکن اسے بروئے کار ضرور لایا جا سکتا ہے کہ یاری دوستی خواہ علم سے بھی ہو زندگی کے جبری رشتوں پر (یا فطری؟) نہیں بلکہ آزادانہ طور پر منتخب کی گئی اقدار پر استوار ہوتی ہے۔ یہ انتخاب اور یہ آزادی ہمارا اصل امتحان بھی ہے۔ خصوصاً" جب ہم ایک خاص نہج پر عالمی مزاج ڈھلتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ یہ مزاج جس طرح بن رہا ہے اور بنتا جا رہا ہے اس کے جملہ عناصر کو جاننا اور سمجھنا بھی ہمارے سامنے ایک چیلنج ہے۔ کیا خبر اس مزاج کی فہم و تفہیم سے ہمارے یہاں خود شناسی اور خدا شناسی کے نئے رویے جنم لیں ور عقائد پر زور کی بجائے ہمارا رخ اصل ایمان کی طرف مڑ جائے۔

کچھ بھی ہو آج کل پھر "فنون" کے صفحات پر ایک معرکہ آرا و کتاب کے ابواب لکھے جا رہے ہیں

اور میدان کارزار بھی گرم ہے ذرا بین السطور غور کریں تو کسی تیغ تیز کے سائے لرزتے دکھائی دیں گے۔ جہاں کتنی ہی اقدار، علمی نظریے اور افکار بے دست و پا ہو کر جہد بقا میں مصروف ہیں لیکن زندگی کا وہ اصل الاصول ہماری نظروں سے واضح طور پر لا رہے ہیں جو انواع سے لے کر علم تک کی تہہ میں کارفرما ہے جس کو دیکھتے ہوئے کسی مغربی دانشور نے کہا تھا کہ امن انسان کی ایک نئی ایجاد ہے اور جس پر عرفی نے مشورہ دیا تھا:

بچشم مصلحت بنگر مصاف نظم ہستی را
کہ پرخارے دریں وادی درخش کادیاں بینی

عرفی کا مشورہ بڑا صائب ہی سہی مگر دنیا میں اہل جنوں نے مصلحت اور عافیت کوشی کو کب اپنا مسلک ٹھہرایا ہے۔ ٹھہراتے تو دنیا کی آبادی (یا آباد کاری) کا عالم یہ نہ ہوتا۔ اسی لیے تو غالب نے کہا تھا کہ

رہی آباد دنیا اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

نیٹشے بھی مغرب کے ویرانے میں ایک ایسا ہی دیوانہ تھا بلکہ دیوانوں کا قافلہ سالار، جس کے لیے اقبال نے مجذوب فرنگی کی ترکیب وضع کرتے ہوئے بڑی بلاغت کا ثبوت دیا۔ جس کا راز ہم پر اور کھلتا چلا جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دیوانہ بڑا سوچا سمجھا ہوا دیوانہ تھا۔ اس لیے کہ ذہنی تعطل کے اس حادثے سے کہیں پہلے جس کا وہ شکار ہوا اور آخری دم تک اس کا شکار رہا بھی، وہ دیوانگی کی اہمیت اور اس کی ضرورت پر زور دے رہا تھا۔ جس نے تاریخ اخلاقیات کے ساتھ دیوانگی کے ربط کی نشاندہی بھی کی کہ Madness has abearing on the history of morality اس نے تو یہ تک کہا کہ بڑی شخصیتوں میں اگر یہ آگ پہلے سے موجود نہیں تو اسے شعوری طور پر دہکائیں اور اپنے شعلۂ جنوں کو اور ہوا دیں کہ پرانی تہذیبوں کے بڑے اذہان اسی المناک منطق کے سامنے سپرانداز ہوئے Ronald Hayman How mad was Nietzlche by (مضمون مطبوعہ سنڈے آبزرور ۲۹ اپریل ۱۹۷۹ء) اسی طرح جب وہ دیوانگی کے حصول کی ترکیبیں بتاتا ہے تو ہماری نظر غالب کے اس شعر کی طرف اٹھتی ہے جہاں وہ بھی سوز و گداز کے لیے نیٹشے کی طرح یہ عملی نسخہ ہمیں بتاتے ہیں کہ

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

غالب اس عمل کو شاید ناگزیر اس لیے کہتے ہیں کہ فن میں قدر تاثر اس وقت تک نہیں آتی جب تک آدمی درد و کرب کی ان منزلوں سے نہ گزرے ہ:

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی!

نیٹشے کے سامنے روایات کی کہنہ و فرسودہ بنیاد عمارت تھی جس کی بربادی اور ویرانی اس کی تعمیر نو کے لیے (مولانا روم کے بھی خیال کے مطابق) لازمی ہے اور یہی ہے وہ کام جو دیوانوں کی روایت ہے۔

متذکرہ مضمون پڑھتے ہوئے قدرتی طور پر قاری کا ذہن ہماری اپنی شعری ادبی روائت کی طرف جاتا ہے جہاں عشق و جنوں کے حوالے سے یہی تڑپ اور تمنا دیکھی جا سکتی ہے۔ بقول بیدل:

باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدہ ای، بے جنوں مباش

دیوانوں یا اہل جنوں کے ویرانے اور وحشت و صحرا مختلف ہو سکتے ہیں مگر "قانون باغبانی صحرا" لکھنے کی روائت یا عمل سب میں مشترک ہی نظر آتا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا اقبال نے نیٹشے کو مجذوب فرنگی کہہ کر کمال بلاغت کا ثبوت دیا۔ اسی کو موضوع مطالعہ کے عنوان کے طور پر اپناتے ہوئے محمد ارشاد نہ صرف بلاغت کا ثبوت دے رہے ہیں بلکہ جرات کا بھی۔ اس لیے کہ اقبال نے جہاں نیٹشے کی بابت اپنے پورے تاثر کو شعر میں سمیٹا ہے وہاں ارشاد صاحب نثر میں اسے کھولنے کا عزم لے کر اٹھے ہیں اور اس طرح کہ جیسے معاملہ نیٹشے کی جگہ مجذوب فرنگی سے ہی طے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں ان کی جرات کا نشان ہیں کیونکہ مجذوب تو پاکستانی ہندوستانی بھی پنجابی محاورے کے مطابق "مان" نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ فرنگی ہی نہیں المانوی بھی ہو۔ اب ایسے مجذوب کو گرفت میں لانا، پھر اس کے "عرفان" کا احاطہ کرتے ہوئے اردو میں ڈھال کر دوسروں تک پہنچانا، جرات ہی کا کام ہے جس کے لیے "عالم" ہی نہیں عاقل ہونا بھی ضروری ہے، ورنہ معاملہ تذکرہ غوثیہ کے اس مختصر قصے کے مریدوں والا ہو سکتا ہے جس نے کسی جنگل میں سے گزرتے ہوئے اپنے مرشد کی آنکھ بچا کر شیر کی ہڈیوں کے پنجر میں (اپنے علم کے زور پر شاید) جان تو ڈال دی تھی مگر جب مرشد اسے ڈھونڈتے ہوئے واپس آئے تو وہاں اکیلا شیر ہی کھڑا تھا۔ شیر کا عذر یہ تھا کہ اس نے میرے رزق کے اہتمام سے پہلے ہی مجھے کھڑا کر دیا تھا۔ یہ عذر یہاں نہیں چل سکتا کہ ہمارے پاس رزق مطلوبہ کا سرمایہ رکھا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ارشاد بھی مرید نہیں مرشد ہیں جو جانتے ہیں کہ نطشہ "بڑی بلا ہے اور بری بلا تھے" اور یہ وہ پہلے ہی کہیں لکھ چکے ہیں کہ فلسفہ پڑھنے کی نہیں سیکھنے کی چیز ہے۔ لہٰذا ہمیں یقین ہے کہ معاملہ وہ نہ ہو گا جس پر غالب نے کہا تھا اور ہم کہتے پھریں کہ:

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

ہم نے جو نیٹشے کا المانوی ہونا عرض کیا تو یہ پہلو اس مجذوب کا اتنا اہم ہے کہ ارشاد صاحب کی جرات رندانہ پر حیرت ہوتی ہے، اس لیے کہ اس پہلو سے نیٹشے کے مطالعے کی مشکلات کا علم ہمیں ایک ایسے ماہر اور مصنف نیٹشے سے ہوتا ہے جو خود جرمن ادبیات کا پروفیسر ہے (میری مراد پروفیسر جے پی سٹرن (J.P.Stern) کے انٹرویو سے ہے جو برائن میگی کے ساتھ تھا جو خود بھی لندن یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ یہ انٹرویو ۱۹۸۷ء کے لگ بھگ بی بی سی ٹی وی پر فلسفیوں کی بابت ایک دستاویزی فلم کے سلسلہ میں تھا۔ بعد میں اس کی مرتبہ یعنی Bryan Magee کی مرتبہ کتاب دی گریٹ فلاسفرز میں شامل) پروفیسر سٹرن کے

مطابق نیطشے کا اسلوب شاعری اور لغت کے آدھ میں واقع ہے اور یہ سمجھنا بے حد دشوار ہوتا ہے کہ شاع کہاں ختم ہے اور فلسفیانہ خیال کہاں سے شروع۔ اس سلسلے میں اس نے نیطشے کے خدا کی بابت بیان کی مش دیتے ہوئے وضاحت بھی کی جسے پڑھتے ہوئے ایک گمان یہ بھی گزرتا ہے کہ کیا واقعی اس کے بیان کا و مطلب ہے جو عام طور پر مشہور ہے۔ اب ایسے اسلوب کو اردو میں سمجھ کر استفادہ کرنا عام آدمی کے بس بات نہیں۔ اس اسلوب کو وہ Aphoristic یا طبیعیاتی کہتے ہیں جس کا ایک ترجمہ ارشاد صاحب نے انش بھی کیا جس سے میں اتفاق تو ہوں مگر اختلاف بھی ہے۔ اس لیے کہ جب سے اردو انشائیے کو عطاء الحق قا نے ایک ہیجڑہ صنف ادب کہا ہے ہمارا دماغ ڈاکٹر یونس بٹ اور مشکور حسین یاد سے معذرت کے باوجود خ مخواہ ادھر ہی جاتا ہے۔ خصوصاً جب ارشاد صاحب اس کی تشریح کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمیں نیطشے کی بات اور بھی یاد آتی ہے کہ Naming is revealing غرض ارشاد صاحب کی مشکلات کچھ آسان نہ ہیں مگر راہرو راہ محبت کا خدا حافظ ہے۔ اس کام کی تکمیل کے لیے اردو دنیا اختر حسین جعفری مرحوم کی مم ہو گی جنھوں نے اس کی تحریک دی۔ نہ جانے اب اردو علم و ادب کو اس کی بدولت کون کون سے محرکا میسر آئیں۔ ارشاد صاحب کے لیے ہم صرف اتنا ہی عرض کریں گے بقول فراق:

کہاں ہر ایک سے بار نشاط اٹھتا ہے
بلاش یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی!

تازہ شمارے میں اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ارشاد صاحب نے ایک ادبی مسئلے کو بھی چھوا بوجوہ مختصراً کیا یہ حقیقت نہیں کہ وضاحت کلی ہی دراصل شعری ادبی ابلاغ کا مقصد ہوتی ہے۔ شاعر جہ ابہام سے بھی کام لیتا ہے کہ

ہر گھڑی ڈھانپنا چھپانا ہے
الغرض نو بہ نو دکھانا ہے
(میر درد)

(بشرطیکہ دکھانے کو شعر و ادب کے پاس کچھ ہو بھی) حافظہ غلطی پر نہیں تو سید علی عباس جلال پو صاحب نے "روایات فلسفہ" میں ایک قول نیطشے کا بھی درج کیا ہے کہ "شاعر اپنے پانی کو گدلا کر دیتے ہیں کہ وہ گہرا نظر آئے۔" کیونکہ ہم بھی اسی خیال کی آنچ کے اوپر اپنے "پانی" کو رکھ کر اور پھر "نتا" دیکھیں۔ کیا پتہ یہ عمل ہمیں کتنی بصیرتیں یا پھر عبرتیں دے جائے۔ اور پھر کیا یہ بھی حقیقت نہیں کہ ابر آ آسمان کی بجائے نیلے صاف آسمان سے بجلی کی تراوش جب ہوتی ہے تو پھر انکشاف شعری ایک اضافی رخ۔ اور بھی آدمی کو بیدار کر دیتا ہے۔

گوپی چند نارنگ کی ساختیات شناسی

پروفیسر وہاب اشرفی (رانچی)

ہمیں یہ تسلیم کر لینے میں عار نہیں ہونا چاہیئے کہ ساختیات اور اس کے متعلقات سے ہماری واقفیت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ گزشتہ پانچ برس سے ان پر توجہ کی جانے لگی ہے اور یہ سچ ہے کہ ساختیات کے بارے میں جہاں تہاں جو تعارفی نوٹس قسم چیزیں سامنے آئیں وہ زیادہ تر گمراہ کن تھیں۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ لوگ ساختیاتی مباحث سے کلی طور پر آگاہ نہیں تھے اور اس ڈسپلن کی تفہیم میں جس علمی پس منظر کی ضرورت تھی وہ متعلقہ لوگوں کو حاصل نہ تھا، میری مراد لسانیات سے ہے، دراصل ساختیات اور اس کے بعد کی ارتقائی اور انحرافی صورت سے رشتہ جوڑنے والے کسی نہ کسی طور پر لسانیات کا علم رکھنے والے ہی لوگ تھے، یہ وجہ ہے کہ جن لوگوں سے اس کا رشتہ نہیں تھا اور وہ ساختیات کی تفہیم کی طرف متوجہ ہوئے تو بُری طرح ناکام ہوئے۔ دوسروں کے مقابلے میں گوپی چند نارنگ کا امتیاز یہی رہا ہے کہ اُن کا لسانیاتی علم اُن کی ہر قدم پر مدد کرتا رہا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ساختیات اسکول کے سب سے اہم دیدہ ور نقاد کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے ـــــ میرے خیال میں یہ بحث نہیں اُٹھانی چاہیے کہ سب سے پہلے ساختیات کی طرف کون متوجہ ہوا۔ اگر خون لگا کر شہیدوں میں نام گنوانے کی آرزو ہو تو تاریخ نارنگ سے آگے بھی جائے گی، لیکن سچ یہ ہے کہ ان سے پہلے لکھنے والے تمام و کمال اپنے موضوع سے آگاہ نہ تھے، پھر اُن کی تحریر برسبیلِ تذکرہ کے زمرے میں آتی ہے۔ گوپی چند نارنگ پہلا مضمون 'ساختیات اور ادبی تنقید' 'ماہِ نو' کے جون ۱۹۸۹ء کے شمارے میں شائع ہوا، پھر یہی مضمون 'شعر و حکمت' حیدر میں بھی اشاعت پذیر ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ موصوف نے مضمون کے آغاز ہی میں کچھ ضروری باتیں رقم کر دی ہیں، لکھتے ہیں:

> "زیرِ نظر مضمون میں اردو میں ساختیات (Structuralism) کی نظریاتی بنیادوں سے پہلی بار باضابطہ بحث کی گئی ہے اور ساختیات اور ادبی تنقید کے رشتے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس سے پہلے اُردو کے بعض رسائل و جرائد میں ساختیات کا ذکر آتا رہا ہے اور اکا دُکا صحافیانہ مضامین بھی لکھے گئے ہیں، لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ زیادہ تر لکھنے والوں نے ساختیات کی فکری بنیادوں کو سمجھے بغیر اس کا ذکر کیا ہے اور ادھر اُدھر سے معلومات اخذ کر کے پوری بحث پر حاوی ہوئے بغیر ادھ کچرے طور پر ان کو پیش کر دیا ہے۔ اس طرح کے بیانات نہ صرف ناسمجھی کی دین ہیں بلکہ شدید نوعیت کی غلط فہمی پھیلانے کا سبب بھی۔ اس صورتِ حال میں عالم، عامی، صحافی، غیر صحافی سبھی شریک ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات معتدد حیثیت رکھتے ہیں اور اپنے اپنے میدان میں ان کا کام قابلِ قدر ہے اور پایۂ اعتبار رکھتا ہے لیکن ساختیات کے بارے میں ان کے بیانات گمرہی پھیلانے کا سبب بنے ہیں....."

میں سمجھتا ہوں کہ اس بیان میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ نارنگ نے متعلقہ تحریروں سے جو مثالیں پیش کی ہیں اُن سے
نکالا جا سکتا ہے جو موصوف نے نکالا ہے۔ بہرطور اس مضمون کے تین واضح حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اس کی وضاحت کی گئی ہے
ذہن اعلام و اشیا اور ان کے روابط کو کس طرح دیکھتا ہے اور ساختیات ان کی توجیہہ کس طرح کرتی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے جیک
کے تصورات پیش کر کے ان کا تجزیہ کیا ہے۔ انہوں نے مزید ساختیاتی فکر کے اساسی پہلو پر روشنی ڈالی ہے کہ ادب فقط مصن
ذہن کا کارنامہ نہیں یا ادب اظہارِ خیال نہیں، یا متن مصنف کے ذہن و شعور کا زائیدہ نہیں یا ادب زندگی کی سچائیوں وغیرہ کا آئینہ
صاف یہ ہے کہ مصنف اپنا اظہار نہیں کرتا۔ کوئی تخلیق خلا میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ مصنف روایت کے سرچشموں سے فیض
کرتا ہے اور ثقافت اور زبان کی لغت سے استفادہ کرتا ہے جو ہمیشہ پہلے سے لکھی ہوئی موجود ہے۔ انہوں نے فریڈرک جیم
سے لکھا ہے کہ ساختیات واضح طور پر فکرِ انسانی کے اصل الاصول یا ذہنِ انسانی کی مستقل ساختوں کی جستجو کرتی ہے۔ دوسر
میں ساختیات کے حوالے سے Semiology کی دقیق بحثیں اُٹھائی گئی ہیں اور ساختیات اور لسانیات کے
کو واضح کیا گیا ہے۔ اس باب میں مختلف مفکرین کی آرا کی عقبی زمین کی تلاش کا بھی جوکھم سر کیا گیا ہے۔ اور تیسرا حصہ
بنیادی تصورات کی تفہیم سے متعلق ہے۔ دراصل گوپی چند نارنگ پر یہ نکتہ عیاں ہے کہ سا سئیر کی ہی بنیاد پر بعد کی بعض
کی گئی ہیں۔ انہیں ساختیات کے خاتمے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً اسی قسم کی غلطی محمد علی صدیقی سے ہوئی اور انہوں نے بلا
کا اظہار کر دیا کہ مغرب میں ساختیات رد ہو چکی۔ انہیں شاید سا سئیر سے انحراف کرنے والوں کے سرسری مطالعے سے یہ مغالطہ ہوا
ذی ہوش تو ایسی بے تکی باتیں نہیں کر سکتا۔ بہرطور گوپی چند نارنگ نے اپنے پہلے ہی مضمون میں نہ صرف ساختیات کے پیچیدہ
شرح و بسط سے واضح کرنے کی کوشش بلکہ اسی مضمون میں اس کی ارتقائی اور انحرافی صورتوں کے سلسلے میں بلیغ اشارے کر
مضمون کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس میں پہلی بار اردو میں نکتہ بہ نکتہ مرکزی نکات کو سمیٹ لینے کی کوشش کی گئی اور مطالعے کا اخت
پیش کر دیا گیا —— انہوں نے صرف اس پر بس نہیں کیا بلکہ تیس ایسی کتابوں کی فہرست پیش کی جو اس مضمون کا ماخذ تھیں۔
مضمون کی صرف ایک بات مجھے کھٹکی [illegible] مسئلے کے مباحث سے نہیں بلکہ ان کی ترتیب سے متعلق ہے۔ سا سئیر کا ذکر بہت بعد میں
کیا، شروع تو یہیں سے کرنا چاہیے تھا ممکن ہے کہ لسانی گوشوں کو پہلے روشن کرنا مدعا رہا ہو۔ بہرحال مضمون خاصا نزاعی ثابت
کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان میں ساختیاتی ڈسکورس کا آغاز اسی سے ہوا۔ گویا ایک inal Essay
تھا۔ پاکستان کے رسالے "صریر" میں بحثیں شروع ہو گئیں۔ قمر جمیل کا 'دریافت' بھی ایسے مباحث میں پیش پیش رہنے

ماہنامہ "صریر" کے دوسرے شمارے ستمبر ۱۹۸۹ء میں 'ساختیات' کے عنوان سے گوپی چند نارنگ کا ایک
ہے۔ کہنے کو تو یہ خط ہے لیکن اس کی حیثیت بھی ایک مضمون کی ہے۔ اسے پہلے مضمون کا تتمہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ادا
نوٹ لگایا ہے۔ وہ یوں ہے :

" صریر " کے دوسرے شمارے میں 'بادفروش' نے 'ادبی خبر و اعادہ' کے موضوع پر جناب گوپی چند نارنگ
آمد اور اس سلسلے میں تقریبات پر اظہارِ خیال کیا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا خط موصول ہوا ہے جو ڈاکٹر
خواہش کے مطابق شائع کیا جا رہا ہے "۔ اس ضمن میں نارنگ نے معترضین کے ناگفتنی علم کا چند جملوں میں پول کھول دیا
اندازہ ہوتا ہے کہ کالم نگار نے خواہ مخواہ لسانیات اور ساختیات کے معاملے میں Infiltrate کرنے کی کوش
مضمون نما خط کا وصف یہ ہے کہ 'ساختیات' کی اصطلاحات Langue اور parole کے بارے میں

کی مفہوم سازی کی اصلاح کر دی گئی۔ اتنا ہی نہیں ان خط میں 'ساختیات' کا مغز ہے یہ اور بات ہے کہ کسی کے رد میں ہے۔ باد فروش کی بروقت اصلاح کے بعد گوپی چند نارنگ نے یہ ضروری باور کیا کہ وہ ساختیات کے حوالے سے مزید صراحت، توضیح ا تعبیر کا بار اپنے سر لیں چنانچہ فروری ۱۹۹۰ء میں 'صریر' ہی میں ان کا ایک معرکہ آرا مضمون "کچھ ساختیات کے بارے میں" شائع ہوا۔ یہ بھی ایک خط ہے۔ میں نے پہلے ہی لکھا ہے کہ نارنگ کا پہلا مضمون بنیادی پتھر تھا۔ اب جو عمارت تعمیر ہونی تھی اسی پر ہو سکتی تھی، لیکن آ سے کسی کے علمی پس منظر اور علمی کارکردگی کو تسلیم کر لینا بڑے حوصلے کی بات ہوتی ہے اور یہ حوصلہ ہمارے معاصرین کو کم سے کم نصیب ہوا ہے چنانچہ نارنگ کے متعلقہ مضمون کی پذیرائی تو دور کی بات تھی وہ لوگ بھی کیڑے نکالنے کے درپے ہوئے جن کا یہ علاقہ تھا ہی نہیں۔ اس مضمو میں (ہر چند کہ گوپی چند نارنگ اسے خط کہتے ہیں) محمد علی صدیقی، باد فروش اور شہزاد منظر کے 'اعتراضات' کا جواب دیا گیا ہے۔ لیکن جواب سے واضح نکات بن گئے ہیں اور ساختیاتی مباحث کی گرہ کشائی میں بے حد معاون ہیں۔ مثلاً محمد علی صدیقی کا اعتراض ہے کہ ساختیا تو رد ہو چکی اور پس ساختیات والے خود یہ دعویٰ کرتے ہیں۔ نارنگ کا جواب ہے کہ ایک پیچیدہ صورت حال کو اس حد تک سادہ کر کے بیا کرنا گویا سچائی کو مسخ کرنا ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ بیشک پس ساختیات ساختیات سے آگے کی چیز ہے لیکن یہی قول محا کی صورت ہے چونکہ محمد علی صدیقی سانیات سے واقف نہیں اس لیے اندازہ نہیں لگا سکے کہ رولاں بارتھ، لاکاں، فوکو، دریدا، جولیا کرسٹوا، پال ڈی مان یا ایڈورڈ سعید سب کے سب ساسیئر کے تصورات سے خوشہ چینی کر رہے ہیں۔ محمد علی صدیقی نے ادب کی خود مختا کا بھی سوال اٹھایا تھا اور اسے ساختیات کے سر تھوپنے کی کوشش کی تھی۔ نارنگ کا مسکت جواب ہے کہ خود مختاری کا دعویٰ نئی تنقید کا ہے نہ کہ ساختیات اور پس ساختیات —— اگر ایسا نہ ہوتا تو بارتھ اور دوسرے مفکرین کیسے اتنی شدت سے نئی تنقید پر وار کرتے صدیقی نے ادب کے یک زمانی (Synchronic) مطالعے کی بھی بحث اٹھائی تھی نارنگ کا صحیح اصرار ہے کہ چونکہ وہ اسے نظریا تناظر سے الگ کر کے دیکھتے ہیں اس لیے وہ اس قسم کی غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس باب میں موصوف نے آلتھیوسے کی کتابوں کے حوالے د ہیں جن کے مطالعے کے لیے معترض کو مائل کرنا چاہا ہے۔ اس خط میں گوپی چند نارنگ کو بار بار ساختیات اور اس کے متعلقات کے بنیاد تصورات کی طرف پلٹنا پڑا ہے غایت بس اتنی ہے کہ معاملات صاف ہو جائیں کہیں ژولیدگی اور پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ دوسرے معتر کا جواب بھی اسی مدلل انداز سے دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں جیسی صراحت، وضاحت اور تجزیاتی صورت اپنائی گئی ہے اس سے معتر کو چت کرنا منظور نہیں ہے بلکہ ایک ایسے علم کی باریکیوں سے روشناس کرنا ہے جن سے 'مقتدر' حضرات بھی واقف ہیں۔ میں اس خط کی دوسری باتوں سے صرف نظر کرتا ہوں پھر بھی یہ کہوں گا کہ میرے پیش نظر وزیر آغا کے "اعتراضات" نہیں ہیں۔ نارنگ نے بھی ان کی تفصیل پیش نہیں کی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے انہوں نے کچھ نکات کی وضاحت چاہی ہوگی اس لئے کہ وزیر آغا اپنے انداز سے ساختیات و پس ساختیات کے مضمرات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں یہ بات اور ہے کہ نارنگ اس میدان میں ان سے بہ آگے ہیں۔ اس لئے بھی وہ اعتراضات اپنے اوپر حملہ تصور نہیں کرتے بلکہ افہام و تفہیم کی ایک راہ تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی غایت یہی کہ جو شکوک پیدا ہو رہے ہیں ان کا ازالہ ہو جائے۔ یہ کام نارنگ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر یہ بات ب شاید طنزاً کہی گئی کہ ساختیات بھلا زندگی کا کون سا مسئلہ طے کر رہی ہے۔ نارنگ وضاحت یوں کرتے ہیں:

> "بھلا آرٹ ہی سے زندگی کا کون سا مسئلہ حل ہوتا ہے یا فلسفے کے اس دبستان یا اُس دبستان سے کون سا مسئلہ حل ہوتا ہے؛ اس سوال سے کئی رخ سے بات کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ سوال Formulate ہی صحیح نہیں ہوا۔ سائنس دان کا کام دریافت کرنا ہے۔ فلسفی کا کام

سوچتا ہے، اطلاقی نوعیت الگ مسئلہ ہے، فکرِ انسانی اس سان کی طرح ہے جس سے چھری پر دھار رکھی جاتی ہے حالانکہ اس میں کاٹنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، مختصر یہ کہ ساختیات اور پس ساختیات دانشِ حاضر کا اگلا قدم ہے۔ اس کے بارے میں معلومات ضروری ہیں۔"

دراصل ہماری زندگی میں افادیت کی طلب میں اتنی بے صبری ہے کہ ہم ہر لحہ دانشورانہ اور فلسفیانہ مباحث کو میزان پ
عادی ہو چکے ہیں۔ سامنے کی بات ہے کہ غزل، افسانہ، ناول، داستان وغیرہ زندگی کے مسائل کے حل کا آلہ تو نہیں۔ تا
زمانے سے ہم ان کی اپنی abstract خصوصیات سے سرشاری حاصل کرتے رہے ہیں، مختلف تنقیدی دب
انگیز کرتے رہے ہیں تو پھر ساختیات، پس ساختیات یا ردِ تشکیل کو یکبارگی افادی مسائل کے حل کی طرف کیوں لے جانا چاہ
گوپی چند نارنگ کے دلائل وزنی ہیں اور انہیں رد کرنا یقیناً فعلِ عبث ہوگا۔

اب گوپی چند نارنگ اپنی بحث کو وسعت دیتے ہیں اور کمال اختصار، جامعیت اور دیدہ وری سے ایک مشکل مبح
ساختیات اور پس ساختیات' کے بنیادی تصورات کو احاطۂ تحریر میں لانے کی سعیٔ مشکور کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ممتاز مارک
آلتھیوسے کے نظریات بڑی اہمیت رکھتے ہیں جن سے مارکسی عقبی زمین میں آئیڈیولوجی آرٹ اور سائنس کے نئے مضمرات سا
ہیں۔ موصوف کا یہ مضمون فکر و نظر علی گڑھ کے جون ۱۹۹۰ء کے شمارے میں شائع ہوا اور اسی ماہ 'صریر'، کراچی میں بھی۔
کے اس مضمون سے مارکسی تنقید کی نئی جہت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دراصل مغرب میں مارکسی ادب کے کئی موڑ آئ
سے ساختیات اور پس ساختیات تک فکر و نظر کی تبدیلی ایک نئی دنیا آباد کر دیتی ہے لیکن ہمارے یہاں مارکسی تنقید قدیم روش
گوپی چند نارنگ نے شاید پہلی بار مارکسی تنقید کے نئے آفاق کی طرف ہمارے ذہن کو موڑنا چاہا ہے۔ چنانچہ ان کے مباحث میں لو
گولڈمان، ماشیرے، رولاں بارتھ، ایگلٹن اور فریڈرک جیمسن کی نگارشات پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اس مضمون کے تی
پہلے حصے میں زیادہ تر گفتگو گولڈمان کی کاوشوں سے کی گئی ہے۔ اس کا احساس دلایا گیا ہے کہ وہ پہلا نقاد ہے جس کے فکری روی
اور ساختیات کا اشتراک نظر آتا ہے۔ دیکھئے نارنگ اس کلیدی نکتے کو کس طرح بیان کرتے ہیں:

> "لوسین گولڈمان وہ پہلا مارکسی نقاد ہے جس کے فکری رویے میں مارکسیت اور ساختیات کا اشتراک نظر آتا ہے۔ گولڈمان نے اس خیال کو مسترد کر دیا کہ متن انفرادی جینیس کی تخلیق ہوتا ہے اور یہ نظریہ پیش کیا کہ متن بین انفرادی ذہنی ساختوں (Trans- individual mental Structures) سے پیدا ہوتا ہے جو اصلاً کسی سماجی گروہ یا طبقے کی پروردہ ہوتی ہیں۔ یہ ذہنی ساختیں یا نظریہ ہائے حیات (World views) برابر بدلتے اور زائل ہوتے رہتے ہیں۔ کیونکہ مختلف سماجی طبقے بدلتی ہوئی حقیقت کے پیشِ نظر دنیا کے تبدیل ہوتے ہوئے امیج سے پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سماجی عالموں کے شعور میں بالعموم یہ تبدیلیاں پوری طرح منعکس نہیں ہوتیں یا پوری طرح صورت پذیر نہیں ہو پاتیں لیکن بڑے شعراء اور ادیب ان تغیر آشنا ذہنی ساختوں کی صورت گری کرتے ہیں اور ان کو اپنے ادب میں واضح، روشن اور مربوط فارم میں پیش کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر نارنگ نے گولڈمان کی کتاب The Hidden God اور Towards a
Sociology of the novel کا بطورِ خاص صرف ذکر ہی نہیں کیا بلکہ ان کے دقیق محتویات پر

ے گولڈمان کا ساختیات سے رشتہ واضح ہو جاتا ہے۔ اور اس کے نقطۂ نظر کے بنیادی پہلوؤں سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ اس کے
ے کی تصنیف *A theory of literary production* کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان
کر اس کتاب میں متعدد ایسے نکات ملتے ہیں جن کی بنا پر اسے رولاں بارتھ خصوصاً *S/Z* کے رولاں بارتھ کا پیش رو
ہے۔ پھر نارنگ بڑی جانفشانی، محنت اور علمی تجربے وہ نکات پیش کرتے ہیں جو شیرے کی کتاب کو کلاسیکی ٹکسٹ کا
یں معاون ہوئے ہیں اور جن سے رولاں بارتھ۔ آلتھیوسے اور ایگلٹن سبھی متاثر ہوئے۔ نارنگ کی بحث صاف اور منطقی
ا ان نکات کو قبول کر لینے میں کوئی ذہنی الجھن نہیں ہوتی —— یہاں مضمون کا پہلا حصہ ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرے حصے میں
ے پر قدرے تفصیلی نگاہ ڈالی جاتی ہے اور اس کے مقالے *Ideology and Ideological*
State Appa کے حوالے سے آئیڈیولوجی اور آرٹ کے رشتے سے اُن کے خیالات کو واضح کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ ان
گارشات کے مباحث کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور کوشش کی ہے کہ آلتھیوسے مارکسیت اور ساختیات کے اہم
ت میں آجائیں —— آلتھوسے پر جیسی باریک بینی سے گفتگو کی گئی ہے اس سے اس حصے کو ایک واضح مقالے کی حیثیت
ئی، یہی صورت تیسرے حصے کی ہے جس میں ایگلٹن اور جیمسن زیر بحث آئے ہیں جہاں ایگلٹن کی کتابیں مثلاً *Criticism*
and Ide، *Culture and Society* اور *Walter Benjamin or*
towards a revolutionary criti کے محتویات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ نارنگ ایگلٹن
صرف تسلیم کرتے ہیں بلکہ اپنے پڑھنے والوں کو اپنے ذہنی سفر میں شریک کر لیتے ہیں اور ہم بڑے اطمینان سے ایگلٹن کے کارناموں
ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ جیمسن کی کتابوں *Marxism and Form*، *The Prison-house-*
of Langu اور *The Political Unconscious* پر تنقیدی
ہیں اور اس مفکر نقاد کے بنیادی تصورات کو احاطۂ تحریر میں لے لیتے ہیں —— مارکسیت، ساختیات اور پس ساختیات
ں پہلا اور اب تک غالباً آخری مقالہ ہے۔ ویسے شاید طوالت مانع تھی ورنہ اس گراں قدر مقالے میں میخائل باختن کی

۱- *Formal Method in Literary Scholarship*
۲- *Marxism and Philosophy*
۳- *Problems of Dostoevsky's Art*
۴- *Problems of Dostoevsky's Poetics* اور
۵- *Rabelais and his World*

پہلی دو کتابیں بعض مصلحتوں کی وجہ سے باختن کے نام سے نہیں چھپیں۔ تیسری اور چوتھی کتابیں ایک ہی ہیں۔ باختن نے
طرح کی کہ وہ اس کا الگ نام رکھنے پر مجبور ہو گیا)، مائیکل فوکو *Michel Foucault* (کتابیں :
Madness and Civiliza، *The Order of Things*،
The Archaeology of Knowledg اور *Discipline and*
P)، جولیا کرسٹیوا (مشہور کتاب : *The Ethics of Linguistics*) اور
ا بھی نام آنا چاہیے۔ ظاہر ہے ایک مقالے میں تمام لوگوں کی سمائی تو ممکن بھی نہیں ہے —— دراصل مجھے اس کا

احساس ہے کہ گوپی چند نارنگ کی نگاہ ان ہی لوگوں پر نہیں بلکہ ایڈورڈ سعید کیتھارائن بلسے، جولیا کرسٹیوا، مشل فوکو اور کالن ماکیبے ریگ مارکسیت، ساختیات اور پس ساختیات کے مباحث میں خود نارنگ نے الگ الگ دوسرے مضامین میں ان پر نگاہ ڈالی ہے۔ یہ ان کا ذکر اس اختصاصی مقالے میں ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ اس موضوع پر میری نگاہ میں اردو میں کوئی دوسرا مضمون نہیں اس لیے کی حیثیت از خود تاریخی ہو جاتی ہے۔ میں یہاں اس کی وضاحت کرتا چلوں کہ بعض رد و انتخاب کے مرحلے سے گزرنے والے لوگ مارکیہ اور ساختیات وغیرہ میں گوپی چند نارنگ ہی کی طرح لوئی آلتھوسے، ماشیرے اور ٹیری ایگلٹن ہی کو اس زمرے میں رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک نام اور بھی تھا وہ E. Balibar ہے۔ وہ بھی اس لئے کہ terature as an Ideological Form میں شریک مصنف کی حیثیت سے وہ ماشیرے کے ساتھ ہے۔ اس رخ کو اپنانے والوں میں فل راشس اور پیٹرک واؤ جیسے افراد ہیں جبکہ ڈیوڈ لاج اپنا دامن کشادہ کر دیتا ہے اور ان تمام افراد کو زیر بحث لاتا ہے جن کا میں نے کیا۔ بہرحال متذکرہ مضمون گوپی چند نارنگ کے تنوع کا بھی اظہار کر رہا ہے اور نئی تھیوری سے ان کے شغف پر بھی دال ہے۔ یہاں امر کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ۱۹۹۰ء کے اگست میں ہی نارنگ (روسی ہیئت پسندی پر) ایک طویل مضمون گیارہ بنیادی کے حوالے سے قلمبند کر چکے تھے جس میں دوسرے لوگوں کے علاوہ باختن اسکول پر تجزیاتی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اس سے مجھے احسا ہے کہ نارنگ جو خاصے selective ہیں اس کی وجہ موجود ہے۔ متعلقہ مضمون کا آخری پیراگراف ہے:

> اوپر کی بحث سے ظاہر ہے کہ پہلے دور کے شکلووسکی، توماشیوسکی اور آئیخن باام کی 'خالص' ہیئت پسندی سے دوسرے دور کے باختن اسکول، جیکبسن، تنیانوف تھیسس اور مکاروسکی کے متحرک نظریات تک ایک طویل فکری سفر ہے۔ بعد کی مارکسی تنقید بلاشبہ ان لوگوں سے مختلف تھی کیونکہ اس نے ادب کو یکسر سماج کے تابع کر دیا۔ تاہم ادبی تنقید کے ان پیش رووں کی فکری تخم ریزی ضائع نہیں گئی کیونکہ جیسا کہ وضاحت کی گئی ہے اول تو آگے چل کر ساختیاتی فکر پر اس کا اثر پڑا دوسرے لوسیین گولڈمان اور آلتھیوسے جیسے بہت سے مارکسی مفکرین ایسے بھی ہیں جو ہیئت پسندی کے اتنے مخالف نہیں جتنا بالعموم سمجھا جاتا ہے۔"

میں نے ابھی ابھی گوپی چند نارنگ کے تاریخ ساز ادبی کارنامے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اب ان کا م یہ ٹھہرا کہ وہ نظریہ سازوں پر مستقل مضامین لکھیں۔ بعض پر ان کے تفصیلی جائزہ کا ذکر آگے آچکا۔ رولاں بارتھ کا ذکر بار بار آیا ہے اس بات کی تھی کہ اس پر تفصیلی نظر ڈالی جاتی اور جب یہ کام موصوف نے انجام دیا تو فوراً ان کی پذیرائی ہوئی۔ 'پس ساختیات کا پیش رولاں بارتھ' ان کا مشہور مضمون ہے۔ سب سے پہلے یہ 'آجکل' میں جنوری ۱۹۹۰ء میں چھپا۔ صریر کراچی اور نقوش لاہور ہوا۔ اردو میں بارتھ پر یہ پہلا تفصیلی تحلیلی اور تنقیدی مضمون ہے۔ اور بارتھ کے گوناں گوں پہلوؤں پر محیط اس کے افکار کو لیتا ہے۔ واضح ہو کہ رولاں بارتھ کی دنیا بہت وسیع ہے اور اس کی انحرافی اور ارتقائی صورت بڑی پیچیدہ اور پراسرار رہی ساختیاتی بصیرت رکھنے والوں میں اس کا بڑا محترم اور افضل مقام ہے۔ اس پر کچھ لکھنا تلوار کی دھار پر چلنا تھا۔ یہ ہفت بھی گوپی چند نارنگ نے بطریق احسن طے کیا ہے۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ Devotion اپنا انعام رکھتی ہے اور رہنما ا دونوں ہی بن جاتی ہے۔ یہ کچھ نارنگ کے ساتھ بھی ہوا۔ انہوں نے ساختیات، پس ساختیات، ردِ تشکیل وغیرہ کی موشگافیوں ک میں اترنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کا ایک ثبوت مضمون 'رولاں بارتھ' بھی ہے۔ اس میں کمال یہ ہوا کہ پیچیدہ اور مشکل مضرا

ردیئے گئے ہیں۔ اس طرح کہ کوئی نکتہ غیر واضح اور مبہم نہیں رہتا۔ اس مضمون کی ترتیب میں بارہ اہم مصادر سے مدد لی گئی ہے۔ یکے ابتدائی دور سے لے کر آخری عہد تک کے فتوحات کا علم ہو جاتا ہے۔ پورے مضمون سے چند کلمات مشتے نمونہ از خروارے پیش کرتا ہوں:

رولاں بارتھ اپنے ابتدائی دور میں ..... سارتر سے بے حد متاثر تھا ..... لازمیت اور بورژوازی مخالفت میں بارتھ ایک اعتبار سے سارتر سے بھی آگے نکل گیا۔

- رولاں بارتھ ہر اس چیز کا حامی تھا جو کثیر اور مرکز گریز (centrifugal) ہو اور ہر اس چیز کا مخالف تھا جو مائل بہ مرکز (centripetal) یا واحد ہو۔
- جس طرح ثقافت میں Doxa ہوتا ہے۔ ادب میں بھی Doxa ہوتا ہے جس کو رد کرنا ضروری ہے چنانچہ ادب کے مقلدانہ تصور پر بھی رولاں بارتھ نے کاری ضرب لگائی۔
- بارتھ کبھی کمیونسٹ نہیں رہا لیکن ادب کی تاریخیت کے بارے میں اس کا نظریہ مارکسی نہ سہی تو نو مارکسی ضرور ہے۔
- اس نے (بارتھ نے) اپنے عہد کی ادبی تاریخوں کو ناموں اور سنین کا بے جان پشتارہ قرار دیا جن میں بقول اس کے ادب اور سماج کی معنی خیز جدلیاتی روح مفقود ہے۔
- اس نے اپنی اولین کتاب Writing Degree Zero میں دکھانے کی کوشش کی کہ مارکسی نقطۂ نظر سے فرانسی ادب کی تاریخ کس طرح لکھی جا سکتی ہے۔
- بارتھ قاری کو متن کی معنی خیزی کے عمل میں ..... آزادانہ شرکت کی پُرجوش اور نشاط انگیز دعوت دیتا ہے۔
- S/Z میں بارتھ نے بالزک کے نسبتاً غیر معروف ناولٹ Sarrasine کو موضوع بنا کر ادبی تجزیے اور متن کی قرات کا نیا بصیرت افروز نظریہ پیش کیا ..... بارتھ بالزک کے سارازین کو ۵۶۱ قراتی اجزا Lexias میں تقسیم کرتا ہے ..... اس کے بعد وہ ان کو باری باری پانچ کوڈ کی چھلنی (grid) سے گزارتا ہے۔ یہ پانچ کوڈ ہیں تشریحی (Hermeneutic)، معنیاتی (Semic)، علامتی (Symbolic)، عملی (Proairetic) اور ثقافتی (Cultural)۔
- رولاں بارتھ کے پہلے دور میں سیمیالوجی (نظامِ نشانیات) پر زور تھا۔ دوسرے دور میں وہ سیمیالوجی سے رفتہ رفتہ ادب کی طرف آ گیا۔

۱۔ ساختیاتی لسانیات کی رو سے بارتھ کا ایک مشہور قول ہے Language speaks not man

۱۔ رولاں بارتھ امریکہ کی نئی تنقید کے سخت خلاف تھا۔ 'نئی تنقید' پر سب سے شدید اور فلسفیانہ طور پر مضبوط وار بارتھ ہی نے کیا۔

۱۱۔ نقاد عملی طور پر معنی کی تعمیر کرتا ہے۔ وہ فن پارے کو 'موجود' بناتا ہے۔

۱۱۔ ..... متن (بارتھ کے خیال میں) معنی نما کی آتش بازی ہے۔ یہ پارۂ زبان ہے جو ساخت رکھتا ہے لیکن بغیر مرکز کے جس کا کوئی اختتام نہیں۔

ن نکات پر گوپی چند نارنگ نے بھرپور بحثیں کی ہیں اس طرح کہ رولاں بارتھ کے خیالات ایک عام قاری کے لئے بھی

تفہیم ہو جاتے ہیں اور وہ گلہ جاتا رہتا ہے کہ ان مفکروں کی کوئی بات سمجھ ہی میں نہیں آتی۔

رولاں بارتھ کے تصورات کے بارے میں گوپی چند نارنگ کی ایک اور وضاحت شب خون مئی / جون جولائی ۹۱ء میں 'بارتھ نے یا کہا تھا؛ کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس ضمن میں ادارۂ شب خون کا نوٹ نقل کر دینا کافی ہوگا:

> 'صریر کراچی کے مدیر جناب فہیم اعظمی کے استفسار پر گوپی چند نارنگ، وزیر آغا اور شمس الرحمٰن فاروقی نے بارتھ کے دو اقوال پر اظہار خیال کیا تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے خیالات ہم شمارہ نمبر ۱۶۱ میں پیش کر چکے ہیں اب ہمیں گوپی چند نارنگ کے خیالات کو پیش کرنے کی مسرت حاصل ہو رہی ہے۔ اربابِ علم دیکھیں گے کہ جناب نارنگ نے دونوں معاملوں خاص کر 'تحریر لکھتی ہے، مصنف نہیں' کو کس خوبی سے سلجھایا ہے اور خود ہائیڈگر کا براہِ راست قول بھی پیش کر دیا ہے تاکہ کسی کو شک کی گنجائش نہ رہ جائے؛

میں نے پہلے ہی لکھا ہے کہ کسی اسکول کے اساسی افکار کو پیش کرنے میں بڑی دیدہ ریزی اور مطالعے کی وسعت کی ضرورت ہوتی ہے صوصاً اس وقت جب اس اسکول کے خدوخال نمایاں نہیں ہوتے ہوں۔ چونکہ ساختیات اور متعلقاتِ ساختیات کے نقوش اردو والوں ے لیے ہنوز دھندلے تھے، ضرورت تھی کہ کوئی ہوش مند پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ انہیں ابھارنے کا فریضہ انجام دے۔ قرعۂ فال وپی چند نارنگ کے نام نکلا، سو یہ فریضہ انہیں انجام دینا ہی تھا —— اس پیش رفت کے بعد ضرورت تھی کہ ساختیات، پس اختیات اور ردِ تشکیل کے ارتقائی اور انحرافی سفر میں جو موڑ آتے ہیں اور متعلقہ *Poetics* کی جو کیفیت رہتی ہے اس کا بھی احاطہ کیا جائے۔ اس باب میں میں نارنگ کے دو بے حد اہم مضامین کی طرف میں راغب کرنا چاہتا ہوں۔ میری مراد 'شعریات ور ساختیات'، مطبوعہ "دریافت" کراچی جولائی / اگست ۱۹۹۱ء اور 'فکشن کی شعریات اور ساختیات'، مطبوعہ کتاب نما نوری ۱۹۹۱ء سے ہے۔ یہ دونوں ہی مضامین ساختیات کے حوالے سے متعلقہ *Poetics* کی تفہیم کے لیے بہترین تدلیلی توضیحی، منطقی ور عملی منظر نامہ پیش کرتے ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی طرف بار بار رجوع کیا جائے۔ میرے خیال میں اگر گوپی چند نارنگ یسے مضامین نہیں لکھتے تو فیض کی نظم کی پس ساختیاتی تنقید ان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ مطالعہ کیجیے "فیض کو کیسے نہ پڑھیں، ایک پس ساختیاتی مطالعہ" مطبوعہ سوغات ستمبر ۱۹۹۱ء —— یہ مضمون اس قدر اوریجنل اور صدمہ پہنچانے والا ہے کہ *Doxa* کا انکار بہت سوں کی سمجھ ہی میں نہیں آیا اور وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔ اس ضمن میں میرا ایک ذاتی خیال ہے جس پر میں اپنے پڑھنے والوں کی رائے جاننا چاہوں گا۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ گوپی چند نارنگ نے اس عملی تنقید کا سلسلہ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کے تجزیئے اور 'واقعاتِ کربلا —— ایک استعارہ' سے ہی شروع کر دیا تھا؟ ہوتا یہ ہے کہ جب ذہن ایک خاص نہج پر کام کرنا شروع ر دیتا ہے تو پھر اس کا عمل پُراسرار طریقے پر بہت پہلے سے شروع ہو چکا ہوتا ہے —— مختصر یہ کہ ساختیات، پس ساختیات اور ردِ تشکیل پر گوپی چند نارنگ کے مضامین ان مکاتب فکر کے اساسی پہلوؤں پر نہ صرف محیط ہیں بلکہ تنقیدی مطالعے کا ایک متنوع منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ اردو کی دنیا میں چاہے متعلقہ تصورات جیسے بھی موڑ لیں گوپی چند نارنگ کا تاریخ ساز کام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور اردو میں ان افکارِ تازہ کے بنیادگزاروں میں ان کی جگہ سرفہرست ہوگی۔

تحقیق و تنقید --- منظر نامہ[۱]

پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال

اردو میں تنقید ابھی تک تحقیق کا بار نہیں اٹھا سکی۔ یہی وجہ ہے کہ کہنے سننے والوں کو یہ تہمت لگانے کا موقع مل جاتا ہے کہ اردو میں تنقید کا وجود اور معشوق کی کمر یکساں عدم وجود کے حامل ہیں۔ ہم تو اب تک غالب اور اقبال جیسے اردو کے بڑے شاعروں کے بارے میں طے نہیں کر سکے کہ ان میں اول الذکر جاہ پرست تھا یا ایک "اداکار" یا پھر قدم قدم پر تمناؤں میں الجھا ہوا تھا اور اپنی ہی شکست کی آواز بن کر رہ گیا تھا۔ ثانی الذکر کے بارے میں بھی یہ عقدہ حل نہ ہو سکا کہ وہ شاعر فلسفی تھا یا فلسفی شاعر اور اب تو اس کی دل کش صدائیں بھی نظریہ ضرورت کی بھینٹ چڑھ کر صدا بصحرا ہی ثابت ہو رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ فلسفہ و شعر کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے کسی اور سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ گویا تخلیق اور تنقید کے درمیان ایک ناگزیر رشتہ ہے۔ تخلیق بھی حسن کی طرح خودنما ہوتی ہے اور تنقید ایک عاشق کی طرح اس کا طواف کرتی ہے اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ لطافت اور کثافت اپنی اصل میں ایک ہیں' بالکل اسی طرح تخلیق اور تنقید بھی اپنی اصل میں ایک ہیں۔ جس طرح حسن کو آرائش جمال کے لیے نقاب میں دائم ایک آئینے کی ضرورت ہے اسی طرح تخلیق کو اپنی جلوہ نمائی اور صورت گری کے لیے تنقید کی آرسی کی طلب ہے۔ یوں تخلیق کی سحر کاری' تنقید کی کرشمہ سازی اور تحقیق کی رنگا رنگی جلال و جمال کے سارے پہلوؤں کو بھرپور اظہار کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ تاہم بقول غالب:

شمع فروغ حسن سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

ہمارے یہاں ماجرا یہ ہے کہ بیشتر نقاد اور شاعر دل گداختہ پیدا کرنے کے بجائے نکتہ چیں بن بیٹھتے ہیں' اس لیے بات بنائے نہیں بنتی۔ مصرعہ اٹھائے سے نہیں اٹھتا اور یوں حسن سخن کی شمع اپنے فروغ سے پہلے خموش ہو جاتی ہے۔ ہمارے نقاد تو بعض بنیادی سوالات اٹھانے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ فن کی افادیت' تخلیقی فن اور فن کار کے رشتے پر زور دیا جاتا ہے) یا اس رشتے کی استواری کی ضرورت

۱۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تازہ تصنیف

جیسے موضوعات پر بہت کم لکھا جاتا ہے۔ تخلیق کار تو کھوئے ہوؤں کی جستجو کرتا ہے۔ اس کی فطرت میں شامل سوز اسے ہمہ وقت سوزاں رکھتا ہے۔ میر نے بڑی خوبی سے اس طرف اشارہ کیا تھا:

میں کون ہوں اے ہم نفساں، سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

اگر تنقید واقعی تخلیق یا لمحہ تخلیق کی بازیافت کا عمل ہے تو پھر نقاد کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ اس کے لیے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ تحسین سخن کے لیے دل گداختہ پیدا کرے۔ تخلیق اور تنقید کی رمزیں ایک جیسی ہیں۔ شاعر کی نوا، مغنی کا نفس اور نقاد کا مقصود ہنر ایک ہی راستے سے مرحلہ ہائے شوق طے کرتے ہیں۔ مقصود ہنر کے بارے میں اقبال نے بہت پہلے طے کر دیا تھا:

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا

یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ تخلیق کی طرح تنقید بھی ایک ہنر ہے۔ اچھے اور برے معیار کی بحث کو چھوڑتے ہوئے اردو میں ایسے نقادوں کی کمی نہیں جن کے یہاں تحقیق اور تنقید کا خوب صورت امتزاج موجود ہے۔ نام گنوانے کی ضرورت نہیں، اردو خواں طبقہ ان سے واقف ہے تاہم دل گداختہ کی کمی اب تک محسوس ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے اردو میں تنقید کا کوئی بڑا معیار اب تک قائم نہیں ہو سکا۔ تاہم ہمارے یہاں تحقیق کے میدان میں اعلیٰ درجے کے معیارات قائم ہوئے ہیں۔ اسی طرح تخلیق کے حوالے سے اٹھارھویں صدی میں میر انیسویں صدی میں غالب اور بیسویں صدی میں اقبال کا نام ہی معیار کی ضمانت ہے۔

معروف محقق اور نقاد ڈاکٹر طاہر تونسوی بھی اسی قبیلے کا فرد ہے جس کے یہاں تخلیق کے معیار کو جانچنے کا پیمانہ تحقیق اور تنقید ہیں۔ ان کی تازہ ترین تصنیف کا سرنامہ "تحقیق و تنقید —— منظر نامہ" اسی امر کی گواہی دیتا ہے۔ یہ کتاب ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا پانچواں مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے مضامین کے چار مجموعے "تجزیے"، "رجحانات" "ہم سخن فہم ہیں" اور "لمحہ موجود، ادب اور ادیب" شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ ان گنت اہم کتابوں کے مرتب ہیں۔ ان کی تصنیف "ملتان میں اردو شاعری" کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر، کی سوانح اور ادبی کارناموں کے بارے میں ان کی کتاب "ہم سفر بگولوں کا" ایک رجحان ساز کتاب ہے۔ اس کے بعد اس طرز کی کئی کتابیں دیکھنے کو ملیں۔ اسی سلسلے کی دوسری کڑی ان کی تازہ ترین تالیف "ڈاکٹر سلیم اختر شخصیت اور تخلیقی شخصیت" ہے۔ سات سو سے زاید صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت اور تخلیقی شخصیت کی مختلف جہات کا بھرپور انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب "تحقیق و تنقید۔ منظر نامہ" میں مجموعی طور پر تیرہ مضامین شامل ہیں اور بقول ڈاکٹر طاہر تونسوی "حقیقت یہ ہے کہ اس بار میں نے اپنے مضامین کا کڑا انتخاب کیا ہے۔" میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا یہ انتخاب ان کی شہرت کا باعث ہوگا یا رسوائی کا، تاہم یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس مجموعے میں جہاں بعض مضامین اعلیٰ درجے کی تحقیق و تنقید کا بھرم قائم کرتے ہیں وہاں کچھ مضامین سرسری نوعیت کے

ں ہیں جن کی شمولیت سے کتاب میں کسی قدر عدمِ توازن کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی اب شہرت ر مقبولیت کے اس مقام پر ہیں جہاں انہیں مقدار سے زیادہ معیار پر توجہ دینے کی ضرورت ہے اور مجھے یہ نے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ان کے اندر ایک اچھے محقق اور نقاد کے تمام امکانات موجود ہیں۔ وہ اردو کے ور محقق اور نقاد پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چکے ں۔ وہ بیک وقت اردو کے کلاسیکی اور جدید ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اب تو انہوں نے سرائیکی شعر و ب کو کھنگالنے کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے۔ انہیں اپنی بات کو واضح، دو ٹوک اور قطعی انداز میں کہنے کا نہ بھی آتا ہے۔ یہ ان کے مزاج کا خاصہ بھی ہے جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں ابہام یا الجھاؤ پیدا ں ہوتا۔ ان کے اسلوب میں رواں دواں سہولت اظہار کی فراوانی ہے۔ موضوعات کا تنوع بھی ان کے ں دیکھا جاسکتا ہے۔ "تحقیق و تنقید۔ منظر نامہ" کے تمام مضامین ایسے ہیں جن میں بقول ڈاکٹر فرمان فتح ری "موضوعاتی رنگارنگی، ڈاکٹر طاہر تونسوی کی وسعت مطالعہ اور مثبت اندازِ فکر پر دلالت ہے۔" (دیباچہ ہ ۱۲، ۱۳) کلاسیکی ادب سے لے کر پاکستانی ادب تک تحقیق و تنقید کے عملی مباحث کتاب کے مضامین میں ل ہیں۔

"تحقیق و تنقید۔ منظر نامہ" کا پہلا مقالہ بہ عنوان "نیاز فتح پوری کا نظریہ شعر اور مصحفی" کتاب کا یدی مقالہ ہے۔ یہی وہ مقالہ ہے جو ڈاکٹر طاہر تونسوی کی سخن فہمی کے معیار اور ان کی تنقیدی اہلیت کے انات کا پتہ دیتا ہے۔ ان کا رچا ہوا ذوقِ سخن اردو کی کلاسیکی شاعری کے ایک فراموش ہوتے ہوئے حوالے ایک مرتبہ پھر ہمارے سامنے لے آیا ہے۔ مصحفی اردو شاعری کی روایت کا ایک ایسا نام ہے جس کی بزرگی ر عظمت کو تسلیم کرنے کے باوجود اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی اور ایک آدھ کتاب یا مضمون کے وہ ان پر زیادہ نہیں لکھا گیا۔ لے دے کر فراق گورکھپوری کا مضمون (جسے نیاز فتح پوری نے نگار کے مصحفی ر کے لیے لکھوایا اور جو اب فراق صاحب کے تنقیدی مضامین کے مجموعے "اندازے" میں شامل ہے) آج ں مصحفی کو جاننے اور سمجھنے کا سب سے معتبر حوالہ ہے اور بقول نیاز صاحب "انتقادِ عالیہ کا نمونہ ہے۔" اس ں شک نہیں کہ فراق صاحب کا مضمون کئی کتابوں پر بھاری ہے، لیکن کیا کسی بڑے شاعر کے تمام امکانات کو ب مضمون محیط ہو سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو مصحفی جیسے بلند پایہ شاعر کو اس کا حق دینے کا تقاضہ کرتا ہ۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کا مقالہ مصحفی کے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافی کا ازالہ کرتا ہے۔ مقالے میں اں نیاز صاحب کے نظریہ شعر کی صراحت کی گئی ہے، وہاں ان کے قائم کردہ معیارات کے مطابق مصحفی کی عری کو سمجھنے کی بھرپور کوشش بھی کی گئی ہے مضمون کا آغاز کسی رسمی تعارف کی بجائے مصحفی کے چند خوب رت اور بامعنی اشعار سے کیا گیا ہے اشعار ملاحظہ کیجئے:

خواب تھا یہ خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصل تھا کیا تھا
جس کو ہم روزِ ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا

مصحفی شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا

○--○

گر ابر گھرا ہوا کھڑا ہے
آنسو بھی تلا ہوا کھڑا ہے
حیران ہے کس کا خود سمندر
مدت سے رکا ہوا کھڑا ہے
اے جان نکل کہ مصحفی کا
اسباب لدا ہوا کھڑا ہے

○--○

جھڑ پڑا داغ چمن میں جو کوئی لالے کا
ہم نے وہ داغ اٹھا اپنے جگر پر رکھا
میں اسی رشک سے مرتا ہوں کہ کل غیر نے ہائے
ہاتھ ہنگام قسم کیوں ترے سر پر رکھا
ترے بیٹھے جو ہمیں یاد کوئی کام آیا
ہم نے موقوف اسے وقت دگر پر رکھا

مصحفی کے ان اشعار کو یہاں نقل کرنے کا مقصد ڈاکٹر طاہر تونسوی کے ذوق سخن کی داد دینا ہے۔ مصحفی کے چھ دیوان پر مشتمل سرمایہ شعر کا ایک ایسا انتخاب جس میں مصحفی کا تخلیقی رویہ، ان کا رنگ سخن، طرز ادا، شاعری کی اصل روح، ہجرو فراق کا مضمون، رعنائی خیال، سادگی میں پرکاری، تغزل کا رچاؤ، زبان کی نزاکتیں، بیان کی لطافتیں، لب و لہجے کی نرمی اور کوملتا، مشاہدات و محسوسات کا کمال، محاکاتی استعارے، امیجز کا استعمال، جمالیاتی کیفیتیں اور میرو سودا سے ملتا جلتا مگر لذت آشنائی سے مملو رنگوں اور ان کی پرچھائیوں (Shades) میں ڈوبا ہوا انفرادی رنگ سب سمٹ آئیں، ڈاکٹر طاہر تونسوی کی طرف داری نہیں سخن فہمی کا غماز ہے۔ یوں انہوں نے اپنے مضمون میں مصحفی کے کچھ مزید پہلودار اشعار جا بجا حوالے کے طور پر استعمال کئے ہیں میرا جی چاہتا ہے کہ وہ سب نہیں تو چند اشعار قند مکرر کے طور پر یہاں درج کئے جائیں۔ دیکھیے:

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو   مکھڑے کی چھپانے کی ادا لے گئی دل کو
یاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا   دے پیچ ادہر زلف اڑا لے گئی دل کو

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم   تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا

کبھی اس بات کرنا کبھی اس بات کرنا

جب اس نے تیغ اٹھائی ہم پر
ہاتھوں کی پناہ ہم نے کر لی

○--○

آستیں اس نے جو کہنی تک چڑھائی وقت صبح
آ رہی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

○--○

بھیگے سے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا
پانی میں نگاریں کف پا اور بھی چمکا

○--○

یوں ہے ڈلک بدن کی اس پیرہن کی تہ میں
سرخی بدن کی جھلکے جیسے بدن کی تہ میں

○--○

تھا سرخ پوش وہ گل شاید چمن کے اندر
شعلہ سا شب پھرے تھا سرو سمن کے اندر

○--○

جی میں آتا ہے کہ بوسہ کف پا کا لے لوں
رنگ ہونٹوں پہ ترے تازہ حنا کا لے لوں

اور اب ان اشعار کے حوالے سے ڈاکٹر طاہر تونسوی کی رائے بھی ملاحظہ کیجئے "یہ ساری چیزیں الیات سے تعلق رکھتی ہیں اور محسوسات کی دنیا سے متعلق ہیں اور پھر آنکھوں کو بند کر لینے کے بعد اناں میں کھو جانے کے عمل سے عبارت ہیں۔ گویا بدن' آنکھوں' زلفوں اور پاؤں کے جو رنگ مصحفی ئے ہیں اسے مصحفی کا رنگ ہی کہا جاسکتا ہے۔" یہ ایک مثال بھی اس غرض سے پیش کی گئی تاکہ اندازہ کہ مصحفی کے بارے میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی معنوی تفہیم مصحفی کے شاعرانہ خیال سے کس قدر ہم ہے۔ یوں پورا مضمون مصحفی کے بارے میں نئے امکانات کا پتہ دیتا ہے۔ اس مضمون کی اہمیت اور کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مصحفی کی از سرنو دریافت کا ڈول نیاز فتح پوری نے ڈالا تھا۔ انہوں نے ہی " مصحفی نمبر مرتب کر کے اردو خواں طبقے کو مصحفی کی طرف متوجہ کیا تھا۔ نیاز صاحب ایک بالغ نظر اور ذہن و آدرش رکھنے والے نقاد ہیں۔ انہوں نے میر و سودا کے مقابل مصحفی اور غالب کے مقابل ی اہمیت کو کم ہوتا دیکھ کر ان دونوں بلند پایہ شاعروں کو ایک مرتبہ پھر ان کی اصل قامت کے ساتھ ا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے مصحفی کے بارے میں اپنے تصورات کو نیاز کے شعری نظریات سے ہم آہنگ مصحفی کے انفرادی رنگ سخن کو نمایاں کر دیا ہے۔ یہ ایک دشوار مرحلہ تھا مگر بقول آتش:

آتش زمیں شعر ہو ہر چند سنگلاخ

لغزش سے آشنا نہیں اہل سخن کے پاؤں

اس میں شبہ نہیں کہ "تحقیق و تنقید۔ منظر نامہ" کا یہ پہلا مقالہ پڑھنے والوں کی توقعات کو بہت بڑھا دیتا ہے چنانچہ انہی توقعات کے ساتھ وہ کتاب کے دوسرے مقالے بہ عنوان "سچل سرمست کی شاعری کے موضوعات" کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ طویل مقالہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کے سرائیکی شعرو ادب کے مطالعہ کا ایک رخ ہے۔ سچل سرمست کی سندھی شاعری پر تو اب تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن یہ مضمون ان کی سرائیکی شاعری کو اردو خواں طبقے سے متعارف کرانے کی پہلی سنجیدہ کوشش ہے۔ اپنے موضوع پر اولین مقالہ ہونے کے باوجود اس میں سچل سرمست کے صوفیانہ تجربات کا بھرپور تجزیہ کیا گیا ہے۔ سچل سرمست وادی سندھ کی صوفیانہ روایات کا امین ہے مگر اس سے پہلے ڈاکٹر طاہر تونسوی نے شاہ حسین (سولھویں صدی) سلطان باھو (سترھویں صدی) بلھے شاہ اور شاہ لطیف بھٹائی' علی حیدر اور وارث شاہ (اٹھارھویں صدی) کے حوالے سے پنجاب اور سندھ میں تصوف کی روایت اس کے مضامین اور موضوعات کے تسلسل کو اجمالا" بیان کیا ہے۔ مقالے میں سچل سرمست کے سیاسی' سماجی اور معاشرتی پس منظر کو بطور خاص اہمیت دی گئی ہے۔ ان کے دور میں سندھ جس ظلم و تشدد اور استحصال کا شکار تھا اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

> "سچل نے کلہوڑوں کے عہد میں آنکھ کھولی' پھر تالپوروں کا زمانہ دیکھا اور پھر انگریزوں کے حاوی ہو جانے کا دکھ بھی سہا۔ اس سارے عہد میں سیاسی خلفشار برقرار رہا۔"

گویا سچل سرمست کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ایک مضبوط بنیاد رکھ دی گئی۔ نفسا نفسی' افراتفری' معاشی بدحالی اور مذہبی تنگ نظری کے اس عہد میں سچل نے جس طرح محبت اور اخوت کے گیت گائے اور انگریزوں کے خلاف جذبہ مزاحمت کو پیدا کیا اسی چیز نے ڈاکٹر طاہر تونسوی کو سچل کی سرائیکی شاعری کے بارے میں قلم اٹھانے پر مائل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سچل کی شاعری کو مزاحمتی اور اجتماعی شاعری کا باب اول قرار دیا ہے۔

حسن ازل اور حسن حقیقی کی تلاش ہر صوفی کی منزل ہے۔ سچل کے یہاں حسن و عشق کے بیان کی لہر جس صوری اور معنوی نظام کے تحت رواں دواں ہے مقالہ میں اس کا کھوج اس طرح لگایا گیا ہے کہ سچل کی شاعری میں سوز و گداز' جذب و کیف' مستی و سرمستی' نفی و اثبات' فنا و بقا' ذکر و فکر اور حال و قال جیسے مسائل کی صراحت ہو جاتی ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست کے کلام کو سندھی ثقافت کا آئینہ قرار دیا جاتا ہے۔ سچل کے سرائیکی کلام میں کافیاں بھی ہیں اور دوہڑے بھی۔ ان میں سراپا نگاری کو مضمون خاص کا درجہ حاصل ہے۔ سچل نے جس طرح گھسی پٹی تشبیہوں سے ہٹ کر فطرت اور دوسرے مظاہر سے نئی نئی تشبیہیں تراشی ہیں' محبوب کی آنکھوں کی تعریف میں جس طرح نیا انداز اختیار کیا ہے ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اسے سچل سرمست کی تخلیقی توانائی کا نام دیا ہے۔

سچل کے یہاں رومانی فضا' انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی' دھڑکتے دل کی دھمال' ہجر و وصال لیفیات جیسے مضامین ان کے سرائیکی دوہڑوں اور کافیوں کے مستقل موضوعات ہیں۔ سچل نے ان وعات کی نزاکتوں اور لطافتوں کو جس طرح بیان کیا ہے اس کی وجہ سے ڈاکٹر طاہر تونسوی' سچل سرمستؒ باطور پر حسن کی بیاض سے آیات عشق پڑھنے والا شاعر قرار دیتے ہیں۔

زیر نظر کتاب کے اگلے دو مقالات معروف محقق و ادیب مسعود حسن رضوی ادیب کے بارے میں اور تحقیق و تنقید کی دنیا میں ان کے ادبی مقام و مرتبے کا تعین کرتے ہیں۔ ادیب پر لکھے گئے ڈاکٹر طاہر .ی کے پی ایچ ڈی کے مقالے کو مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں شامل دو ین ادیب کے سلسلے کی توسیعی کڑیاں ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب کے تحقیقی کام کے پھیلاؤ کے بارے یہ دونوں مختصر مقالات سیر حاصل معلومات فراہم کرتے ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب پر ڈاکٹر طاہر .ی کو جو اختصاص حاصل ہے سچی بات یہ ہے کہ ادبی دنیا کے اس کوہ کن کے بارے میں قلم اٹھانے کا وہ بھی رکھتے ہیں اور اختیار بھی۔ بہرکیف یہ دونوں مضامین ڈاکٹر طاہر تونسوی کی ادیب سے محبت اور ت کے والہانہ اظہار کا مظہر ہیں تاہم اپنی تحریر کو انہوں نے جس طرح معتبر اور مستند حوالوں سے سجایا ہے سے ان مضامین میں ایک ایسا توازن اور اعتدال پیدا ہوا ہے جو تحقیق کے باب میں لازمی چیز ہے۔

"پاکستانی ادب میں مزاحمتی رویے" (سرائیکی شاعری کے حوالے سے) کتاب کا پانچواں مضمون ہے تیسری دنیا کے ادب میں کارفرما رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب کی طرح یکی زبان بھی اپنے سیاسی و سماجی تناظر میں مزاحمتی اور احتجاجی رویوں کا اظہار کرتی ہے اور تاریخی جبر کی ں ہوئی صورت حال کو نمایاں کرتی ہے۔ مضمون میں تیسری دنیا کے ادب میں شامل مزاحمتی اور مدافعتی ں اور ان کے محرکات پر بحث کی گئی ہے اور اس سلسلے میں رضی عابدی' ڈاکٹر سلیم اختر' امین مغل اور ، قمر رئیس کی آراء کو پاکستانی ادب میں مزاحمتی اور مدافعتی عوامل کی نمو پذیری اور تخلیق پذیری کی ت کے لیے پیش کیا گیا ہے اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ سرائیکی وسیب کی صورت حال مختلف بھی ہے الگ تھلگ بھی۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کے لفظوں میں:

> "مزاحمتی حوالے سے سرائیکی شاعری میں بڑے بھرپور طریقے سے وہ سب کچھ کہہ دیا گیا ہے جو شاعر کہنا چاہتا ہے۔ گویا لبوں کی بات کاغذ پر لفظوں کے حوالے سے ابھر آئی ہے اور اس شاعری میں خاص ورائٹی' تنوع' بلند بانگ لہجہ اور شدت ہے۔"

مضمون میں آگے چل کر تفصیل سے سرائیکی شاعری میں مدافعتی رجحانات پر بحث کی گئی ہے۔ اور یکی لوک ادب کی "واروں" سے مثالیں دی گئی ہیں۔ سرائیکی زبان کے عظیم شاعر حضرت خواجہ فرید کے ، میں استحصالی رویوں اور حکمران ٹولے کے مظالم کا سراغ لگایا گیا ہے۔ اسی طرح ارشد ملتانی' قیس فریدی' ں رضا گردیزی' اقبال سوکڑی' محسن نقوی' عزیز شاہین' منیر کاظمی' عاشق بزدار' نصراللہ ناصر' اشو لال فقیر نسرین انجم بھٹی چیدہ چیدہ نظموں اور غزلوں سے مثالیں دے کر سرائیکی شاعری کا بھرپور منظرنامہ ترتیب

دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کا یہ تجزیہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

> "گذشتہ بارہ تیرہ برسوں کی آمریت نے فرد کو انا اور اس کی عزت نفس کو جس طرح کچل دیا ہے اور جس طرح اس کی زبان پر تالے لگا دیئے ہیں اور اس کی آزادی اظہار کی سہولت بھی چھین لی گئی اور جس طرح سچ بولنے والوں کو زہر کے پیالے پیش کئے گئے اور پھر جس طرح جسمانی اذیتیں، تکالیف اور دکھ دینے کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے گئے اس نے باضمیر دانش وروں کے لیے اور بھی مہمیز کا کام کیا اور ان کی صدائے احتجاج دبنے کی بجائے اور بھی ابھرتی چلی گئی اور منفی قوتوں کے خلاف قلمی جہاد کی روایت کو فروغ ملتا رہا۔ اس کے نتیجے میں جمہوریت کش طاقتوں، آمرانہ ذہنیتوں اور فرعونی رویوں کو شکست فاش ہوئی۔"

کتاب کے اگلے مضمون میں شوکت واسطی کی خود نوشت سوانح عمری "کہتا ہوں سچ" کا تجزیہ کیا گیا ہے مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ریویو غالب کے خطوط کے انداز میں خطوط لکھنے کی کوشش کرنے والے ایک ادیب کے بارے میں "جملہ معترضہ" کہنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ شوکت واسطی نے محمد حسین آزاد کی انشاء پردازی کے طرز میں لکھنے کا ادعا ظاہر کیا تھا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی لکھتے ہیں:

> "اسلوب ہے کہ محمد حسین آزاد کی نہیں بلکہ شوکت واسطی کی گواہی دیتا ہے ورنہ یہاں تو یہ حالت ہے کہ ایک ادیب نے غالب کے خطوط کی نقل اتارنی چاہی اور ناکام رہے اور جب دہلی گئے تو غالب نے اپنی قبر سے نکل کر ان کے ساتھ وہ کچھ کیا کہ حضرت نظام الدین اولیا اور امیر خسرو کو ان کی جان چھڑانا پڑی۔"

مضمون میں شوکت واسطی کی تصنیف کو اس اعتبار سے سراہا گیا ہے کہ خود نوشت سوانح عمریوں اور سفرناموں کی ریل پیل میں یہ ایک ایسی تصنیف ہے جس میں مصنف نے خود فریبی اور نرگسیت میں مبتلا ہوئے بغیر حقیقت پسندی اور واقفیت نگاری سے کام لیا ہے۔

کتاب کا ساتواں مضمون "پاکستان میں اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری" کا منظرنامہ ہے۔ مضمون کے ابتدائی حصے میں طنز و مزاح کو عرفان ذات یا معاشرتی شعور کے تناظر میں سماجی مسائل کی نشان دہی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور شاعری کے اولین دور (سترھویں صدی) سے اس کا سراغ لگایا گیا ہے۔ تیسرے اور آخری حصے میں قیام پاکستان کے بعد بدلتی ہوئی سماجی اقدار اور سیاسی صورت حال کے پس منظر میں طنز و مزاح کے جدید رویوں اور نئے رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ حصہ خاصا طویل ہے۔ اس میں ڈاکٹر طاہر تونسوی نے بڑی محنت سے سیاسی سماجی، معاشی اور تہذیبی زندگی میں جنم لینے والے ان اضطرابات اور المیاتی کیفیتوں کی نشاندہی کی ہے جسے مزاح نگاروں اور طنز نگاروں نے بطور خاص موضوع بنایا ہے۔ مضمون کو پاکستان کے ظرافت نگار شاعروں کا تذکرہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں پاکستان کے کم و بیش تمام اہم ظرافت نگار شاعروں اور ان کے کلام کا حوالہ منتخب

عات کی مثالوں کے ساتھ موجود ہے جس سے پاکستان میں زمین شعر کی زرخیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔

”جدید شاعری“ کے عنوان سے ڈاکٹر طاہر تونسوی نے پانچ شعراء کے کلام اور طرز کلام کے بارے قیدی مضامین بھی شامل کتاب کئے ہیں۔ ان مضامین کے عنوانات پر ایک نظر ڈالنے سے ہم ڈاکٹر طاہر ں کے مطالعے کی سمت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ عنوانات ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ شہاب دہلوی کی شعری کائنات
۲۔ لفظوں کو معتبر کرنے والا شاعر، افتخار عارف
۳۔ محبت کے سفر رائیگاں کا شاعر، اے جی جوش
۴۔ درویسیت کا صاحب اسلوب شاعر، خالد اقبال یاسر
۵۔ ڈاکٹر محمد امین کی ہائیکو نگاری۔

یہ تمام مضامین تاثراتی نوعیت کے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تعلقات نبھانے کی خاطر لکھے ں تاہم کوشش کی گئی ہے کہ شعرا کے کلام میں بنیادی اور کلیدی نکات کی طرف اشارہ کر دیا جائے جیسے ، دہلوی کے یہاں درد کے حوالے کو، افتخار عارف کے یہاں ترکیب سازی کے ذریعے مرقعے تراشنے کے و، اے جی جوش کے یہاں محبت کے لازوال، دائمی، آفاقی اور حقیقی رشتوں کی عکاسی کو، خالد اقبال یاسر ہاں معنوی اور اسلوبیاتی تنوع کو اور ڈاکٹر محمد امین کی ہائیکو میں فرد اور فطرت کے باہمی رشتوں کی ت کو ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ان شعراء کی تخلیقی صناعی کا جوہر قرار دیا ہے۔

کتاب کا آخری مضمون ”آنکھ کے کھلے دریچوں کا منظرنامہ، سلگتے ساحل“ سید شوکت علی شاہ کے سفر ، کا ایک جائزہ پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ”سلگتے ساحل“ کو آسٹریلیا کی تاریخی، جغرافیائی، ں، ثقافتی، معاشی، سماجی اور سیاسی دستاویز قرار دیا ہے۔ ایک ہی سانس میں اس قدر تعریفی اسناد عطا کر دینا طاہر تونسوی کی دوست نوازی اور شہ خرچی کا مظہر ہے۔ خصوصاً اس طرح کے جملے طرف داری کی کہے جا سکتے ہیں۔

> ”ان سب میں زبان و بیان کی چاشنی تو موجود ہے ہی، امیجز اور منظر کشی کی جو کیفیات ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔“

زیر نظر کتاب کے اس آخری مضمون میں حرف آخر کے طور پر ”سلگتے ساحل“ کو اردو سفرنامے یک نئی قوت، نیا خون، نئی توانائی اور نئی حرارت قرار دیا گیا ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر ڈاکٹر طاہر تونسوی کتاب شامل آخری چند مضامین کو اپنی کتاب ”لمحہ موجود، ادب اور ادیب“ میں شامل کر لیتے جس میں ان کے مضامین پہلے ہی شامل ہیں۔

"باعث تحریر آنکہ" پر ایک نظر

پروفیسر شیخ ظفر اقبال احمد

"باعث تحریر آنکہ" مزاح نگار پروفیسر افضل علوی کی تازہ تصنیف ہے۔ جو ان کے مطبوعہ، غیر مطبوعہ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ موصوف کا شگفتہ سفرنامہ "دیکھ لیا ایران" اپنے اسلوب کی برجستگی، شگفتگی اور طنز و مزاح کی بے ساختگی کی بدولت ادبی حلقوں میں خاصے کی چیز قرار پاچکا ہے۔ "دیکھ لیا ایران" کی گونج ابھی سنائی دے رہے تھی کہ علوی صاحب نے "باعث تحریر آنکہ" کی صورت میں طنز و مزاح کا ایک شاہکار پیش کیا ہے۔

زیر نظر کتاب "باعث تحریر آنکہ" ناول اور افسانے سے بھی زیادہ دلچسپ ہے اور یہ بات سے بات نکالنے کے مخصوص ہنر سے پیدا کی گئی ہے، یہ حقیقت ہے کہ بظاہر بہت سنجیدہ اور انتہائی رکھ رکھاؤ سے رہنے والا یہ متشرع شخص اپنے قریبی حلقہ احباب میں گل افشانی گفتار کا پیکر بن جاتا ہے۔ واقعات سے بہترین نتائج اخذ کرنے میں علوی کو بڑی مہارت حاصل ہے۔

> "مؤرخ حضرات بابر کی جنگ کنواہہ میں فتح کے اسباب خواہ کچھ ہی قرار دیں۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ عالم امر میں اس کے دیگر گناہوں کے ساتھ ساتھ ریش تراشی سے توبہ بھی فتح کا سبب قرار دیا جانا خوگر اسباب مادیہ نظر کو عجیب سا لگتا ہوگا۔ مگر اس کا کیا کیجئے کہ عالم امر کی علت و معلول کے پیمانے عالم اسباب کے پیمانوں سے یکسر جدا ہیں۔ جن کے کنہ تک پہنچنا ہر ایک کے فہم و ادراک کے بس کی بات نہیں۔" (ص 153- 154)

علوی نے مزاح نویسی میں اپنے نقش اول "باعث تحریر آنکہ" کے مضامین کے ذریعے منوالیا ہے کہ وہ فکاہیات میں ایک منفرد اور ممتاز مقام کا حامل ہے۔ اس ضمن میں ہمیں جناب احمد ندیم قاسمی کی رائے سے اتفاق کیے بغیر چارہ نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "پروفیسر افضل علوی کے ان مضامین کے مطالعے کے بعد مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ علوی صاحب اس دور کے گنے چنے طنز

> نگاروں اور مزاح نویسوں میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جید مزاح نگاری میری نظر میں ایک بڑی نیکی ہے کہ ایک مزاح نگار اس زمانے میں جب بے اختیار اور بے ساختہ ہنسی ناپید ہوتی جا رہی ہے، اپنے پڑھنے والوں کو ہنسا دے یا ان کے اندر شگفتگی پیدا کر دے تو یقیناً ثواب کا کام ہے۔ افضل علوی کے ستھرے اور مہذب مزاح پر ان کا نوکیلا اور کٹیلا طنز مستزاد ہے........ مزاح میں طنز کی چاشنی شامل کرنے کے لیے لکھنے والے کو اپنی تاریخ اور تہذیب اور ثقافت اور سیاست اور معاشرت اور معیشت اور علم و ادب پر ممکن حد تک حاوی ہونا پڑتا ہے...... افضل علوی کے طنز سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے پس منظر میں ان تمام جہات کا علم و مشاہدہ موجود ہے....... افضل علوی صاحب ایک ایسے اہم طنز نویس ہیں جنھوں نے....... اردو کے شگفتہ ادب کے آفاق پھیلا دیئے ہیں۔”
>
> (فلیپ صفحہ آخر کتاب مذکور)

افضل علوی کے انداز نگارش کے حوالے سے جناب ندیم نے بڑے اہم پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے ایک قاری یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ طنز نگاروں اور مزاح نگاروں کی صف میں افضل علوی ایک مصلح اور مصلحین کی صف میں ایک اونچے پائے کا طناز اور مزاح نویس ہے۔

علوی کے طنز و مزاح کی بالائی سطح کے نیچے خرد افروزی اور بصیرت افزائی کی سینکڑوں مشعلیں روشن نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر بھرم بھریالوی کے بھروپ میں محققین کا ”اصل روپ“ دیکھیے:

> ”اب آپ دیکھیں نا! کہ آپ بہت سمجھ دار ہیں اور منجھا ہوا ادبی ذوق رکھتے ہیں اور اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ آپ نے مجھ سے محقق و ماہر اقبالیات سے ملنے کے لیے خود زحمت اٹھائی۔ جبکہ صورت حال اس کے برعکس ہے کہ خود محققین کو قارئین سے ملنے کی زحمت اٹھانا پڑتی ہے۔ میں خود ایسی زحمتیں اٹھا اٹھا کر اب کوئی چیز بھی اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔ یہاں تک کہ مشاعروں میں مصرع تک اٹھانا بھی میرے لیے دشوار ہو گیا ہے۔“ (ص 124)

علوی کے ہلکے پھلکے---- شگفتہ مضامین پڑھتے اور ہنستے ہوئے قاری اچانک کچھ سوچنے اور کچھ سوچتے ہوئے اچانک ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان مضامین میں ہنسی اور سوچ کی یہ آنکھ مچولی جاری رہتی ہے اور اس آنکھ مچولی ہی میں انسان کی بباطن تبدیلی اور قلب ماہیت ہوتی چلی جاتی ہے۔ ”کپڑے بدلنا“ کے ایک سادہ ترین موضوع کا بڑا ہی فکر انگیز مگر مزاح سے بھرپور اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

> "یہاں ہمیں اقبال کے ان مصوروں سے بھی سخت گلہ ہے جنہوں نے ان کے اس من پسند لباس (دھوتی بنیان) میں ملبوس ان کی ایک تصویر بھی نہیں بنائی۔ اور لطف یہ کہ اس بنیان دھوتی کو بدلنے کے لیے بھی ان کی طبیعت جلد آمادہ نہیں ہوتی تھی تاآنکہ وہ بری طرح میلی چیکٹ نہ ہو جاتی اور علی بخش اس کے بدلنے پر اصرار نہ کرنے لگتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علی بخش بھی کپڑے بدلوانے کے معاملے میں علامہ اقبال کو اسی طرح تنگ کرتا تھا جیسے ہماری بیگم بچوں کو سکول کے کپڑے بدلوانے کے لیے تنگ کرتی ہیں۔ ویسے بے چارے علی بخش کو کیا پتہ تھا کہ جنہوں نے قوموں کی تقدیر بدلنے کا تہیہ کر رکھا ہو انہیں کپڑے بدلنے کی فرصت نہیں ہوتی۔" (ص 64)

اس کتاب کے مضمون "بھولنا" کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا جس میں علوی نے ہلکے پھلکے انداز میں اپنے بھول بھلکڑ پن سے شروع کی ہے اور پھر بات سے بات پیدا کرتے ہوئے قوموں کی اس بھول پر لے ہیں کہ جس کے نتیجے میں وہ عرش سے فرش پر آن گرتی ہیں:

> "بعض اوقات ہمیں خیال آتا ہے کہ اگر وہ خاتون جاگنے کے بجائے کار میں سو رہی ہوتی تو میاں صاحب کو یہ بھول خاصی مہنگی پڑتی...... مگر اتنی مہنگی بھی نہیں جتنی ان افراد یا اقوام کو جو اس عرصہ حیات میں اپنے مقصد حیات یا مشن ہی کو بھول جاتے ہیں کہ یہ بھول وہ واحد بھول ہے جس کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں۔ اور اس کا خمیازہ بہت عبرت ناک انداز میں بھگتنا پڑتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو ہلاکو کے ہاتھوں.......... شکست کھانے کے بعد بھگتنا پڑا تھا اور لطف یہ کہ اس کو اس متذکرہ قسم کی بھول کی طرف خود اس کے دشمن ہلاکو نے اس کو نمدے میں لپیٹ کر مارنے سے پہلے توجہ دلائی اور وحشی و خونخوار ہونے کے باوجود عجیب ستم ظریفانہ انداز سے دلائی۔ اور وہ یوں کہ مارے جانے سے قبل جب کئی روز کے فاقوں مارے قیدی خلیفہ نے کھانا طلب کیا تو ہلاکو کے حکم پر ایک عمدہ طشت میں ہیرے جواہرات سجا کر اس کے سامنے رکھ دیئے گئے۔ خلیفہ نے ان جواہرات کو دیکھ کر کہا:
>
> ان کو کیسے اور کیوں کر کھاؤں؟ _____ تو ہلاکو نے جو جواب دیا وہ تاریخی بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔

> "اگر ان جواہرات سے ایک بڑا لشکر تیار کیا ہوتا تو آج یہ روز بد کیوں دیکھنا پڑتا اور پھر جو چیز تمہاری ایک وقت کی بھوک بھی دور نہیں کر سکتی اس کے انبار جمع کرنے کا فائدہ؟" (ص 185)

لہٰذا بڑی آسانی سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ علوی کے مزاج کا خاصہ ہے کہ اس کی تحریریں بار خاطر بنے بغیر علمی اور فلسفیانہ نکات کو خوبصورت پیرائے میں بیان کرتی چلی جاتی ہیں۔ اصلاح احوال اور تعمیر شخصیات کے لیے علوی طنز و مزاح کو ایسی مشاقی اور پرکاری سے استعمال کرتا ہے کہ قلب ماہیت کا پیغمبرانہ عمل خاموشی سے سرانجام پاتا دکھائی دیتا ہے۔

مجرد ادبی اور فنی نقطہ نظر سے دیکھیں تو اس کے ہاں فقرے کے فقرے اور جملے کے جملے اپنے اندر ایسی ایسی شوخی، پہلو داری، شگفتگی، برجستگی، ادبیت اور ظرافت کا سامان لیے ہوتے ہیں کہ طبیعت جہاں بے اختیار عش عش کر اٹھتی ہے وہاں انہیں بار بار پڑھ کر بھی سیر نہیں ہوتی۔ بات بات پر چٹکی لینا اور گدگدی کرنا علوی کی طبیعت ثانیہ بن چکا ہے۔ ان کے مضامین میں طنز اور مزاح کچھ اس طرح شیر و شکر اور گھلے ملے ہیں کہ بظاہر یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر طنز نگار ہیں یا مزاح نویس؟ ان کے طنز کی کاٹ اور پہلوداری کو دیکھیں تو انہیں ایک بہترین طناز مانے بغیر چارہ نہیں رہتا اور مزاح کی شوخیوں اور شگفتگیوں پر جائیں تو وہ اردو ادب کے چند گنے چنے مزاح نویسوں میں جگہ پانے کے مستحق نظر آتے ہیں۔ مگر بقول ڈاکٹر خواجہ زکریا:

> "افضل علوی بنیادی طور طنز نگار ہیں اور کسی نے درست ہی کہا ہے کہ طنز نگار بے رہرووں کو معاشرے کی "راہ صواب" پر واپس لانا چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کے مضامین مثلاً "مسئلہ داڑھی کا" یا "ڈاکٹر بھرم بھریالوی۔ نامور محقق و ماہر اقبالیات" طنز و تحریف کے معروف طریق کار کے ذریعے معاشرے کو بے راہروی سے بچانے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں مگر محض اتنی بات لکھ دی جائے تو یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ علوی محض مصلح ہے۔ اس لیے ادب و فن سے اس کا کوئی تعلق نہیں مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ افضل علوی کی ادبی حیثیت ان کی مصلحانہ حیثیت کے سامنے ماند نہیں پڑتی بلکہ دونوں حیثیتیں مکمل مل کر ایک ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا مضمون "یہ مزے مزے کے مغالطے" شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قسم کے اتفاقات ہر کسی کو پیش آ جاتے ہیں کہ راہ چلتے کسی نے انہیں کسی اور شخص پر قیاس کر لیا۔ خود صوفی محمد افضل فقیر مجھے ایک مدت تک ضیاء ڈار (استاد شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور) سمجھتے رہے۔ مگر اس

> قسم کے اتفاقات سے دو چار ہونے کے باوصف میں کبھی ایسا دلچسپ مضمون لکھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا جیسا کہ افضل علوی نے لکھ دیا ہے۔ اس میں طنز کی رو سطح کے نیچے ہے جبکہ خوش گوار مزاح سطح کے اوپر ہے۔ یہ مضمون خاصا طویل ہے مگر دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ ایک سطر بھی اکتاہٹ کا احساس پیدا نہیں کرتی۔" (پیش گفتار ص 8)

اکتاہٹ پیدا کیے بغیر طویل مضمون لکھتے چلے جانا علوی کا ایک ایسا طرۂ امتیاز ہے جس میں اس کا حریف اور ثانی نہیں۔ علوی کی اس خصوصیت کو ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے اپنے تبصرے میں مزید اجاگر کیا:

> "کپڑے بدلنا" میں بھی بعض دوسرے مضامین کی طرح اپنی ذات سے بات شروع کرتے ہیں، اور پھر مضمون جوں جوں آگے بڑھتا ہے تجربات و واقعات کا ایک دل کش سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ علوی کا خاص انداز ہے اور اس کی بدولت وہ ہر موضوع پر دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے خاصہ طویل مضمون لکھ ڈالتے ہیں۔ کسی مضمون لکھنے والے کو یہی موضوعات دے کر دیکھیے۔ یقین ہے کہ ایک آدھ صفحے کے بعد تحریر اتنی بے لطف ہو جائے گی کہ پڑھنے کو جی نہیں چاہے گا۔ مگر افضل علوی کے ذہن میں تجربات و واقعات کا وسیع ذخیرہ موجود ہے جو ان کی قوت تحریر کو برابر مہمیز کرتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ بظاہر خشک سے خشک موضوع پر انتہائی دلچسپ اور شگفتہ تحریر لکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔
>
> دراصل افضل علوی اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ہلکے پھلکے انداز میں سنجیدہ موضوعات پر قلم اٹھانا بہت مشکل کام ہے۔ جب تک کہ لکھنے والے کو دلچسپ گفتگو کا ہنر نہ آتا ہے، اس وقت تک اس کی بات نہ تو توجہ سے پڑھی جاتی ہے اور نہ ہی دلوں پر اثر کرتی ہے۔ علوی دلچسپ گفتگو کا ہنر جانتا ہے۔ ترشے ترشائے جملے، ظرافت، طنز، واقعات، حکایات، دل کش نکات، ضرب الامثال، اشعار، غرض دلچسپی پیدا کرنے کے تمام حربے ان کو نوک زبان ہیں۔ اس لیے وہ کسی بھی موضوع پر قلم، اٹھائیں قاری کے لیے بار خاطر نہیں ہوتے اور جس شخص کو یہ ہنر آجائے وہ بہرطور ایک عمدہ مزاح نگار کے طور پر اپنی حیثیت منوا کر رہتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ افضل علوی بہت جلد اپنی حیثیت منوا کر رہیں گے۔" (ص 9، 10)

"باعث تحریر آنکہ" کے مطالعے کے بعد میری یہ رائے ہے کہ جو شخص بھی اس کتاب کا مطالعہ کرے گا وہ علوی کی عمدہ مزاح نگاری کا ضرور قائل ہوگا۔ سچی بات یہ ہے کہ کوئی بھی صاحب ذوق انسان اس کتاب سے صرف نظر نہ کرسکے گا اور یہ کہے بغیر نہ رہے گا کہ اس کتاب کے بغیر طنز و مزاح کے حوالے سے کوئی لائبریری بھی مکمل نہیں ہو سکتی۔ یقیناً یہ کتاب اردو ادب میں ایک گراں بہا اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

تاہم علوی نے اپنے مضامین کے ایک بہت بڑے "نقص" کی طرف پیش لفظ کے طور پر لکھے گئے اپنے مضمون "در مدح خود" میں خود ہی توجہ دلائی ہے۔ ہم اس "نقص" کو ان کے شگفتہ مگر کٹیلے انداز میں نقل کرتے ہیں:

> "لا ریب کہ "نام" کی بڑی برکات ہیں، ٹھیک کہ "نام" پیدا کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ مگر ایک دفعہ بیل لے جائیں تو پھر ساری عمر کام دیتے ہیں اور بوگس سے بوگس چیز کو شاہکار کا درجہ دلواتے ہیں اور "نام" نہ ہو تو شاہکار بھی بے کار ٹھہرتا ہے۔ بالکل نصیر انور مرحوم کے ابتدائی افسانے کی طرح، اور اس کا قصہ یوں ہے کہ نصیر انور نے اپنے ابتدائی کیریئر میں بہت محنت سے ایک عمدہ افسانہ لکھا جس کی نوک پلک اردو افسانہ نگاری کے فن کے امام سعادت حسن منٹو نے سنواری اور اسے "اے ون" قرار دیا۔ مذکورہ افسانہ ایک مشہور ادبی جریدے کے ایک مشہور مدیر کو بھیج دیا گیا مگر افسانہ چھپنے کے بجائے ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گیا۔ جس پر جناب نصیر بہت دل گیر ہوئے اور منٹو سے گلا کیا کہ آپ تو کہتے تھے کہ یہ ___ نمبر ایک ___ افسانہ ہے۔ اگر یہ ایسا ہی تھا تو چھپا کیوں نہیں؟
>
> "اس لیے کہ اعلیٰ ہونے کے باوجود اس میں ایک بہت بڑا نقص ہے۔" منٹو نے جواب دیا۔
>
> "بہت بڑا نقص ہے تو آپ نے درستی کرتے ہوئے دور کیوں نہیں کیا۔" نصیر انور نے گلہ کیا۔
>
> "میرا خیال تھا کہ اس کے بغیر کام بن جائے گا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ نقص دور کرنا ہی پڑے گا، تب بات بنے گی۔"
>
> "اس نقص کا مجھے بھی تو بتایئے۔" نصیر انور نے بے تابی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔
>
> "تم اپنے افسانے کی دوسری نقل لاؤ تو بتاتا ہوں، منٹو نے کہا۔

> نصیر انور نے حکم کی تعمیل کی تو منٹو نے افسانے پر سے نصیر انور کا نام کاٹ کر جلی حروف میں اپنا نام سعادت حسن منٹو لکھ دیا اور کہا:
>
> "بس اس افسانے میں یہی ایک "نقص" تھا میں نے اس خیال سے رہنے دیا کہ کوئی فنی نقص نہیں۔
>
> اور پھر یہی افسانہ اسی مدیر نے اسی مجلہ میں بہت نمایاں طور پر اردو ادب کے ایک لازوال اور شاہ کار افسانے کے طور پر چھاپا۔

تو صاحبو! جہاں اس کتاب کے مضامین میں (جنہیں آپ طنزیہ سمجھیں یا مزاحیہ اور اگر کوئی انشائیہ نگار معترض نہ ہو تو بے شک انشائیہ سمجھ لیں) اور بہت سے نقص ہوں گے وہاں سب سے بڑا' حقیقی اور واقعی نقص اس میں یہی ہے کہ ان پر نام "نصیر انور" کا ہے' سعادت حسن منٹو کا نہیں اور یہی ایک ایسا نقص ہے جس کا دور کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ لہٰذا تمام نقادان فن سے التماس ہے کہ وہ اس سے درگزر فرمائیں۔" (ص 17' 18)

مجھے امید ہے کہ علوی کی اس انتہائی کٹیلی طنز کی کاٹ سے بچنے کے لیے قاری اس "نقص" سے درگزر کرتے ہوئے اس کتاب کی پذیرائی اس کے محاسن کے شایان شان کریں گے اور علوی کے اس کٹیلے طنز کے پیچھے چھپے ہوئے مفہوم سے بخوبی لطف اندوز ہوں گے۔

پروفیسر افضل علوی
کی دلچسپ اور دلآویز تصانیف
جنہیں ہر صاحبِ ذوق کی لائبریری میں شامل ہونا چاہیے

(۱) دیکھ لیا ایران (سفرنامہ)
(۲) باعثِ تحریر آنکہ (طنز و مزاح)
(۳) ناقابلِ فراموش (حقیقتانے)
(۴) عقل و ایمان کے شکاری

پنجاب بُک سنٹر الوہاب مارکیٹ اُردو بازار۔ لاہور

احمد ندیم قاسمی

حمد

مجھے رنگ دے
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے
تُو جو مہر و ماہ کی کائنات کا حسنِ کارِ عظیم ہے
تُو جدید سے بھی جدید ہے، تُو قدیم سے بھی قدیم ہے
مجھے رنگ دے
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے
تُو حسیب بھی، تُو حفیظ بھی، تُو رحیم ہے، تُو کریم ہے
تُو بصیر بھی، تُو نصیر بھی، تُو کبیر ہے، تُو علیم ہے
مجھے رنگ دے
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے
تُو مرے خیال کے گلشنوں میں بسا مثالِ شمیم ہے
تُو مرے یقین کی وسعتوں میں خرامِ موجِ نسیم ہے
مجھے رنگ دے
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے
تُو جمال بھی، تُو جمیل بھی، تُو خبیر ہے، تُو علیم ہے
یہ حروف تیری امانتیں، یہ ندیم تیرا ندیم ہے
مجھے رنگ دے
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے

شمس الرحمٰن فاروقی

نامکمل سوانح حیات

باب سوم

اداسی

مرے دل میں دریائے مواج سی
اٹھ رہی ہے، یہ ایسا سمندر ہے جس میں
کبھی جزر آتا نہیں ہے
یہاں مد ہی مد ہے (۵)
گونجتا ہے یہ پنجم میں استاد فیاض خاں کی گرج دار آواز کی طرح
لیکن مری جاں میں اب وہ
توانائی باقی نہیں ہے جو آواز کے قہر
سینے میں خون اور دھوئیں کی تب و تاب
اک بے اماں تھرتھری، سنسناہٹ، فشارِ حواس و تخیل (۱۰)
کو ہنس کھیل جائے، اٹھالے،

میں جو یہاں اس طرح، بے ہوس و بے حواس
جیب میں تنہائی کے نامۂ الفت بھرے
سینکڑوں پیغام عشق ایک سے اک دل فریب
(عادت خورشید گیر مزد و مجرد شدن (۱۵)
چند بہ کردار ماہ خیل و حشم داشتن)
منتظرِ جلوۂ طورِ عدم، سرنگوں، بے بصر و بے صدا
ہر شے سے دور ہوں
کون ہوں میں؟ کون ہوں؟
اب تو مجھے ٹھیک سے نام بھی اپنا، پتہ (۲۰)
اور وطن، ذات پات
کچھ بھی نہیں یاد، لیکن یہ تو ہے، زخمی ہیں
پاؤں، سر، آنکھیں، زباں
میں تو تنہائی کا سچا معشوق تھا، میں تو وہی ہوں، کبھی جو
سب کچھ چھوڑ کر، صرف اپنے ذہن کو راہ نما جان کر (۲۵
گھر سے چلا تھا کہ اب چل کے سخر کروں رازِ حیات و وجود۔
بارش کے معجزے، دھوپ کا جادو
نئی کھیتیوں پر روشنی
اور ہوا کا جمال، سوئی کی بھی نوک سے
چھوٹا اک جاندار، لاکھوں کروڑوں رقیب (۳۰)
لیکن وہ رحمِ مادر میں پہنچتا ہے محفوظ، کہ تکمیل ہو
مقصدِ تکوین کی
لیکن وہ جوش، وہ قوت، جو قطرے کو ناپید سے
پیدائی بخشتی ہے کیا وہ عشق ہے؟ یا شہوت
ہے؟ اسے ہم سیلِ آفرینش کا ریلا کہیں (۳۵)
یا یہ فقط اندھے جذبات کی تسکین ہے؟
اور اگر آفرینش کا یہ سب کھیل ہے

کون ہے اس کا تماشائی پھر؟ ہم اگر
اس کے کردار ہیں، مالک اس کھیل کا کون
مصنف ہے کون؟ اور اسے (۴۰)
فائدہ اس سے ہے کیا؟ اس میں کیا
کچھ استحصال کی بو نہیں؟ یا جور کا
شائبہ بھی کچھ نہیں؟

میں اس مسئلے کو نہ حل کر سکا، میں فقط
سوچتا ہی رہا ——
حرص میں، اور ہوا میں (۴۵)
(اے رفیقاں زیں مقیل وزاں مقال
اتقوا ان الھویٰ حیض الرجال)
کھپا دینے میں جان کو عشق کے نام پر، فرق کیا ہے؟
(لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا)
(۵۰)

بزرگوں کا کہنا ہے یہ عشق بھی شان ہے
مردمی کی۔ رجل ساز قوت
جو انسان رکھتا ہے، عاشق وہی ہے
(تو کیا پھر مقیموں کو تابِ محبت نہیں ہے؟)
کروڑوں زمیں کے یہ حشرات یہ دام و دو (۵۵)
کون سی ہے وہ قوت جو ان کو مساتا سحر اور
سحر تا مسا پیٹ بھرنے کی کوشش میں
جنگ و جدل، سعیِ تولید میں محو رکھتی ہے؟

اخلاق کا ضابطہ ان کا کیا ہے
تو کیا عشق سے ان کو بہرہ نہیں؟

اور میں؟ (۶۰)
میری شانِ رجولی کا ہے دوسرا نام عشق، اور
یہ عشق ہی جہدِ ہستی کی بنیاد ہے
(عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دم بدم)
(۶۵)

بات ہر پھر کے واپس وہیں آگئی
دائرہ عقل کا تنگ ہے، لیکن اتنا نہیں
جو بنائے اسے پھر وہ واپس وہیں آئے گا
(ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قد
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں)
(۷۰)
اور ٹھہرے تو مشکل، جو بھاگے تو مشکل
(چو غوغا کند بر دلم نامرادی
من اندر حصارِ رضا می گریزم)
لیکن یہ رضا کیا ہے؟ کس بات پہ راضی ہوں؟
کچھ اصل بھی ہے میری؟ سایہ ہوں کہ ہستی ہوں؟
نیوٹن نے کہا مجھ سے، دنیا تو مشینی ہے (۷۵)
کچھ شکلیں ریاضی کی، اشکال قلیدس کے
قانون کچھ اشیا کی حرکت کے، سکونت کے
بس جان لو ان کو، پھر دنیا ہے اک آئینہ
ہے عکس فگن جس میں وہ روئے خداوندی (۸۰)

مبدأ ہے جو معنی کا اسرار کا سرچشمہ
ہر چیز اسی کی ہے، ہر چیز اسی سے ہے

نیوٹن کو کیا پامال اس عہد کی دانش نے
جس نے یہ کہا
سمجھو، ہر چیز اضافی ہے
ہاں وقت اضافی ہے تم جس کو مکاں
کہتے ہو، وہ بھی اضافی ہے
ٹھہراؤ اضافی ہے، حرکت بھی اضافی ہے

کوئی ایک صدی پہلے اک بچہ معلم سے
کہتا تھا کہ اقلیدس کچھ باتوں کو کہتا ہے
واضح ہیں بذات خود، بنیادی، اصولی ہیں
بالکل متعارف ہیں، مانو انھیں بے حجت
تب بڑھ سکو گے آگے، اشکال کو ہے حاجت
اثبات و دلائل کی، بنیادی مسائل سب
بے بحث ہی ثابت ہیں
لیکن یہ ریاضی ہے یا اندھی عقیدت ہے؟
یہ محض توہم ہے، منطق کی کسوٹی پر
جو چیز نہ ثابت ہو میں اس کو نہ مانوں گا

پھر اپنی جوانی کا اس بچے نے کیا صرفہ
اثبات ریاضی میں منطق کے دلائل سے
دن رات اسے دھن تھی
منطق سے ریاضی کو ثابت ہی کروں گا میں
آخر کو ہوا معلوم
کیا ہندسہ کیا اعداد، موسیٰ کے مسائل یا
پیچیدہ ارثماطیق، موہوم ہیں سب کے سب
افلاک میں منطق کے اصل ان کی نہیں گہری
یہ دشت ہے تمثیلی، جو مان لو وہ سچ ہے
پھر چھوڑ دی امید اس نے سچ بات کو پانے کی
(ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں

اکیلا یہاں میں مرا ذہن اور روح کی رات تاریک
کہاں سے انوکھی اداسی یہ اٹھی ہے
جیسے سمندر کی لہریں بلندی سے بہتی ہوئی
عریاں سیہ زنگِ چٹان پر......
جاؤں میں؟ اب اٹھوں؟ بھاگ جاؤں؟
(نیاز عطا واشتم تا بہ اکنوں
نیازم نہ ماند از عطا می گریزم)

حواشی

مصرع ۱-۳

مصرع ۱۵، ۱۶ یہ شعر خاقانی کا ہے۔

مصرع ۴۷، ۴۸ یہ شعر مولانائے روم کا ہے۔

مصرع ۵۰ یہ مصرع میر کا ہے۔

مصرع ۵۱ - ۵۳
مصرع ۶۱ - ۶۲
عشق مجازی کا مادہ رجولیت ہے، اور جبکہ عشق، مجازی سے حقیقت کو پہنچا، پھر رجولیت کی حاجت نہیں۔ اس واسطے اول عشق کو رجولیت درکار ہے اور مشاہدۂ معرفت تشبیہہ کو حضرت عمرو بکر ضرور ہے

سید یوسف علی شاہ چشتی نظامی

"شرح یوسفی بر دیوان حافظ"، صفحہ ۱۰۹

مصرع ۶۴، ۶۵ یہ شعر اقبال کا ہے۔

مصرع ۶۹، ۷۰ یہ شعر ناسخ کا ہے۔

مصرع ۷۲، ۷۳ یہ شعر بھی خاقانی کا ہے۔

مصرع ۷۶ - ۸۰ نیوٹن کی سائنس نے ہمیں بتایا کہ کائنات ایک مشین کی طرح ہے جس کی حرکت کو ریاضی کی اشکال کے ذریعہ سمجھنا ممکن ہوگا۔ قلیدس = اقلیدس

مصرع ۸۳ - ۸۸ اس کے برخلاف آئن سٹائن نے ثابت کیا کہ حرکت اور سکون اضافی ہیں۔ یعنی اضافی سے مطلق کو سمجھنا ممکن نہ ہوگا اور شاید کائنات خود اضافی ہے۔

مصرع ۸۹ تا ۱۰۸ برٹرنڈ رسل کو بچپن میں اقلیدس پڑھائی گئی لیکن اس نے "واضح بالذات"، اور "متعارف"، اصولوں کو منطقی ثبوت کے بغیر ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر اس نے اپنی نوجوانی کا بڑا حصہ ریاضی کی منطقی بنیادوں کو دریافت کرنے کی کوشش میں لگا دیا۔ آخر کار اسے ناکامی ہوئی۔ تفصیلات کے لئے [illegible] ملاحظہ ہو۔ "کوئی"، بروزن فع۔

واضح بالذات =
متعارف (علم متعارف) =
بنیادی مسائل (بنیادی مقدمات) =
ہندسہ =
اعداد =

موسیٰ = محمد موسیٰ الخوارزمی (تقریباً ۸۰۰، تا تقریباً ۸۵۰) مسلمان ماہر ریاضی و ہیئت ج
مسائل اعداد پر بڑا کام کیا۔ ریاضی کی مشہور شاخ   کا نام اسی
سے مشتق و منسوب ہے۔

اثماطیق = ارثماطیقی =

مصرع ۱۰۹ یہ مصرع میر کا ہے۔

مصرع ۱۱۰ سینٹ جان آف دی کراس
کا مشہور اصطلاحی فقرہ ہے۔

مصرع ۱۱۱-۱۱۳

مصرع ۱۱۵، ۱۱۶ یہ شعر بھی خاقانی کا ہے۔ اِس قصیدے کا ایک شعر مصرع ۷۲، ۷۳ پر نقل ہوچکا ہے۔

ناہید قاسمی
اُردو نظم کی دنیا میں ایک الگ سے پہچانے جانے والی آواز
ناہید کی شاداب نظموں کا مجموعہ
بنجرِ دل سیراب کر
نامور نقّاد پروفیسر فتح محمد ملک کے دیباچے کے سا
شائع ہوگیا ہے قیمت : ۱۲۰ رو
اس میں جدید تر اُردو نظم کے پاکیزہ معیاروں کی بھرپور نمائندگی ہوئ
مکتبۂ فنون۔ ۶/۳۹ ملک چیمبرز، لوئر مال۔ لاہور
التحریر۔ کبیر سٹریٹ۔ اُردو بازار۔ لاہور

شاعر: جان مشکن لئی (جنوبی افریقہ)

ترجمہ: کشور ناہید

مجھے اس آگ میں منڈیلا نظر آرہا ہے

آپکو اب انتظار نہیں کرنا پڑے گا، اُس وقت تک
جب تک کہ آسمان کی نیلاہٹیں ہویدا ہوں
آپ مُڑ کر دیکھیں
اُوپر اور نیچے، نئی روشنیاں جگمگا رہی ہیں
آسماں نے وحشتوں کے رنگ بہت دفعہ پہنے ہیں
بہت صدیوں تک زمین، اذیتوں میں مبتلا رہی ہے
اور اب، اس سرزمین پر
سچ کی صدیاں اُتر رہی ہیں
یہ سچ ، یہ صدیاں
نئی روشنی کی بہار دکھائیں گی
یہاں پر اردگرد آگ ہے
یہ جگہ گرم ہے
میں گرم ہوں
اور میں بہت آرام سے ہوں
یہ اس شخص کی زندگی کے باعث ہے
کہ آسمان میں نئی روشنیاں تحریر کرنے آیا ہے
وہ سارے زمانے جب نفرتیں شعلہ زن تھیں
ان اندھیروں نے تو آسمان کی نیلاہٹوں کو بھی
نقاب پوش کر دیا تھا

اور اب آنے والے زمانوں میں بھی
جہاں اب بھی کالا دُھواں چمنیوں سے اُٹھ رہا ہے
یہ شخص آسمان میں اپنے کارنامے تحریر کرنا چاہتا ہے
یہاں پہ اردگرد آگ ہے
یہ جگہ گرم ہے
میں شعلہ زن ہوں
اور میں پُرجوش ہُوں
یہ خاموشی کے تحفّظ کے لیے نہیں ہے
کہ اس شخص نے اپنے ہاتھ رہنمائی کے لیے آگے
بڑھائے ہیں
اس شخص کے حرفوں کی قوت فضا میں لہراتی ہے
اس شخص کی آنکھوں کی قوت سے آسمان جگمگاتا ہے
بے صبری سے انتظار میں گزرنے والے برسوں کی پیاس
بُجھ رہی ہے
یہ شخص آسمانوں میں ٹھہرے دھوئیں کو صاف کرنے کا عزم
لیے آگے بڑھ رہا ہے

یہاں پہ اردگرد آگ ہے
کوئی قیدخانہ اس آگ کو
اس شخص کو اندر سے بھسم نہیں کر سکا ہے
مجھے یہ آگ منڈیلا میں نظر آرہی ہے

شاعر: رابرٹ فراسٹ

ترجمہ: کشور ناہید

دیوار کی بخیہ گری

یہاں کچھ ایسا ہے
کہ جو دیوار کو پیار نہیں کرتا ہے
کہ جو زمین پر جمی برف کی باطنی تہ کو زمیں دوز کرتا ہے
اور چمکتی شفافیت کو سُورج سے ہمکلام کراتا ہے
اور ایسا خلا قائم رکھتا ہے
کہ دونوں حلاوتیں، آمیز ہو سکیں
شکاریوں کا کام کچھ اور چیز ہے
میرا کام ان کے بعد شروع ہوتا ہے
انھوں نے محض ایک پتّھر پر دُوسرا پتھر نہیں جمایا
بلکہ شکاری کتّوں کے پیکنے کے لیے
خرگوشوں کو ڈربوں سے نکال کر چھوڑ دیا ہے
یہ ایسا خلا ہے کہ جس کے بارے میں
نہ کبھی دیکھا، نہ سُنا
مگر بہار کی استراحت کے زمانے میں
ہم اِسے موجود پاتے ہیں

میں اپنے ہمسایوں کو کہساروں سے آگ
بتا

اور ایک دن ہم ملتے ہیں
حدِ فاصل کے خط کو کشید کرنے
اور دیوار کو اُٹھانے کے لیے
ہم رشتے کے دونوں کناروں پہ دیوار قا
تاکہ ان ستونوں کو تھاما جا سکے جو ایک
گر
ان میں سے کچھ رُوئی کے پیڑوں جیسے ہیں ا
ہمیں انھیں متوازن رکھنے کے لیے ایک مچا
” وہیں ٹھہرو! جہاں کہ تم ہو، جب تک

ان کو سنبھالتے ہُوئے ہماری اُنگلیاں دُکھ
یہ ایک اور قسم کا کھیل ہے
جو کبھی ایک طرف کو حد سے بڑھ سکتا

لہ ہمیں دیوار کی ضرورت نہیں رہتی ہے
ب مکمل صنوبر ہے
یں —— سیبوں سے بھرا باغ !
اُسے بناتا ہُوں
ے سیب کے درخت کبھی چل کر نہیں جائیں گے
ں کے صنوبر کے ثمر کو چکھ سکیں

رف اِتنا کہتا ہے
ی باڑیں اچھی ہمسائیگی نبھاتی ہیں ”
ے اندر بہار شرارت کی طرح سر اُٹھاتی ہے
مجھے حیرت ہوتی ہے
یں اس کے دماغ میں ایک نکتہ ڈال سکتا ہوں !
چھے ہمسائے آخر کیوں بنیں! آخر کیوں ؟
ہ نہیں ہوتا کہ کہیں پہ گائیں ہوتی ہیں
ہیں پہ گائیں نہیں ہوتی ہیں
ں دیوار بنانے سے پہلے یہ جاننا چاہوں گا
ں پس دیوار کیا رکھ رہا ہوں
، دیوار کے اندر کیا ہے
آخر کس کو پناہ دینے والا ہُوں
ں کچھ ایسا ہے
جو دیوار کو پیار نہیں کرتا ہے
دیوار کو منہدم دیکھنا چاہتا ہے
میں اُسے “شرارت” کہہ سکتا ہوں
مگر یہ واقعی شرارت نہیں ہے
میں یہ باور بھی نہیں کرتا
یہ خود کلامی بھی ہو سکتی ہے
میں اُسے وہاں دیکھتا ہوں
مضبوطی سے پکڑ کر وہ ایک پتھر کو آگے بڑھاتا ہے
پھر دونوں ہاتھوں میں پتھروں کو وحشت آمیز کرتا ہے
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اندھیرے میں آگے بڑھتا ہے
محض جنگلوں یا درختوں کی چھاؤں میں نہیں
وہ اپنے باپ کے قول کے مطابق نہیں چلے گا
اُسے پسند ہے کہ پہلے خوب سوچ سمجھ لے
وہ پھر کہتا ہے:
“اچھی باڑیں —— اچھی ہمسائیگی بناتی ہیں”

توصیف تبسم

تماشا

عجب شعبدہ گر تھا جس نے
بھرے چوک میں نوکِ خنجر سے خود اپنی آنکھیں نکالیں
ہتھیلی پہ رکھیں
ہوا میں اُچھالیں
تو ہر سمت سے شورِ تحسین اٹھا !
زباں لوتھڑے کی طرح دھم سے جب طشت میں آگری
اور بدن پر کشیدہ لکیروں سے قطرے لہو کے ٹپکنے لگے
تو تماشائی آنکھیں
تماشا بنی دیکھتی تھیں !
مگر شام کو جاتے سُورج نے جب اپنی ساری تھکن
پوٹلی کر کے کاندھے پہ رکھی
تو وہ چوک خالی پڑا تھا !
سبھی اپنے اپنے گھروں کی طرف
چل دئیے تھے
مگر اُن کے لب دوختہ تھے
کسی کے بھی چہرے پہ آنکھیں نہیں تھیں !

ایوب خاور

تمھیں جانے کی جلدی تھی

جانے کی جلدی تھی
جلد بازی میں
نے لمس کی کرنیں، نظر کے زاویے، پوروں کی شمعیں
میرے سینے میں بھڑکتا چھوڑ آئے ہو

تکیے کے نیچے
رے رنگ کی ٹوٹی ہوئی سانسیں
زائیدہ خوشبو کے تازہ خوانچے
شکنوں میں گرے کچھ خوبرو لمحے
روم میں ہینگر سے لٹکی ایک صدرنگی ہنسی کو
بس اچانک ہی پسِ پردہ لچکتا چھوڑ آئے ہو

جانے کی جلدی تھی
ل خام میں بھیگی ہوئی حیرت کو دروازے پہ ساکت
اور اپنے نرم آنچل میں سلگتی گفتگو
اِک آتشیں سِل پر دہکتا چھوڑ آئے ہو

تمھیں جانے کی جلدی تھی
اب ایسا ہے کہ جب بھی
(بے خیالی میں سہی لیکن) کبھی جب اس طرف نکلو
تو اتنا یاد رکھنا
گھر کی چابی صدر دروازے کے بائیں ہاتھ پر اک خول میں
رکھی ملے گی
اور تمھیں معلوم ہے کپڑوں کی الماری ہمیشہ سے کھُلی ہے
سیف کی چابی تو تم نے خود ہی گُم کی تھی، سو وہ تب
سے کھُلا ہے

اور اُس میں کچھ تمھاری چوڑیاں
اک آدھ انگوٹھی اور اس کے بیچ میں کچھ زرد لمحے
اور اُن لمحوں کی گرہوں میں بندھی کچھ لمس کی کرنیں،
نظر کے زاویے، پوروں کی شمعیں اور سنہرے رنگ کی
ٹوٹی ہوئی سانسیں ملیں گی اور وہ سب کچھ جو میرا
اور تمھارا مشترک سا اک اثاثہ تھا، سمٹ پائے تو
لے جانا

مجھے جانے کی جلدی ہے

گلزار

خبر ہے

نظامِ جہاں پڑھ کے دیکھو تو کچھ اس طرح چل رہا ہے !
عراق اور امریکہ کی جنگ چھڑنے کے امکان پھر بڑھ گئے ہیں
"الف لیلیٰ" کی داستاں والا وہ شہرِ بغداد بالکل تباہ ہو چکا ہے !
خبر ہے کسی شخص نے گنجے سر پہ بھی اب بال اُگانے کی اِک پیسٹ ایجاد کی ہے
کپل دیو نے چار سو وکٹوں کا اپنا ریکارڈ قائم کیا ہے
خبر ہے کہ شہزادی ڈائینا اور چارلس اب کرسمس سے پہلے الگ ہو رہے ہیں
کروشا اور سلوانیا بھی الگ ہونے ہی کے لئے لڑ رہے ہیں
پلاسٹک پہ دس فی صدی ٹیکس پھر بڑھ گیا ہے
یہ پہلی نومبر کی خبریں ہیں ساری
نظامِ جہاں اِس طرح چل رہا ہے !

مگر یہ خبر تو کہیں بھی نہیں ہے
کہ تم مجھ سے ناراض بیٹھی ہوئی ہو !
نظامِ جہاں کس طرح چل رہا ہے ؟

یحییٰ خالد

کون مجھے مصلوب کرے

میری سوچ کا محور کیا ہے ؟
میرے لفظوں میں یہ جھوٹ کی چیخیں
میرے حرف صلیبیں میری
جن کو کاندھے پر رکھے میں
ایک کھلے میدان کو ڈھونڈنے
قریہ قریہ بستی بستی گھوم رہا ہو

کسی بھی شہر کسی بستی میں
کوئی کھلا میدان نہیں ہے
جس جا مجھ کو
وہ آکر مصلوب کرے جو
جھوٹ سے ساری عمر بچا ہو

مجھ کو ہر بستی کے چوک میں
جو ملتا ہے یہ کہتا ہے
کون تجھے مصلوب کرے گا
یاں تو ہر چہرے کے پیچھے
کتنے جھوٹے چہرے ہیں

میری طلب بھی جھوٹ نہیں ہے
بستی والے بھی سچے ہیں

سیّد مبارک شاہ

ایک ناگفتہ دُعا

کوئی ماں جب یہ کہتی ہے
"خدایا میرے بچّوں کو قیامت تک سلامت رکھ"
تو بچے مسکراتے ہیں
قیامت تک سلامت کس کو رہنا ہے !
مگر ماں کی دُعاؤں میں عجب تاثیر ہوتی ہے
سبھی بچےّ قیامت کی گھڑی تک ہی تو جیتے ہیں
کہ وہ جس وقت مرتے ہیں
وہی ماں کے لیے روزِ قیامت ہے
خداوندا !
اے ماں کی دُعاؤں کو تقبّل بخشنے والے
مِرے گھر میں
کِسی ایسی قیامت سے ذرا پہلے . . . .

خداوندا ! خداوندا !

کاوش عباسی

ہر طرف آگ ہے

ہر طرف آگ ہے
اور اِس آگ میں میری دُنیا کے بے زور انسان جل مر رہے ہیں
کوئی راستہ ہے نہ اپنا مددگار کوئی
جو ہو بھی تو اس سے ہمیں کب سروکار کوئی
ہمیں آگ میں جلنے
یا آگ کے خوف میں بے جہت بھاگنے ہی سے فرصت کہاں ہے
ہم اَپنے تحفّظ کی تدبیر کر پائیں، اپنی یہ قسمت کہاں ہے
بس اِک آخری آس ہے اُس بڑے ایک طوفان سے
جو کہتے ہیں جب بھی جہاں بھی اُٹھا ہے
دَبی، کُچلی انسانیت کی ضمانت بنا ہے
جو آیا تو سمجھو ہر اُفتاد، ہر آگ کا خاتمہ ہے

(ریاض)

ڈاکٹر وحید احمد

سارا دن

جب پھوٹی کونپل دھوپ کی — ہم گھر سے نکلے
پھر شہر کی بہتی دھار میں — ہلکورے کھائے
اِک لہر کی دست درازیاں — ساحل پہ لائیں
اِک ریستوران میں چائے پی — اور جسم سکھایا
اب دھوپ درخت جوان تھا — چھتنار ہوا تھا
سو ہم نے تنہا ریت پر — تنہائی تانی
اور اس کے نیچے رنگ رنگ — کی باتیں کھولیں
کچھ باتیں گزرے وقت کی — جو ہم نے دیکھا
کچھ آنے والے وقت کی — جو کِس نے دیکھا
کچھ سرسوں دن کھلیان کی — لچکیلی، پیلی
شب آنکھیں سم پھنکارتی — چمکیلی، نیلی
کچھ شامیں رنگ اُچھالتی — گہرا نارنجی
کچھ روز و شب بے کار سے — بے جاں، شطرنجی
جب گھر لوٹے تو شام کی پت جھڑ ہوتی تھی
جو لمحہ گرد تھی — کپڑوں سے جھاڑی
جو بہتی دھار کے خار تھے — پاؤں سے کھینچے
پھر دونوں نے دہلیز پر — آوازیں رکھ دیں
اور آنکھیں بجھتی روشنی کے ہاتھ میں دے دیں

فرزانہ رضوی

ایک تخریب کار نے کہا

کبھی کبھی تھک جاتے ہیں
خطرے بھی منڈلاتے ہیں
تب دل میں آندھی اُٹھتی ہے
اَن دیکھی سی، انجانی سی
اِک طاقت بڑھتی جاتی ہے
سیدھے ہاتھ کی ہر ہر نس تن جاتی ہے
اندر کی گہرائی سے یہ خواہش اُوپر آتی ہے
دُنیا کے اس گولے کو مٹھی میں لے کر
زور سے پھینکیں
چُھپکے چُھپکے دُور سے دیکھیں
حال ہے کیا، اور گری کہاں
ہم سب کی یہ دھرتی ماں

گولیاں

میٹھی گولی گری ہاتھ سے
دھات کی گرم گولی گئی پیٹ میں
ایک بچّہ سڑک پر گرا
پہلے بھگدڑ مچی
دیکھتے دیکھتے پھر وہاں
ہُو کا عالم ہوا
زندگی کی رمق آخری بار بھڑکی
تو آنکھیں ہوئیں نیم
دھندلی نظروں کی گویائی نے چیخ کر
"ماں" کہہ
بات پل بھر کی تھی، روشنی بجھ گئی
اور خموشی صدا دے کے چُپ ہوگئی

اعجاز رضوی

درخواست

سُورج بابا!
آج ہمیں چھٹی دے دو
آج ہمارے بدلے دفتر تم جاؤ
دیکھو کتنی صدیاں گزریں ہم نے تو
روز تمھاری جانب سے آنے والا
مشکل سے مشکل فرمان نہیں ٹالا

سُورج بابا!
آج ہمیں چھٹی دے دو
آج ہمارا جی کرتا ہے، باغ جناح اور مال روڈ پر پھرنے کو
کچھ لکھنے کو اور بہت کچھ پڑھنے کو
اپنے یاروں اور عزیزوں سے ملنے کو
سُورج بابا!
ہم انسان ہیں، پھر ہم کو
ہر دم اپنے ساتھ لیے تم کیوں پھرتے ہو
گھر اور دفتر
مل اور بھٹہ یا پھر چکّی
ہر اک جا پر تم ملتے ہو، جو تم چاہو وہ کرتے ہو
سُورج بابا!
ہم کو اپنے چکر سے آزاد کرو
ہم انسان ہیں ہم پر یہ احسان کرو
آج ہمارے بدلے دفتر تم جاؤ!

قائد اعظمؒ کے لیے

پھول سے ہاتھ تھے
جو مری راہ سے
خار چنتے رہے

زخمی پوروں سے جو
میرے کل کے لیے
خواب بنتے رہے

سعید احمد

ہوا کے سوال

غبارِ غم میں کھلے گلوں کا خیال باقی
نہ لمحۂ عیش و عشرتِ جاوداں میں پھیلا ملال باقی
سفر میں یوں خود سے بے خبر ہو کے ہم چلے ہیں
عروجِ ذات و حیات باقی رہا نہ عہدِ زوال باقی

مگر ہوا پوچھتی پھرے ہے
سراب سوچوں کے دشت میں دیر سے بھٹکتے
ہوئے مسافر
دُ اسے بھلا کون سی تمنّا —
کے رنگ و نکہت کے آئینے میں اُتار دُوں میں
[جو خواہشوں کے حصار میں ایک نقطۂ مرکزی لگے ہے]
جنوں کے کس خواب کے حوالے سے
زندگی موت اس کے ابرو کی ناتواں سی
بس ایک جنبش پہ وارنے کا پیام دے کر
کوئی "لکیرِ وفا" نما اس کے سنگِ دل پر اُبھار
دُوں میں
شکستِ دل کے جواز کیا مشتہر ہوں جن سے
اَنا کے کہسار میں نہاں دکھ تمام اس کے
تری نظر سے گزار دوں میں

کوئی بتاؤ ہوا کو آخر جواب کیا دیں
کہ ایک اِک آرزو، تمنّا کا آئینہ زنگ خوردہ سا ہے
ندیم صبحیں، کریم شامیں
کمال گمنامیوں کے بوسے وجود پر ثبت کر رہی ہیں
تمام عشّاق نے رہِ عشق کے سفر میں
سنبھل سنبھل کر قدم بڑھانے کا نسخۂ کیمیا دلوں ۔
لگا رکھا ہے
قرارِ بے کیفیٔ بلاخیز کے سبب سے
نہ جیت کا سلسلہ ہے کوئی
نہ ہار کا احتمال باقی
فقط ہوا کے سوال باقی

اقبال حیدر

مجھے نزدیک آنے دو

تم انگشتِ شہادت
رائفل کی لبلبی پر رکھ کے
.... مجھ سے بات کرتے ہو
میں دونوں ہاتھ
اُوپر کو اُٹھائے ہوں
مگر تم مجھ سے ڈرتے ہو
تمھیں کچھ یاد تو ہو گا

ہمارے درمیاں
بندوق کی نالی کے بل پر
گفتگو کا یہ طریقہ کب سے رائج ہے

مجھے بس یہ خبر ہے
بہ طریقہ جب سے رائج ہے
ہمارے اور تمھارے
... کتنے ہی پیارے
میں کا رزق ٹھیرے ہیں
بھی تم وار کرتے ہو
بھی میں وار کرتا ہوں
وراب کی شومئی قسمت

تمھارے ہاتھ میں بندوق ہے
.... اور میں نہتّا ہوں
مگر تم اپنی انگشتِ شہادت کو
.... ابھی جنبش نہیں دینا
مری اِک بات سُن لینا
یہ میری رائفل
تم نے جو دھوکہ دے کے چھینی ہے
مجھے معلوم ہے
... . بارُود ہے اس میں نہ گولی ہے
تمھیں معلوم ہے
بندوق میں گولی ہو تو اِک شخص ڈرتا ہے
اگر بندوق خالی ہو . . . .
..... تو پھر دونوں کو خطرہ ہے
سو ہم دونوں کے دل پر
ایک جیسا خوف طاری ہے
مجھے بھی جان پیاری ہے
تمھیں بھی جان پیاری ہے
میں دونوں ہاتھ نیچے کر رہا ہوں

تم بھی خالی رائفل کو اِک طرف رکھ دو
مرے نزدیک آؤ
..... یا مجھے نزدیک آنے دو
دِلوں کے درمیاں جو دوریاں ہیں
. . . . وہ مٹانے دو
چلو آؤ
مرے ہمراہ انگشتِ شہادت کو اُٹھا
یہ قسم کھاؤ
یہ انگشتِ شہادت
رائفل کی لبلبی تک اب نہ جائے گی
ہم اپنے دل کے آئینوں کو
مِل کر جگمگائیں گے
اندھیروں کو مٹائیں گے
ہمارے مسئلے مل بیٹھ کر
آپس میں طے ہوں گ
ہماری رنجشوں کے سلسلے
آئندہ نسلوں تک نہ جائیں گے

رخسانہ شمیم

چار نظمیں

خط کا پرندہ

آج بھی لیٹر بکس کو خالی
دیکھ کے میں نے
تیرے خط کی بابت
کچھ ایسے ہی سوچا
جیسے کسی کو خالی پنجرہ
دیکھ کے
اُڑ جانے والے پنچھی کا
دھیان آجائے!

پرانی کتھا

آدھی رینا بیت گئی ہے
لیکن اب تک
یاد کے چندا کی شیتل سے
آنکھ کے تال میں
اک جل سوسن مہکے جاتا ہے

آدھی رینا بیت گئی ہے
لیکن اب تک
من کے بن میں
ایک اکیلا پنچھی چہکے جاتا ہے

مرکز کی جستجو

اک بچھڑنا
وہ بھی ہوتا ہے، جو پہلی بار ہوتا ہے
مگر وہ آخری بن جایا کرتا ہے
کہ ماہ و سال کی ان گردشوں میں
بعض انساں
فاصلوں سے بھی
محض نزدیک سے نزدیک تر ہی
آتے رہتے ہیں

کہ جیسے یہ سفر
اک محیطِ دائرہ سے
سمتِ مرکز ہو رہا ہو

پرندوں کا خضر

شجر کو
حیران کن مسرت
کہ فاصلوں سے پرند لوٹے
مگر
یہ دریا کو ہی خبر ہے
کہ کون تھا ان کی رہبری میں

(جرمنی)

محسن شیخ

چار مختصر نظمیں

مشورہ

تو کیا ناخن سے تم پانی کے چہرے پر خراشیں ڈال سکتے ہو؟
تو کیا پتھر سے تم موجِ رواں کو توڑ لیتے ہو؟
تو کیا چلتی ہوا کو مٹھیوں میں بھینچ کر قیدی بنا لو گے؟
تو کیا تم میری سوچوں کو جلا کر راکھ میں تبدیل کر دو گے؟
اگر ایسا نہیں ممکن تو میرا مشورہ مانو
تم اپنی دشمنی کو بھول جاؤ اور مجھ سے دوستی کر لو

اندیشہ

ملا اِس بار وہ محسنؔ تو بس اِتنا کہا اُس نے
کہ ہم دونوں اناؤں کی تماشہ گاہ کے ایسے مداری ہیں
جنھیں اب ڈگڈگی کی تھاپ پر اپنی محبّت کے قصیدے
ہی سنانے ہیں
ہمیں بس اپنے چاروں سمت کھینچے دائروں کی حد میں
رہ کر پیار کے کرتب دکھانے ہیں
ہمیں ڈر ہے اگر ہم نے حصارِ دل سے ذرا باہر قدم رکھا
تو ہم اک دُوسرے کی چاہ میں سچ مچ نہ مر جائیں

جمود

یہ کیسی کہر میں لپٹا ہُوا سوُرج سَروں پر ہے
ابھی تک چوٹیوں کے ساتھ برسوں سے پرانی برف چپکی۔
کوئی دریا نہیں پگھلا
نشیبی راستوں پر تِلملاتی پیاس رقصاں ہے
جہاں اِک بُوند پانی کی ضرورت تھی
وہاں سیلاب لے آنے کی خواہش اب سمندر بن گئی۔

حُسنِ بے نمُو

یہ بھی کیا بیل ہے جس کے پھُولوں سے خوشبو نکلتی نہ
رنگ اس کے کوئی بات کرتے نہیں
پتّیاں اوس پینے سے معذور ہیں
موسموں کا اثر اس پہ ہوتا نہیں
شاخ سے کوئی پتّا بھی جھڑتا نہیں
کوئی کونپل نہیں پھوٹتی
رُت بدلتی نہیں
اپنے ماحول سے بے خبر، میری جاں !
سال ہا سال سے تیری دیوار کے ساتھ چپکی ہُو
کیا عجب بیل ہے !

شہزاد اظہر

انتباہ

سنو! خواہش سے خوابوں تک
تمنّا سے سرابوں تک
ہزاروں خوشنما رستے ہیں، لاکھوں کہکشائیں ہیں
دریچے ہی دریچے ہیں، نگاہیں ہی نگاہیں ہیں
سفر آغاز کر بیٹھے تو منزل تک پہنچنے،
اور بھٹک جانے کی صورت میں
کوئی حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہ پاؤ گے
میانِ دشت و صحرا دھوپ کے دھوکے میں آؤ گے
گمانِ آب میں آنکھیں چمکتی ریت پر رکھو گے
لیکن پیاس پاؤ گے
بڑی کوشش کرو گے تم مگر بھورے سمندر میں
بدن بے عکس پاؤ گے
اُسے بھی بھول جاؤ گے

تضاد

وہ دن جب
ہم بھی تصویریں بناتے تھے
خیالوں کی طلب میں
دھوپ اوڑھے گھومتے تھے اور
بہت ہی مطمئن لمحوں میں رہتے تھے
ستارے رات بھر چُنتے تھے اور سپنے سجاتے تھے
کئی نقشے بناتے تھے
مگر اب ہم کئی بے چہرہ لوگوں کی معیّت میں
حقیقت کو ترستے ہیں
بہت نامطمئن لمحوں میں رہتے ہیں
ستارے رات بھر آنکھوں میں چبھتے ہیں
مگر سپنے نہیں سجتے
مگر نقشے نہیں بنتے

افتخار بخاری

میں کہاں جاؤں گا

چلتے چلتے کسی ساحلِ صبح پر یہ ستارے
بھی کھو جائیں گے
اوڑھ کر کوئی جنگل پرانا یہ موسم
بھی سو جائیں گے
سب چلے جائیں گے
چاند برباد ٹیلوں کے پیچھے
کبوتر فسردہ مزاروں کی جانب
ہوا گم شدہ پانیوں کے پرے
راستے راستوں کی طرف
خواب اور بدلیاں
خاک اور تتلیاں
سوچتے آئینے
جاگتی کھڑکیاں
اپنے ہونے نہ ہونے کی سرحد میں کوئی
کبھی ٹھہرا نہیں
میری آوارگی مجھ سے آگے نکلنے لگی
رات ہے بیکراں
خالی پن اور تنہائیاں
ٹھیکری ٹھیکری ایک نوحِ زماں
جس پہ مٹتی کہانی کا میں ایک کردار ہوں
کس کو بھولوں گا میں !
کس کو یاد آؤں گا !
سب چلے جائیں گے !
میں کہاں جاؤں گا !

فرصت ہی نہیں ملتی

میں اپنی اُداسی سے
اک شام بناؤں گا
اک خواب کے بادل میں
اک چاند سجاؤں گا
اک یاد کے ساحل پر
اک وعدہ نبھاؤں گا
فرصت جو ملی جاناں!
میں تجھ کو ترے جیسی
اک نظم سناؤں گا
فرصت ہی نہیں ملتی!

افتخار بخاری

ناروں نے کہا تھا

ں پر بحرِ احمر کے کنارے
رکیوں میں چاند چمکاتے ہُوئے
ں جادوئی "ایکوا مرینا" میں
شام اتوار کی تھی
ریں کمرے میں بیٹھا فالتو سے وقت کو
اخبار سے بہلا رہا تھا
آج کا دن کیسے گزرے گا"
یہ دن کیسے گزرتے ہیں!"
ناروں نے کہا تھا
صبح کو سب اجنبی لوگوں سے کچھ محتاط رہنا
دپہر بزنس میں خاصا فائدہ ہے
پ کی یہ شب اُداسی سنگ بیتے گی
ہیں افسوس ہے"
ں شب وہاں پہ بحرِ احمر کے کنارے
ڑکیوں میں چاند چمکاتے ہوتے
ں جادوئی "ایکوا مرینا" میں
اداسی ایک لڑکی تھی

راشدہ کامل

میں مکمّل ہُوئی تو

میں کہ اک سادہ کاغذ تھی، اُس نے مجھے
اپنے لفظوں کی خُوشبو سے مہکا دیا
میں کہ اک خالی بن کی کہانی تھی جو
اُس کے ملنے سے تکمیل تک آ گئی
میں جو مہکی تو اُس نے
مری راہ میں
فاصلے رکھ دیئے
میں مکمل ہوئی تو —
مرے ہاتھ میں
زادِ رہ بھی نہ تھا فاصلوں کے لیے

نظیر اختر

علم کا حوالہ

سارا جنگل کٹ جائے گا
پیڑ کہیں نہیں پاؤ گے
ہری بھری شاخوں پر بیٹھے
شوخ پرندے
اُڑ جائیں گے
گیت ادھورے رہ جائیں گے
گھاس کی مخمل پر
اینٹوں کے ڈھیر اُگیں گے
دُود کشوں سے رِستی
کالی سانسوں کی حِدت سے
بادِ سحر کی پیشانی پر
پھولوں کی خوشبو کے بوسے
جل جائیں گے
عفریتوں کا شور
سکوں کی موسیقی کو کھا جائے گا
کھیتوں، کھلیانوں سے، ہجرت کرنے والے
بھولے اور معصوم پرندے
گندم کے خوشوں کے بدلے
آگ کی فصلیں کاٹیں گے
نیلے آکاش سے
انگاروں کا
بے مانگا مینہہ برسے گا
اور ہنستے بستے
شہر اور گاؤں
آئندہ نسلوں کے علم کا
ایک حوالہ بن جائیں گے

فرخ یار

کلاس رُوم

امنے رکھو
قید میں سب کھڑکیاں مدہوش رہنے دو
و کواڑوں سے پرے
ہیں، روپوش رہنے دو
، روشنی، منحوس آوازیں، ہمیں ڈسٹرب کرتی ہیں
ہیں کہ تم تاریخ کے دھارے بدل ڈالو
ہیں کھڑی خواہش قلم کر دو
و لیٹیں اپنی
نوچ لو ان کی جنھیں کب سے قبیلے میں
ے منصفی کا فرض سونپا ہے
زیں — ہمیں کیا واسطہ ان سے
علوم ہے اِس دھن سے ہم بیکار اچھے ہیں
، آہنی منصف قبیلے کے سبھی سردار اچھے ہیں
سامنے رکھو

نظر کو سامنے رکھو !
لبِ آزاد اچھا ہے مگر ہنگامہ — ہاؤ ہُو
مقدّر کی سیاہی سے معیّن زندگی
داغے ہوئے لوگوں کی جلتی خواہشوں کا آتشیں نوحہ
جسے دُنیا سمجھنے سے گریزاں تھی
جسے دُنیا سمجھنے سے گریزاں ہے
مگر چپ خوبصورت ہے
ہوا میں تیرتی تِتلی
ہمارے چار سُو اُٹھی فصیلوں پر چمکتی وردیوں میں آہنی
اجسام کی مانند

جسے ہم تم سمجھتے ہیں
جسے دُنیا سمجھتی ہے
نظر کو سامنے رکھو !

GRIL

توصیف خواجا

ہمزاد

رات پھر وہ خواب میں میرے مقابل آ گیا
آنکھ انگارہ ، لبوں پر خون کی گُل کاریاں
ہاتھ دونوں تھے دھوئیں کے
اور اُن میں ناچتی تھیں آگ کی دس اُنگلیاں !
سازشوں کی بُو میں لپٹے
قہقہے کے بعد یوں کہنے لگا
” تجھ کو خود میں شور کرتے پانیوں پر ناز ہے
دیکھنا میں تیرے چاندی پانیوں کو
زہر سے نیلا کروں گا ایک دن
اور اُداسی کے ہرے جنگل میں بکھراؤں گا پھر
تیری انا کے زرد بیج
پھیر دوں گا اس طرف شہرِ گماں کی آندھیاں
یوں تری شاخِ بدن کو
سبز سے پیلا کروں گا ایک دن !
اور تو بھی
دُھند میں لپٹی ہوئی
اُس دھیان کی رسّی میں بل کھائے گا
جس جگہ پر مَیں کھڑا ہوں
تُو وہاں آجائے گا ! “

رات بھر میں دھیان کی رسّی میں بَل کھاتا رہا
آندھیاں سہتا رہا
جب کرن پلکوں پہ چھکی
رسّیاں جلنے لگیں

اور وہ
آگ، انگارہ، دھواں اور زہر لے کر میرے اندر چھ
ڈھونڈتا ہوں اپنے اندر
پر نشاں ملتا نہیں
جانتا ہوں پھر مقابل آئے گا
ڈھونڈتا ہوں پر نشاں ملتا نہیں !

شہاب صفدر

سنہرا باب

ی تصویر کا موسم
مری تحریر میں جلوہ پیں ہوتا ہے
اور میں "خواب" لکھتا ہوں

ی تصویر میں اک چاند، پورا چاند
جب چہرہ دکھاتا ہے
یرے ذہن میں کچھ دائرے سے بننے لگتے ہیں
مگر میں سطحِ کاغذ پر
فقط "گرداب" لکھتا ہوں

ی تصویر میں کھلتے ہوئے کچھ پھول
جب خوشبو لٹاتے ہیں
مری سانسیں مہکتی ہیں
یں شاخِ قلم سے بس "گلِ شاداب" لکھتا ہوں

تری تصویر میں اڑتے پرندے
اپنی لے میں چہچہاتے ہیں
تو میں اک "نغمۂ نایاب" لکھتا ہوں

تری تصویر میں شام و سحر کا کچھ پتہ چلتا نہیں لیکن
یہ گہری دُھند چھٹتی ہے
تو میں "خورشیدِ عالمتاب" لکھتا ہوں
کتابِ زندگی کا اِک سنہرا باب لکھتا ہوں

ارشد نعیم

مایوسی اور اُمید کے درمیان

تمھیں کب لوٹنا ہے مجھ کو لکھو ؟
منتظر آنکھوں کے ٹھہرے پانیوں میں ۔
کائی جمتی جا رہی ہے
جو منظر کل تلک تازہ تھے ۔
دھندلانے لگے ہیں
یونہی بے کار بیٹھے شوق کے پنچھی بھی ۔
منقاروں کو زیرِ پر کیے ۔
گیتوں سے رشتہ توڑنے کی ۔
کشمکش میں مبتلا ہیں
ہمارے دل کا شیشہ
وسوسوں کے زنگ کی یلغار پر ۔
گریہ کناں ہے

مری جاں !
قبل اس کے گیت سب فریاد کی لَے میں
بکھر جائیں ۔
ہمارے ولولے ان راستوں کی خاک ۔
بن جائیں ۔ مجھے لکھو
تمھیں کب لوٹنا ہے ؟

نامقبولیت کی ساعت میں ایک نظم

جو دُعائیں ابھی مقبول نہیں ہو پائیں
اُن دُعاؤں سے تعلق کی نفی مت کرنا
وہ دُعائیں جو ترے اختیار میں بھی نہ تھیں
وہ دُعائیں جو مرے اختیار میں بھی نہ تھیں
وہ دُعائیں کہ جو لب چیر کے ۔
بہہ نکلی تھیں
اُن دُعاؤں سے تعلق کی نفی کیونکر ہو ؟
جو دُعائیں ابھی مقبول نہیں ہو پائیں

ایک نئی منزل کی طرف سفر

خواب جو تم نے دیکھ رکھے ہیں
خواب جو میں نے دیکھ رکھے ہیں
آؤ اپنے تمام خوابوں کو
وقت کی گرد سے جُدا کر کے
درد کی ساعتوں میں تہہ کر کے
کسی روزن میں ٹھونس دیتے ہیں
آخری بار ہنس بھی لیتے ہیں
آخری بار رو بھی لیتے ہیں

محمد حنیف

ہیر رانجھا

خت ہزارے کا
گلے میں ڈال کے گلیوں میں آوازیں دیتا ہے
وا سب آوازوں کو
کے اپنی چادر میں لے آئے گی
نچایت میں کھوئے گی
وں میں باتیں ہوں گی
ات کی بارش ہو گی
کی آنکھوں میں ہزاروں سوال اُگیں گے
ھر طنز کے تیر چلیں گے
دیواروں سے لپٹ کر روتی رہے گی ہیر سیال
کے کھیتوں میں اُگے گی چُپکے چُپکے فصلِ ملال
میں گر جائیں گے پھولوں کے تھال
سی سے پوچھ نہ پائے گا اُس کا احوال
ی بستی میں پڑ جائے گا خوابوں کا کال
ے رشتے ہو جائیں گے خواب و خیال
ے لُوٹ کے لے جائیں گے ہیر کا حسن و جمال
ہوائیں نوحے پڑھتی آئیں گی ہر سال

انیل چوہان

کانٹے کے لئے ایک نظم

میں نے ایک گلاب کو دیکھا
جس پر تتلی گھُوم رہی تھی
بڑھ کر اُس کو توڑنا چاہا
تو میری اُنگلی میں اک باریک سا نیزہ اُترا
پھولوں کا رکھوالا کانٹا
میرے لہو کے قطرے
اپنی نوکِ زباں پر تول رہا تھا
بول رہا تھا :
میں بھی بہار کا پروردہ ہوں
میں بھی نہایا ہوں شبنم میں
میں بھی پھول کا ماں جایا ہوں

ناھید قمر

حوالے مٹ نہیں سکتے

تجھے یہ ساتھ بھی شاید کسی دن چھوڑ جانا ہے
ترے ہمراہ چلنے سے بہت پہلے ہمیں یہ علم تھا
لیکن حقیقت جاننے اور پھر اسے تسلیم کرنے تک
سفر میں خوش گمانی کے بہت سے موڑ آتے ہیں
کبھی ان راستوں پہ ہم سے آگے جانے والوں کی
وہ سب باتیں محض افسانے لگتی ہیں
کہ جو منظر ہماری آنکھ سے اک بار اوجھل ہوں
دوبارہ پھر ہماری زیست کا حصّہ نہیں بنتے
کوئی اچھی رفاقت چھوٹ جائے اور کوئی ساتھی
اچانک اپنی سمتوں کے تعیّن سے
سفر کا سارا نقشہ ہی بدل ڈالے
تو اس کو یاد رکھنے کے حوالے ذہن سے بھی
مٹنے لگتے ہیں
مگر یہ تجربے یہ حادثے ہم پر نہیں گزرے
ہمیں اُمید اب بھی ہے
کہ جو منظر بظاہر آنکھ سے اوجھل نظر آئیں
وہ یادوں کے دریچوں میں کہیں موجود ہوتے ہیں
کوئی اچھی رفاقت چھُوٹنے سے اور کسی ساتھی کے جا
روابط کٹ نہیں جا
نظر آئے نہ آئے پر تعلق درمیاں موجود رہتا ہے
سفر کی سمت جو بھی ہو
مگر یادیں ہماری شخصیت کے لاحقے بن کر
ساتھ چلتے
اور اپنی یہ رفاقت، جس میں ہم نے
خواب، خوشیاں، خواہشیں، آنسو
اکٹھے مِل کے دیکھے ہ
کسی بھی موڑ پہ اس کو بھلانا سہل کب
سفر چاہے کوئی بھی ہو
ہوا کا منظروں سے
یاد کا دل کے دریچوں سے
نظر کا خواہشوں سے
اور ہتھیلی کا دعا سے
رابطہ ٹوٹا نہیں کرتا

مقصود وفا

خواہش ایک سوال

اے عمروں کے غافل لمحے
دیکھ! ہماری آنکھیں دیکھ
اور پیروں کے چھالے گن
دُور دراز کی مٹی میں ہیں صدیوں کے انبار
کتنے موسم آئے سفر میں
جانے کن کن ناموں کے
کتنی شاخیں، کتنے پتّے
کتنے سُورج دھول ہماری شاموں کے
کتنی راتیں ہجر کی ہیں اور کتنی صبحیں زخم ہُوئیں
اِن پیروں کے چھالے گن
اور ہماری پیٹھ پہ رکھے اس اسباب کو دیکھ
جس کے بوجھ میں دم گھٹ جائے
اُس افسوس کو دیکھ
ہاتھ ملیں تو خوں رستا ہے
دیکھ! لکیریں دیکھ
اے عمروں کے غافل لمحے گریہ زاری سُن
مچا ہُوا ہے کھوکھلے تن میں کس چُپ کا کہرام
ہم کس جنگل کی راتیں ہیں
کس صحرا کی شام
کن ہاتھوں نے جاری رکھا نامعلوم آغاز
کس مٹھی نے بھینچ لیا ہے راز بھرا انجام

ارشد لطیف

تین مختصر نظمیں

اصل شے محبت ہے

اصل شے محبت ہے
میں بھی اک عجوبہ ہوں
تو بھی اک قیامت ہے
میرے پاس بھی دل ہے
تیرے پاس بھی دل ہے
پھر بھی ہم کو مشکل ہے
خواب کے دریچوں سے
جھانکتی ہیں تعبیریں
ذہن و دل کی گلیوں میں
بھیڑ بڑھتی جاتی ہے

روشنی کی آنکھوں میں

روشنی کی آنکھوں میں
عکس ہیں اندھیروں کے
منتظر رہیں گے لوگ
بے خبر سویروں کے
الجھنیں دھڑکتی ہیں
سینۂ صداقت میں
شور بڑھتا جاتا ہے
سُست رو قیامت کی
عمر گھٹتی جاتی ہے
زندہ رہنے والوں کی
آس مرتی جاتی ہے

وفا کا روگ لگ جا

وفا کا روگ لگ جائے
تو پھر کیا عقل
پھر کیا ہوش
پھر کیا زندگی
اور موت۔
فقط اک بے کلی
جس کا تماشا
جاری رہتا ہے
نشہ سا طاری رہتا

(لندن)

سید عباس احمد

تنہا

میں جب اُس سے ملنے کو جاتا ہوں، تنہا
وہ خوشبو، جو گدرائی سی ساعتوں میں
اکھڑتے ہُوئے سانس تھامے ہوئے
میری آوازِ پا کی تمنّا میں اپنی سماعت بچھائے
قرن ہا قرن سے مری منتظر ہے
وہ خوشبو، جو ہستی کے موسم کے کتنے ہی پیلے گلابوں
کی آواز ہے
اپنے پیلے پروں سے شب و روز کے
دشتِ بے حد میں اُڑتی ہوئی ایک تتلی ہے
میں ایک سَت رنگے موسم کا دِن ہُوں
کہ اک چاندنی رات میں کہکشانی فضاؤں سے مبہوت جگنو ہوں
جانے میں کیا ہُوں
مجھے اپنی ہستی کا ادراک بھی تو نہیں ہے
وہ خوشبو، جو لڑھکی ہوئی سیڑھیوں سے اُدھر
گھاس میں تتلیوں کی طرح شوخ جذبوں سے
آراستہ اُڑ رہی تھی
مجھے میرے ہونے کا احساس دینے لگی تھی
وہ پیچھے سے آتی ہوئی
اک صدا ہے
میں اُس کو نئے جگمگاتے ہُوئے وقت
کے راستوں میں کبھی ایک پَل کو بھی
بھُولا نہیں ہوں
میں جب اُس سے ملنے کو جاتا ہُوں، تنہا

غافر شہزاد

یہ عالم خواب کا ہے

عجب سا خواب ہے :
آنکھیں کھلی ہیں، نیند گہری ہے
دکھائی کچھ نہیں دیتا
سنائی کچھ نہیں دیتا
یہ عالم خواب کا ہے !
بھاگتا ہوں میں کسی سائے کے پیچھے
پاؤں منکر ہیں
اچانک ایک سُورج
بادلوں کی اوٹ سے باہر نکلتا ہے
میں جس سائے کے پیچھے تھا
وہ میری پشت پر ہے
میں پلٹتا ہوں، مگر پاؤں پلٹنے سے ہیں منکر
نیند گہری ہے
دکھائی کچھ نہیں دیتا
سنائی کچھ نہیں دیتا
یہ عالم خواب کا ہے !

طوق

محمد سعید شیخ

بادشاہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عوام اتنی جلدی اور یوں اسے اپنی نظروں سے گرا دیں گے۔

ابھی کل ہی کی تو بات تھی جب اس نے اقتدار سنبھالا تھا تو رعایا نے اسے پھولوں سے لاد دیا تھا۔ لوگ باگ' ساری خلقت راستوں پر' سڑکوں' شاہراہوں پر امڈ آئی تھی۔ لوگ گھنٹوں سے بادشاہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے انتظار کر رہے تھے۔ ان سے اپنا شوق سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ ان کے چہروں پر خوشی کی تازگی تھی۔ ان کی آنکھوں میں اپنے بادشاہ کے لیے بے حد احترام تھا۔ ان کے ہاتھوں میں پھول تھے جنہیں وہ بادشاہ پر نچھاور کرنا چاہتے تھے۔ ان کے لبوں پر گیت تھے' نعرے تھے' بادشاہ کے لیے دعائیں تھیں۔

جدھر جدھر سے بادشاہ کی سواری گزرتی' لوگ اس پر پھولوں کی بارش کر دیتے' ہاتھ ہلا ہلا کر اسے اپنی محبت' اپنے احترام اور وفاداری کا یقین دلاتے۔ سارے شہر' سارے راستے' ساری سڑکیں بڑے ذوق سے سجائے گئے تھے۔ لوگوں کے بس میں ہوتا تو اپنے دل نکال کر بادشاہ کے سر سے وار دیتے۔ اپنی آنکھیں نکال کر اس کے راستوں پر بچھا دیتے۔ خوشی کے نعروں سے سارا جہان گونج رہا تھا۔ لوگوں کے چہروں پر' ان کے لباسوں پر' ان کی آوازوں میں خوشی کے سارے شوخ رنگ اتر آئے تھے۔

نئے بادشاہ کی آمد پر لوگوں نے سکھ کا سانس لیا تھا اور انہیں لگا تھا جیسے ان کے نصیبوں کی سیاہ رات کی سحر آپہنچی ہو اور اب ان کے ملک میں سکون کا' ترقی کا' انصاف کا اور خوشحالی کا نیا سورج طلوع ہو گا اور ان کے دکھ دور ہو جائیں گے۔ بڑی منتوں سے انہیں یہ دن دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ تمام شہروں میں کئی روز تک جشن کا سماں رہا تھا۔

اور آج جب بادشاہ باہر نکلا تو اس نے دیکھا شہر کی فضا بوجھل تھی۔ سڑکیں' گلیاں بازار بے رونق لگ رہے تھے۔ لوگوں کے چہرے بے رنگ' آنکھیں بے نور اور لب ایک دوسرے سے یوں بھینچے ہوئے تھے' جیسے انہیں ڈر ہو کہ اگر کھلے تو ان کے اندر دبی ہوئی چیخیں قابو میں نہیں رہیں گی۔ بادشاہ کی سواری دیکھ کر ان کی نفرت ان کی آنکھوں میں بھر آئی اور وہاں جہاں کبھی بادشاہ کے لیے احترام تھا' وہاں غصہ' غضب'

اور نفرت کی چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ لوگوں کے سر عقیدت اور احترام سے جھکنے کی بجائے نفرت کے اظہار کے لیے بلند ہو رہے تھے۔ پھر ان کے ہاتھ اٹھنے لگے اور جو پتھر، روڑا، کوڑا کرکٹ ان کے ہاتھوں میں آیا، وہ اٹھا کر بادشاہ کی سواری کی طرف پھینکنے لگے۔ بادشاہ کے محافظوں نے تلواریں سونت لیں، مگر بادشاہ نے انہیں آنکھ کے اشارے سے کوئی بھی اقدام کرنے سے منع کر دیا۔ پھر لوگوں کے لب کھلنے لگے اور لوگ بادشاہ کو اپنی زبان سے بھی پتھر مارنے لگے۔ چاروں طرف سے لوگ نفرت کی آوازیں بلند کر رہے تھے۔

یہ کیا ہوا؟ مجھ سے کیا بھول ہوگئی جو میرے شہروں سے رونق اڑ گئی۔ برکت ختم ہوگئی۔ یہ ---- یہ ---- سوچ سوچ کر بادشاہ کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ وہ محل واپس آیا تو کتنی دیر اپنے کمرے سے نہیں نکلا۔ یہ ---- مجھ سے اتنی محبت کرنے والے، اتنا احترام کرنے والے لوگ اتنی جلدی کیسے بدل گئے؟ یہ سوال صلیب بن کر اس کی نظروں کے سامنے گڑ گیا تھا۔ اس کا سارا وجود شرمندگی، ندامت، اور پشیمانی سے بھیگ رہا تھا۔

شام کو بادشاہ کے حکم پر سب مصاحب، سب عہدہ دار، سب منصب دار بڑے اونچی محرابوں والے کمرے میں جمع تھے اور اندر سے لٹا پٹا، کٹا پھٹا بادشاہ تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ ایک ہی دن کے صدمے سے پھیکا پڑ چکا تھا۔

بادشاہ نے اس دن کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مصاحبوں سے پوچھا۔ "تم کو میں نے اپنی رعایا کے معاملات سونپے تھے، اور ان کے لیے اختیارات کی امانت بھی تمہیں، مجھے جواب دو، یہ میری رعایا کی امیدیں، مایوسیوں میں کیسے بدلیں، ان کے ہاتھوں میں پھولوں کی جگہ پتھر کیسے آئے؟"

سب مصاحب کن اکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی بھی پہل کرنے کو تیار نہ تھا۔ ان کے سر اور نظریں بار بار جھک جاتی تھیں جنہیں اوپر اٹھانے کے لیے انہیں زور لگانا پڑتا تھا۔ بالآخر ایک مصاحب کھڑا ہوا اور اس نے محنت سے جمع کئے ہوئے خیالات اور الفاظ کو ترتیب دیتے ہوئے کہا۔ "جناب والا! یہ جو کچھ آج ہوا انتہائی قابل افسوس اور قابل مذمت ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس کے پیچھے چند سماج دشمن عناصر کے مذموم عزائم ہیں اور یہ ان لوگوں کی سازش ہے جو حضور والا کے برسراقتدار آنے سے زیر زمین چلے گئے تھے۔ میری یہ تجویز ہے کہ ہمیں ان لوگوں کو ڈھونڈھ نکالنا چاہیے اور ان کو بے نقاب کر کے انہیں اور ان کے منصوبوں کو ناکام بنا دینا چاہیے۔"

بادشاہ نے اس مصاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں دیکھا جیسے وہ اس کے اندر جھانک رہے ہوں۔ وہ مصاحب زیادہ دیر بادشاہ کی نگاہوں کی عکس ریزی کی تاب نہ لاسکا اور نظریں جھکا کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز ظاہر کرتا تھا کہ وہ آرام دہ حالت میں نہیں ہے اور اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے جو کچھ اس نے کہا تھا اس پر اس کا یقین پختہ نہیں تھا۔

اب جو مصاحب بات کرنے کے لیے کھڑا ہوا وہ اپنے علم و دانش اور تجربے کی وجہ سے بادشاہ کا

مصاحب خاص سمجھا جاتا تھا۔ ریاستی امور پر اسکی گہری نظر تھی اور تاریخ کا وسیع مطالعہ اسے دوسر مصاحبوں سے ہمیشہ ممتاز رکھتا تھا۔ اسی تجربے اور علم و فہم کی بنا پر وہ مسلسل کئی حکمرانوں کا مصاحب چلا آ تھا۔ بات کرنے کے لیے جب وہ لب کھول رہا تھا تو تقریباً سب مصاحب اسکی طرف پرامید نگاہوں سے د رہے تھے یوں جیسے وہی انہیں اس مشکل وقت سے نکال سکتا ہے۔

"حضور والا!" اس نے اپنے لہجے میں سنجیدگی گھولتے ہوئے کہنا شروع کیا! "ہماری قوم نے کئی سال غلامی کی زندگی گزاری ہے۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ جب جب ظالم اور جابر حکمران ہمارے ملک حکومت کرتے رہے، ہمارے لوگ پرامن رہے، حکمرانوں کی تابعداری کرتے رہے۔ ان کی خو میں غلامی کا اتنا گہرا ہے کہ ابھی انہیں آزادی راس نہیں آتی۔ نفسیاتی طور پر یہ قوم ایسے بادشاہ کو پسند کرتی ہے جو لے کر ان کو دوڑاتا رہے۔"

"جناب والا! اگر ناگوار خاطر نہ گزرے تو میں عرض کروں۔" مصاحب یہ کہہ کر چند ثانیوں کے رک گیا، اس نے ایک نظر بادشاہ کے چہرے پر ڈالی جہاں سنجیدگی کی گہری تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ بادشاہ خاموشی، کو رضامندی سمجھ کر، مصاحب نے اپنی رکی ہوئی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جناب نے اس قوم کے ساتھ نرمی کا، محبت کا سلوک روا رکھا۔ ان کی کوتاہیوں، ان کی خامیوں نظرانداز کرتے رہے، انہیں اپنے جیسا انسان سمجھتے رہے۔ اسی محبت، اسی نرمی کو انہوں نے حکومت کمزوری بنا لیا اور قانون کا خوف ان کے دل سے جاتا رہا۔ نتیجہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ انہوں نے بادشاہ پتھر پھینکنے شروع کر دیئے۔"

مصاحب سانس لینے کو ٹھہر گیا اور جب اس نے دوبارہ بات شروع کرنا چاہی تو یکدم اسے احساس کہ اس کے پاس کہنے کو اب کچھ اور نہیں رہا اور اسکی بات پہلے ہی مکمل ہو چکی ہے۔ وہ بادل نخواستہ ا نشست پر بیٹھ گیا۔

اگلے مصاحب نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ "بادشاہ سلامت سلطنت کے معاملات میں چند اف کا عمل کوئی وزن نہیں رکھتا اور نہ ہی حکمران کو ایسے انفرادی واقعات پر رنجیدہ ہونا چاہیے۔ ہمیں مجموعی ط پر قوم کے مفاد کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ پھر ہم جس دنیا میں رہتے ہیں اس میں بہت سے ملک ایسے جن کے حکمران عرصہ دراز سے حکمرانی کر رہے ہیں اور ان قوموں نے بادشاہت کے خلاف کبھی احتجاج نہ کیا۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں آج کے واقعہ کو بنیاد بنا کر اپنے ملک میں کوئی سوگ منانے کی ضرور ہے۔" اپنی بات مکمل کر کے یہ مصاحب بھی بیٹھ گیا۔

بادشاہ خاموش تھا۔ اسکی آنکھیں کھلی تھیں۔ بظاہر وہ اپنے مصاحبوں کی طرف دیکھ رہا تھا، ان باتیں سن رہا تھا مگر حقیقتاً اور تصور میں ان وقتوں کو یاد کر رہا تھا جب وہ لوگوں کے بڑے بڑے اجتماعات شریک ہوتا تھا۔ لوگوں کا ایک جم غفیر اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتا تھا تو اسے لگتا تھا جیسے وہ بہت ہی بڑا ہو

ہو۔ پبلک کا یہ شوق دیکھ کر اسے نشہ ہو جاتا تھا۔ وہ جھوم جاتا تھا اور اسکا جی چاہتا تھا کہ ان لوگوں کی خوشحالی، ان لوگوں کی ترقی کے لیے اپنی ساری بہترین کوششیں، اپنے سارے وسائل، اپنی ساری قوتیں صرف کر دے۔ اس نے بہت سے ایسے اقدامات کا حکم دیا بھی تھا، بہت سی سکیمیں بنائی بھی تھیں اور پھر اس کے دل میں اپنے عوام کی بہتری کے لیے ہمدردی تھی، درد تھا۔ آج وہی عوام تھے جن کی نظروں میں بادشاہ نے نفرت کی چنگاریاں اڑتی دیکھی تھیں۔ بادشاہ کے لیے اپنے عوام کی نظروں سے گر جانے کا تصور سوہان روح بنا ہوا تھا اور بڑی کربناک کیفیت میں سوچ رہا تھا---- یہ سب کیسے ہوا؟ میرے اور میرے عوام کے درمیان یہ نفرت کی دیواریں کس نے تعمیر کر دیں؟"

اس کا جواب اسے کسی بھی مصاحب سے نہیں مل رہا تھا بلکہ ایک اور مصاحب اسی دوران کھڑا ہو کر اپنی بات شروع کر چکا تھا جسکی آواز بادشاہ کو بہت دور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "ہم اداس نسلوں کے لوگ ہیں جن کا ماضی بعید کی شاندار روایات ہمارے شعور اور تحت الشعور کا حصہ نہیں جب کہ ہمارا ماضی قریب ہماری غلامی کی ایک دردناک داستان ہے۔ ہم کسی حال میں بھی خوش نہیں رہ سکتے۔ ہماری قوم اپنے حکمرانوں سے موجودہ دور میں فرشتوں کے سے کردار کی توقع کرتی ہے۔ اور اسی امید میں بہت جلد ہر حکومت، ہر بادشاہ ہر حکمران سے مایوس ہو کر اسکی تبدیلی کی شدید خواہش پال لیتی ہے۔ جناب والا سے بہتر حکمران انہیں آج تک نصیب نہیں ہوا ہوگا، پھر بھی---- پھر بھی انہیں حضور کے وجود مبارک کی قدر کرنا نہیں آئی۔ یہ ہماری قوم کی بدقسمتی ہے۔ شاید ہماری تقدیر میں تاریخ کے دشوار گزار راستوں پر بھٹکنا ہی لکھ دیا گیا ہے۔" مصاحب نے اپنی رائے کا اظہار کر کے، ٹھنڈی سانس بھری اور یوں نشست پر بیٹھ گیا جیسے بہت لمبا سفر طے کر کے آیا ہو۔

باقی مصاحبوں نے بھی ایک ایک کر کے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس طرح سب کا متفقہ فیصلہ یہی قرار پایا کہ بادشاہ اور اس کے مصاحبوں کا کوئی قصور نہیں لوگ ہی ناسمجھ، ناشکرے، بے صبرے اور قدر ناشناس ہیں۔ ان کی نفسیات اور تاریخ ہی ان کی بدقسمتی کی ذمہ دار ہے۔

جب سب مصاحبین اپنی اپنی رائے دے چکے تو بادشاہ نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی تک یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جب میں، جب آپ سب اس قوم کی بڑے خلوص سے خدمت کر رہے ہیں، تو پھر یہ کیسے ہوا کہ ایک دم عوام نے بادشاہ کو عزت کے بلند مقام سے نیچے پھینک دیا؟ اگر آپ کی نیت، آپ کے قوم، آپ کا سلوک رعایا سے، محکوموں سے اچھا تھا، اگر آپ نے ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھا اور اس کے درماں کے لیے وہ ساری کوششیں کیں جن کا آپ وقتاً" فوقتاً" سے تذکرہ کرتے رہے تھے، تو پھر---- پھر بھی انہوں نے آج مجھے پتھر کیوں مارے؟"

بادشاہ کی آواز سوگوار ہو گئی، اسکی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بادشاہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔ مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں۔ یہ لوگ برے نہیں۔ مجھ

سے ہی کہیں کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ میں ہی اپنی ذمہ داریاں کماحقہ پوری نہیں کرسکا۔ اس صورت حال کی بہتر کا حل مجھے ہی کرنا پڑے گا۔ میں اپنے سارے اختیارات لے کر ایک ایک فرد کے پاس جاؤں گا اور اس ک نفرت کو محبت میں بدل کر رکھ دوں گا۔ مجھے سمجھ آ رہی ہے۔ میں ہی بے خبر رہا' میں اپنی رعایا سے' اپ لوگوں سے کٹ گیا تھا' میں پھر ان کے قریب ہو جاؤں گا۔ مجھے لوگوں کی نگاہوں میں اپنی عزت' اپنا وقار کا سے حاصل کرنا ہو گا' اس کے بغیر اب میرا جینا بیکار ہے۔" بادشاہ کی آواز میں آہنی عزم کی گونج تھی' اراد کی پختگی کا لہجہ تھا۔

سب مصاحب اس سوچ میں پڑ گئے کہ نہ جانے اب بادشاہ اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے ک اقدامات کا حکم دے۔ بادشاہ کا چہرہ اس کے اندرونی عزم کا اظہار کر رہا تھا۔ اتنے میں وہی مصاحب ہاتھ باند کر کھڑا ہو گیا' جس کو سلطنت کے امور میں بہت تجربہ تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ بادشاہ کی نظر کی اجازت پا وہ بڑے ادب سے بولا۔ "بادشاہ کی عزت' اس کا وقار اس قوم کی نظر میں بحال ہو سکتا ہے' ایسا ممکن حضور والا۔"

بادشاہ خاموش رہا اور اسکی خاموشی کو اجازت سمجھتے ہوئے' اس مصاحب خاص نے کہا' "حض بنیادی طور پر ہماری قوم ہیروز کی پجاری رہی ہے۔ شہیدوں' مظلوموں کو بھی یہ قوم ہیرو ہی سمجھتی آئی۔ اس مرحلے پر اگر ہم کسی بہادری کے نادر کارنامے کا بندوبست کر سکیں' کوئی ایسا واقعہ' ایسی قربانی کا انتظا جائے کہ جس سے ظالم کو مظلوم ثابت کیا جا سکے تو یہ قوم راتوں رات بدل سکتی ہے اور وہی بادشاہ جسے ظالم' بے قدرا سمجھ کر پتھر مارے گئے ہیں' کل کو اس قوم کا ہیرو بن سکتا ہے۔ ہم لوگوں کو تو نہیں مگر ا ذہنی حالت کو بدل سکتے ہیں۔" دوسرے مصاحبوں کے ساتھ ساتھ بادشاہ نے بھی یہ تجویز حیرت سے سنی۔

مصاحب خاص ابھی تک کھڑا تھا جیسے اس کی بات مکمل نہ ہوئی ہو۔ وہ شاید بیٹھنا بھول گیا تھا کیو وہ اپنی اس بات کے متعلق ابھی تک سوچ رہا تھا جو وہ کہہ چکا تھا۔ جب بادشاہ نے دربار برخاست کیا تو چہرے پر' اس امر کے واضح اثرات تھے کہ وہ مطمئن نہیں تھا۔ بادشاہ کا غیر تسلی بخش انداز سب مصاح لیے لمحہ فکریہ بن گیا اور بادشاہ کے دربار سے چلے جانے کے باوجود سب مصاحبین وہاں بیٹھے رہے اور کے ممکنہ رویے کے متعلق اندازے لگاتے رہے' یہاں تک کہ محل کی راہداریوں اور غلام گردشو خاموشی اور اندھیرے نے گھل مل کر پراسرار سی فضا کی کیفیت پیدا کر دی۔ جب رات گہری ہوئی تو در ایک نیم روشن کونے میں مصاحب خاص اور اس کے ساتھ چند اس کے قریبی اور رازدار مصاحب انسا بجائے سایوں میں ڈھل گئے جن کی آواز نہیں تھی مگر وہ صلاح مشورے کر رہے تھے۔

جب اندر باہر اندھیرا ایک جیسا ہو گیا تو یہ سائے کسی نتیجے پر پہنچ کر محل کے اندر ہی بکھر گئے او صبح نے آنکھ کھولی تو محل میں ہر طرف بادشاہ کا خون بکھرا ہوا تھا۔ یہ خبر "آناً فاناً" سارے ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ بادشاہ کی ساری رعایا' سارے عوام اپنے سارے کام' اپنی ساری مصروفیتیں

روتے، چیختے، سر پیٹتے محل کی طرف دوڑ پڑے۔ اپنے مرحوم بادشاہ کے آخری دیدار کے لیے، سارا ملک، سارے شہر اُمڈ آئے۔ جب بادشاہ کا جنازہ اٹھا تو ہر آنکھ اشکبار تھی اور جس جس راستے، جس جس سڑک سے بادشاہ کی میت کی سواری گزرتی تھی، لوگ اس پر پھولوں کی بارش کر رہے تھے۔ آسمان پر بادل چھا گئے، ماحول کی سوگواری میں اضافہ ہو گیا۔ لوگوں کے سارے گلے، ہمدردیوں میں بدل گئے۔ اگلے دن تمام قوم نے مشترکہ طور پر مرحوم بادشاہ کے خون ناحق کو خراج تحسین پیش کرنے کے جذبے سے مغلوب ہو کر اس کے بیٹے کو، جو بادشاہ مرحوم کا مصاحب بھی تھا، اپنا نیا فرماں روا چن لیا اور وہ بہتر مستقبل کی امید میں اپنے ٹوٹے، بکھرے خوابوں کو پھر سے جوڑنے میں لگ گئے۔

"ارتکاز" کا غزل نمبر

اگست ۱۹۹۷ء میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے قیام کو پچاس سال پورے ہو جائیں گے۔ اس خوشی کے موقع پر سہ ماہی "ارتکاز" اگست ۱۹۹۷ء میں پچاس سالہ غزل کا جامع تر انتخاب "غزل نمبر" کے نام سے شائع کر رہا ہے۔ اس "غزل نمبر" میں پاک و ہند کے علاوہ دنیا بھر کے ان ممالک کے ممتاز اور نمائندہ شعرا کرام کی غزلیں شائع ہوں گی جہاں جہاں اردو بولی، پڑھی، لکھی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ نمبر نہ صرف آئندہ غزل کے مطالعہ میں ایک حوالہ جاتی کتاب قرار پائے گا بلکہ اس کا تنقیدی حصہ غزل کی تفہیمات میں نقد ادب کا بیش قیمت سرمایہ ثابت ہو گا۔

سہ ماہی ارتکاز۔ ایف ۲/ ۸۳ مارٹن کوارٹرز
جہانگیر روڈ۔ کراچی۔ ۷۴۸۰۰

فصل

گلز

کئی گھنٹے اندھیرے کی لوئی اوڑھے وہ چھپا رہا پلیا کے ناچے۔ پلیا کے نیچے بہتے پانی او رکیچڑ سے اس دھوتی بھیگ گئی تھی۔ پاؤں سن گئے تھے۔ جوتیاں اتار کر اس نے کمر سے باندھ لی تھیں۔ دور سے آتی فصل کی خوشبو اس کے نتھنوں کو چھوتی' تو اس کے سینے میں طاقت بھر جاتی۔ وہ انہی فصلوں کا جایا تھا۔ اس نے نہیں کیا تھا ان فصلوں کو۔ ان فصلوں نے اسے پیدا کیا تھا اور اس کے سارے ساتھی کسانوں کو بھی۔

"ہم سب ان فصلوں کے بٹے ہیں۔ اور ان سٹوں میں بھرے دانے ہیں۔ لیکن ٹھاکر جب ؟ بھون کے اپنا پیٹ بھرتا ہے تو ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔" اس کی اس بات پر کیسے گردن اونچی ہو گئی کسانوں کی۔ اسے خود بھی لگا تھا' اس نے مزدوروں کے اس نیتا جیسی بات کر دی تھی' جس کی تقریر وہ شہر سن کر آیا تھا۔ شہر میں اس کے بھائی نے بلوایا تھا اور اس سے کہا تھا:

"اکیلے تو کچھ نہیں کر سکو گے۔ اکیلے اکیلے تو زمیندار تمہیں بھنے دانوں کی طرح چبا جائے گا۔ تمام کسانوں کو بھی ساتھ لو۔ انہیں اپنے ساتھ ملاؤ اور اپنی زمین آزاد کراؤ۔ اس ملک میں زمینداری ہو چکی ہے۔"

"لیکن میں کیسے سمجھاؤں گا انہیں؟ قانون کی بات تو آپ ہی سمجھا سکتے ہیں۔"

"ضرورت پڑے گی تو لکھنا مجھے۔ میں آجاؤں گا۔ میں دورے پر نکلا تو تمہارے گاؤں سے گزروں گا۔"

اس کے بھائی نے بھی یقین دلایا تھا۔ اگر باپ نے زمین رہن نہ رکھی ہوتی' تو اسے بھی کیا ضر تھی شہر میں جا کر مل مزدوری کرنے کی۔ "ہماری زمین پھر سے ہماری ہو جائے تو میں گاؤں واپس آجاؤں

وہ بڑا حوصلہ لیکر آیا تھا شہر سے۔ بڑی بڑی باتیں کرنے لگا تھا۔ پارٹی کی۔ یونین کی۔ دو تین با کسانوں کے سامنے اس کی پٹائی ہوئی تھی۔ اس کو الٹا لٹکا کر املی کی چھڑی سے پیٹا بھی گیا تھا۔ اس کے بچوں نے بھی سمجھایا تھا اسے' لیکن پتہ نہیں کیوں فتور چڑھ گیا تھا اس کے دماغ میں۔

وہ اپنے گاؤں میں ہی نہیں' چپ چاپ پاس کے گاؤں میں جا کر بھی' بھڑکانے لگا کسانوں کو۔ اس کی باتیں سنتے تو خوب مزے لیتے تھے۔ اس کے سامنے بڑا جوش بھر جاتا ان میں۔ لیکن اس کے جا پھر بھیگی بلی بن جاتے۔ ہندی کا اخبار اوپر کی جیب میں رکھنا' اس کا سٹائل ہو گیا' اس نے بتایا کسانوں کو

اکیلے نہیں ہیں۔ "دیش میں ایک پارٹی بھی ہے جو ہمارے حقوق کے لیے لڑ رہی ہے۔"

پلیا کے نیچے بیٹھے بیٹھے جب اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر آ جاتا۔ کھیتوں سے آتی ہوئی ہوا کو پھیپھڑوں میں بھر لیتا۔ بس ایک بار شہر پہنچ جائے۔ جاتے ہی پانڈے جی سے ملے گا۔

جس روز ساتھ کے گاؤں سے پٹ کر آیا تھا، اس روز اس نے اپنے بھائی کی معرفت چٹھی بھی لکھی تھی پانڈے جی کو۔ لیکن کئی مہینے تک کوئی جواب نہ آیا۔ اور جب بھائی کا جواب آیا، تو بس اتنا ہی کہ پانڈے جی آجکل دورے پر گئے ہوئے ہیں، واپس آتے ہی چٹھی ان تک پہنچا دوں گا۔ اسے امید ہو گئی تھی اس دورے میں پانڈے جی ضرور اس گاؤں سے گزریں گے---- اس کی ہمت بڑھ گئی تھی۔ اس نے سب مزدوروں کے کانوں میں پھونک دیا۔ "تیار رہنا، جس دن پانڈے جی آئیں گے، اس دن چوپال پر ایک میٹنگ بلائیں گے۔ پھر دیکھنا اس ٹھاکر ہرنام سنگھ کی کیا گت ہوتی ہے۔ پانڈے جی لاٹھی لٹھیت کی بات نہیں کرتے، قانون کی بات کرتے ہیں۔"

آپس میں سب مزدوروں کو معلوم تھا کہ کھلم کھلا کوئی اس میٹنگ میں نہیں جانے والا ہے، لیکن بات کرنے میں کیا ہے؟ پھس پھسا کر بات کرنے میں بھی تو ایک بجلی کی لہر سی دوڑ جاتی تھی ان خون سے خالی جسموں میں۔

پانڈے جی نے بہت دیر کر دی، اور پتہ نہیں کس سالے نے چغلی کر دی ٹھاکر سے۔ اسے کھیتوں سے پکڑ کے، اٹھا کے سامنے لایا گیا۔ اور جب ٹھاکر کے سامنے اس نے اپنے پتا کا نام لیا تو ٹھاکر نے اپنا تلے والا جوتا اتار کر اس کے منہ پر مارا---- "سالا کمیونسٹ! ____ سیدھی طرح کام کر کھیتوں میں، نہیں تو جھونپڑی بچھا کے ہل چلوا دوں گا۔ تیری میں......"

اس کے باوجود اس کے دماغ سے فتور نہیں گیا۔ کمیونسٹ تو کمیونسٹ ہی سہی!!

جس دن لوکو کی بیٹی اٹھا کر لے گئے تھے ٹھاکر کے بیٹے، اس دن لوکو نے آ کر سب کو دہائی دی تھی، لیکن اس کے ساتھ حویلی تک چلنے کے لیے کوئی بھی تیار نہ ہوا۔ لوکو نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ساتھ چل پڑا۔ ٹھاکر نے لوکو کو صرف اتنا ہی کہا۔ "آنے دو لونڈوں کو۔ میں ان کی خبر لیتا ہوں۔" لیکن اس کو پھر دھر لیا ٹھاکر نے---- "کیوں بے؟ تو کیا باپ لگتا ہے سب کا؟---- سالے، ٹانگیں ادھیڑ کے دو کر دوں گا، پھر کبھی تیری شکل دکھائی دی تو!" ____ اور ایسی لات ماری تھی کہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے جا پڑا تھا۔ لوکو، کندھے پر اٹھا کر لایا تھا اسے----

پر اتنا ہوا، اس کے بعد لوکو اور اس کے دو جوان بیٹوں نے کھیتوں پر کام کرنے سے انکار کر دیا اور بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ اب وہ اکیلا نہیں تھا۔ تین آدمیوں کی ایک پارٹی بن چکی تھی----

تیسرے دن لوکو کی بیٹی نے کنوئیں میں کود کر خودکشی کر لی۔ سارے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ ایسا کہرام پہلے بھی کئی بار مچا تھا، لیکن چوپال کے الاؤ کی طرح اپنے آپ ہی جل جل کے راکھ ہو جاتا تھا۔ اس بار الاؤ کے پاؤں لگ گئے۔ جلتی مشعلیں لئے، پندرہ بیس آدمیوں کا ہجوم حویلی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ سب نے "ٹھاکر ہرنام سنگھ مردہ باد" اور ہائے ہائے کے نعرے لگائے۔ لیکن حویلی سے کسی نے جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔

سب کو ڈر تھا کہ ٹھاکر بندوقیں لیکر برآمدے میں یا چھتوں پر آکر کھڑے ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا کچھ ہوا----

صبح تک سب کے حوصلے بلند تھے۔ لیکن جب پولیس چھان بین کو آئی تو صرف اسی کو پکڑ لے بہت پیٹا گیا اسے، لیکن اس نے کسی اور کا نام نہیں لیا--- یہی کہتا رہا--- ”سارا گاؤں تھا--- سب کو!“

دس دن اسے اندر رکھا۔ دس دن میں آس پاس کے گاؤں میں بھی اس کی مشہوری ہو گئی۔ دن بعد گھر لوٹا تو پتہ چلا تھا ٹھاکر کے لوگ آکر، اس کا گھر بار، لوٹ لاٹ کر تباہ کر گئے، اور رپٹ لکھوا د ڈاکو دان سنگھ کے آدمی آئے تھے۔ اس کے بیوی بچے تین دن تک ہری داس کے یہاں چھپے رہے اور سے نکل کر سیدھے شہر چلے گئے، اس کے بھائی کے پاس!

جس دن وہ چھوٹ کر آیا تھا، اسی رات اس کے گھر کو آگ لگا دی گئی۔ چھپتا چھپاتا، تین کوس چل کر وہ ریلوے سٹیشن پر پہنچا تو ٹھاکر کے لٹھیت وہاں گھوم رہے تھے۔ ریل کی پٹڑی سے لگے نا۔ ساتھ ساتھ دوڑتا ہوا وہ اس پلیا کے نیچے آکر چھپ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آدھی رات کے بعد یہاں سے مال گاڑی گزرتی ہے، جو اس پلیا کے پاس آکر آہستہ ہو جاتی ہے۔

گاڑی کی آواز سنتے ہی وہ پلیا سے باہر نکل آیا۔ دور ہی سے ایک ڈبے کا کھلا دروازہ دیکھ ا نے، اور پاس آتے ہی لٹک کے اوپر چڑھ گیا---

مال گاڑی کے ڈبے میں گھستے ہی، ایک بندوق کی نالی اس کے سینے پر آکر گڑ گئی۔ ”کون ہے اس ڈبے میں کیوں چڑھا تو؟ ہیں؟ جاسوس ہے کوئی؟“

”کیا کوئی پولیس کا کتا ہے؟“ --- ایک اور آواز آئی۔

پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کون تھے۔ یہ علاقہ ڈاکوؤں کی رہگزر تھا۔ سب جانتے تھے کبھی سامنا نہیں ہوا تھا----

”غریب مسافر ہوں۔ بنا ٹکٹ سفر کر رہا ہوں۔ شہر جانا چاہتا ہوں۔“

ڈاکو نے بندوق ہٹا لی۔ اور ایک کونے میں بیٹھنے کا حکم دیا----

وہ اس ڈبے کا حکمران تھا۔ دوسرے کونے میں بیٹھا اس کا ساتھی شراب پی رہا تھا، پیتل کے میں!

پہلا ڈاکو پھر دروازے کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے سناٹے کے بعد اس نے پھر پوچھا۔ کھائے گا؟ شکل سے لگتا ہے، کسی نے نچوڑ کے پھینک دیا ہے۔“ چپ سن کر اس نے پھر حکم دیا--- آجا۔ بیٹھ جا سردار کے پاس!“

کچھ ڈرتا گھبراتا وہ گھسٹ کے دوسرے کونے تک آگیا۔ سیدھا کھڑا ہونے کی ہمت نہیں ہوئی سردار نے ایک کپڑے کی پوٹلی آگے کر دی۔ روٹی کی مہک اپنے آپ ناک تک آگئی۔ ”کھول لے۔ پراٹھے ہیں۔ اچار بھی ہے۔“

سردار کی آواز بڑی نرم تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے پوٹلی کی گرہ کھولی۔ پراٹھے ٹھنڈے تھے۔ پر تھے تازہ۔ اس نے ایک پراٹھا ہاتھ میں لے کر بند کرنا چاہا تو سردار پھر بولا۔ "کھالے۔ کھالے۔ بہت ہیں۔ اچار بھی لے لے۔"

بندوق والے ڈاکو نے آواز دی۔ "نیچے پیاز رکھے ہیں۔ چاہے تو لے لے۔"

جب کھانا شروع کر دیا اس نے تو ماحول کچھ نرم ہو گیا۔ سردار نے پوچھا: "کہاں جا رہا ہے؟"

"چندوڑہ۔ وہاں سے لاری لے لوں گا۔"

"ہوں----! وہ تو دن چڑھے آئے گا۔" ایک چپ کے بعد پھر پوچھا---- "کہاں کا ہے؟ اس گاؤں کا؟ جھرکہ؟"

کھاتے کھاتے ہی اس نے "ہاں" میں گردن ہلا دی۔ بندوق والے نے پوچھا۔ "دان سنگھ کا نام سنا ہے کبھی؟"

ایک اچھو آگیا اسے! "کون دان سنگھ؟ ڈاکو؟"

سردار نے پانی کی بوتل بڑھائی اور کہا۔ "ڈاکو نہیں، باغی دان سنگھ بول!"

"ہاں۔ وہی-----" کہتے کہتے ہی وہ سمجھ گیا، کس کے سامنے بیٹھا ہے----

"پچاس ہزار کا انعام ہے اس کے سر پر!" سردار کہہ رہا تھا---- "ہم بھی اسی گاؤں کے ہاں۔ اسی ٹھاکر کے باپ نے ہماری بیٹی کو اٹھوایا تھا----

ایک لمبی چپ سی رہی----

"ہم نے بھی گھر میں گھس کے سالے کی کھوپڑی، کلہاڑی سے کھول دی تھی---- اپنی بیٹی کا بدلہ لے لیا تھا۔" اس نے زور سے تھوکا ایک طرف---- "اب اس کے بیٹے بھی وہی کر رہے ہیں۔ اور کوئی دانی رام سنا ہے بدلہ لے گا اس سے۔ پارٹی بنا رہا ہے!" پھر زور سے تھوکا اس نے!

"حرامزادہ۔ سمجھتا ہے، نعرے لگا کر مارے گا اسے!---- بزدل سالا، ماں کا تخم۔ ہاتھ اٹھانے کا دم نہیں۔ قانون بدلے گا۔"

گاڑی آہستہ ہو رہی تھی۔ سردار کھڑا ہو گیا۔ کمر پر کارتوسوں کی پٹی سیدھی کی اور بندوق والے سے بولا: "بڑا نالا آرہا ہے۔ تیار ہو جا----"

دونوں کود جانے کو تیار ہو گئے---- جاتے جاتے سردار نے کہا: "جو کھا کے بچے پوٹلی میں، پھینک دینا۔ اور خبردار کسی پولیس والے کو خبر کی تو----"

دانی رام پہلی بار کھڑا ہوا---- "فکر نہیں کرو سردار---- تم بھی میرے گاؤں کے ہو---- میں بھی اسی فصل کی پیداوار ہوں جس فصل سے تم پیدا ہوئے ہو----"

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں اندھیرے میں کود گئے، اور دانی رام کھڑا دیکھتا رہا، اندھیرے کی طرف!

حکیم جی

حمید قیصر

گلی میں ہارن کی آواز پر حکیم شجاع اللہ طلے کی کلاہ درست کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بیٹی ۔ دائیں ہاتھ میں منقش عصا تھمایا۔ دوسرا ہاتھ پکڑ کر گھر کی دہلیز تک چھوڑنے آئی۔ پھر چلمن کی اوٹ سے انہیں جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ ”بابا جان جلد لوٹ آئیے گا۔“

روزانہ جب حکیم جی رئیس خان زمان کے ڈرائیور کا ہاتھ تھام کر مرسڈیز کی طرف بڑھتے تو یہ فقر ان کی سماعت سے ٹکراتا۔ حکیم شجاع اللہ کی حکمت اور دانائی کا شہرہ اپنے شہر میں تھا ہی دور دراز کے قصبو اور دیہات سے بھی دن بھر لوگ ان کے پاس آتے رہتے تھے۔ بیٹی اور پھر بیٹے کی پیدائش کے بعد بیوی دا مفارقت دے گئی۔ بعد ازاں جوانی میں ہی ایک حادثے نے حکیم جی کی آنکھوں کی روشنی بھی چھین لی۔ ت سے انہوں نے اندر کی لو میں دیکھنا اور محسوس کرنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے محسوس کیا جیسے علم حکمت نے ان کے اندر چراغاں سا کر دیا ہے۔

رئیس خان زمان بھی پہلے پہل ان کی حکمت کا چرچا سن کر مریض کی حیثیت سے آئے۔ جب راہ رسم بڑھی تو باقاعدہ آنا جانا شروع کر دیا۔ یوں ہوتے ہوتے معمول کا آنا جانا دیرینہ رفاقت کا روپ دھار گیا پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد پرانے مگر شاہانہ طرز کی مرسڈیز کار رئیس خان زمان کی کوٹھی کے احاطے می داخل ہو کر رک گئی۔ ڈرائیور نے بائیں جانب کا پچھلا دروازہ کھولا اور حکیم جی کو سہارا دیتے ہوئے صد دروازے تک لے آیا۔ ہارن کی آواز پر خادمہ حکیم جی کو رئیس کے کمرے تک لے جانے کے لیے آچ تھی۔ حکیم جی خادمہ کا ہاتھ تھام کر طویل راہداری عبور کرتے ہوئے رئیس کے کمرے تک پہنچے تو سنگیں فر پر پیتل کے شام والے عصاء کی ٹھک ٹھک سن کر رئیس خان زمان حسب معمول خود ہی اٹھ کر باہر آگئے ”آیئے حکیم صاحب آیئے----“

”خان صاحب! اب صحت کیسی ہے؟“ حکیم جی نے حسب معمول دریافت کیا۔

”اللہ کا بڑا احسان ہے حکیم صاحب۔ بھئی خادمہ ہمیں جلدی سے ٹھنڈا پلاؤ‘ بہت پیاس لگی ہے۔ خان صاحب نے صوفے پر آلتی پالتی جماتے ہوئے حکم دیا۔

”خان صاحب! خیریت تو ہے آج حویلی کی راہداری کچھ خاموش خاموش سی ہے گھر میں چہل پہ

محسوس نہیں ہو رہی؟“ حکیم جی نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”اجی حکیم صاحب کیا بتائیں سبھی گھر والے صبح سے مربعوں کی سیر کو نکلے ہیں۔ اب شاید کل ہی لوٹیں گے اور صاحبزادے مقرب خان ہیں کہ کالج سے آکر گھر سے باہر ہی نہیں نکلتے۔“ خان صاحب نے تفیصل بیان کی۔

”اسی بہانے آپ بھی ہو آتے ذرا تفریح ہو جاتی۔“ حکیم صاحب نے مشورہ دیا۔

”اجی ہم کہاں! اب تو گھر کی چوکیداری ہی ہماری ذمہ داری ٹھہری۔ ایسے میں یہ خاندانی حقہ ہمارا ساتھی ہے یا پھر کتابیں ہمارا دل بہلاتی رہتی ہیں۔“ خان صاحب چندیا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ خادمہ شربت کی ٹرے تپائی پر رکھ کر چلی گئی۔

”حکیم صاحب کبھی ہماری سنبل بیٹی کو بھی ہمراہ لے آئیے ناں؟“ خان صاحب نے شربت کا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کیا بتاؤں خان صاحب کالج چھوڑنے کے بعد گھر سے ایسے جڑی ہے کہ کہیں آنے جانے کا نام ہی نہیں لیتی۔“

”حکیم جی! سنبل بیٹی اور مقرب خان کے رشتے کے بارے میں آپ نے سوچا ہے؟“ خان صاحب نے شربت کا ٹھنڈا میٹھا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے پوچھا۔

”خان صاحب! آپ تو جانتے ہیں ایک ہی تو بیٹی ہے۔ اگر وہ بھی اپنے گھر کی ہو گئی تو میرے پاس کیا رہ جائے گا؟“ حکیم جی نے تاسف سے جواب دیا۔

”اجی چھوڑیئے! بیٹیاں تو ہوتی ہی پرایا دھن ہیں، آج نہیں تو کل، سنبل بیٹی کو اپنا گھر تو بسانا ہی ہو گا ناں؟“ رئیس نے حقیقت پسندانہ انداز سے کہا۔

سنبل کے رشتے کا ذکر چھڑتے ہی حکیم صاحب فکر کی اتھاہ گہرائیوں میں جا بیٹھے۔ معمول کی اس محفل میں روزانہ گھنٹوں کشتہ جوہر عنبری سے لے کر دنیا جہاں کے موضوعات اور مسائل پر گفت و شنید ہوتی مگر تان سنبل اور مقرب خان کے رشتے پر ٹوٹتی۔ یہ ذکر گویا حکیم شجاع اللہ کی رخصتی کا اعلان ہوتا۔ وہ کافی دیر استغراق میں ہچکولے کھانے کے بعد سطح آب پر آجاتے۔ تب رئیس خان زمان کسی مردانہ تکلیف کا نسخہ دریافت کرکے حکیم صاحب کی کشتی منجدھار سے باہر نکال لیتے۔

”چلیں رئیس خان زمان! سنبل بیٹی انتظار کرتی ہوگی، پتہ نہیں ولید بازار سے لوٹا ہے کہ نہیں؟“ حکیم جی عصاء سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

خان صاحب ا حکیم جی کی سخت گیر طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے زور نہ دیتے اور انہیں رخصت کرنے کے لیے خادمہ کو بلایا جاتا۔ حکیم جی خادمہ کا ہاتھ تھام کر رئیس خان زمان سے رخصت ہوئے۔ طویل راہداری ویسے ہی خاموش پڑی تھی۔ راہداری کا پہلا ہی موڑ مڑے ہوں گے کہ اچانک حکیم صاحب رک گئے۔

"بیٹی تم وہی خادمہ ہو ناں جو چند گھنٹے پہلے مجھے گیٹ سے اندر لے کر آئی تھیں؟" حکیم جی اچانک سوال پر خادمہ ٹھٹکی۔

"جج..... جی ہاں..... حکیم صاحب" جواب سن کر لمحہ بھر کے لیے حکیم صاحب کی بے نور آنک خادمہ کے چہرے پر ٹکی پھڑپھڑاتی رہیں اور پھر بولے۔ "ذرا مجھے رئیس کے پاس واپس لے چلو....." صاحب جلالی لہجے میں بولے۔

خادمہ اس اچانک تبدیلی پر بہت سٹپٹائی۔ وہ حکیم صاحب کو واپس لے کر چل تو پڑی مگر سمجھ نہ معاملہ کیا ہے؟ رئیس خان زمان جو ابھی ابھی مسہری پر دراز ہوئے تھے حویلی کی گمبھیر خاموشی میں حکیم صا کے عصا کی لحہ بہ لحہ قریب آتی آواز پر چونکے اور اچھل کر کمرے سے باہر آرہے گویا کوئی انہونی ہوگئی

"کیا ہوا خادمہ؟" رئیس نے حکیم صاحب کی بجائے خادمہ سے یوں دریافت کیا جیسے وہ اس شکایت لے کر پلٹے ہوں، خادمہ سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی تھی۔

"خان صاحب! کیا یہ وہی خادمہ ہے جو مجھے گیٹ سے اندر لائی تھی؟" حکیم جی نے بغیر کسی تمہید دریافت کیا۔ رئیس جو حکیم صاحب کی یوں مراجعت پر پہلے ہی حیران تھے، ان کے سوال پر پریشان ہ گئے۔

"آ..... جی..... جی ہاں حکیم صاحب! ہفتہ بھر پہلے ملازم رکھا تھا اسے، کیا کوئی خطا ہوگئی ہے کمبخت سے؟" خان صاحب تذبذب کے عالم میں بولے۔

"یقین نہیں آتا رئیس، عجب قصہ ہے؟"

"کیا یقین نہیں آتا حکیم صاحب؟" رئیس کی پریشانی سوا ہوتی جا رہی تھی۔

"گھر میں اور کون کون ہے؟" حکیم صاحب نے تفتیشی افسر کے سے انداز میں پوچھا۔

"بتایا تو تھا کہ اہل خانہ زمینوں پر گئے ہیں۔ مقرب خان اپنے کمرے میں سو رہا ہوگا اور یہ آپ پہیلیاں کیوں بجھوانا شروع کر دی ہیں؟ آخر معاملہ کیا ہے؟" خان صاحب کے لہجے میں سٹپٹاہٹ نمایاں ہ گئی۔

"خان زمان! یہ جو تمہاری خادمہ ہے ناں! آتی دفعہ اس کی نبض کچھ اور تھی اور اب جاتی اور......"

بیچاری خادمہ تھی کہ شرم سے دوپٹہ اس کے سینے پر ٹھہرنا بھول گیا تھا۔

"کک..... کیا..... خادمہ کی نبض؟ بھئی حکیم صاحب..... میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا، آ کہہ رہے ہیں؟" خان صاحب زچ ہو کر بولے۔

"رئیس خان زمان! سب سمجھ میں آجائے گا۔ آپ ذرا مجھے چھوٹے رئیس کے کمرے تک تو چلئے....."

خان صاحب تذبذب کے عالم میں کبھی حکیم صاحب تو کبھی خادمہ کی طرف دیکھتے۔ خادمہ ب

ہرنی کی طرح کلیلیں بھرنے کو تیار پیر فرش پر نہ دھرتی تھی۔ خان صاحب اسی عالم میں حکیم صاحب کا ہاتھ تھامے مقرب خان کے کمرے کی جانب روانہ ہوئے۔ خادمہ اس ہرنی کی طرح پیچھے پیچھے چلنے لگی جیسے وہ اس کا بچہ اٹھا لے جا رہے ہوں۔ ایک آدھ موڑ مڑنے کے بعد بائیں جانب مقرب خان کے کمرے کا دروازہ کھٹاک سے کھل گیا۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ راہداری کی روشنی اور شور و غل سے مقرب خان کچی نیند سے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

"حکیم صاحب! یہ رہے چھوٹے رئیس مقرب خان! اب بتائیے یہ نبض کا کیا قصہ ہے؟"

"تحمل سے خان زمان' ذرا تحمل سے! تمہاری یہ خادمہ جب مجھے گیٹ سے لے کر آئی تھی تو اس کی نبض پر میرا ہاتھ تھا' جب یہ مجھے رخصت کرنے جا رہی تھی تب بھی اس کی نبض پر میرا ہاتھ تھا۔ دونوں اوقات کی کیفیت مختلف ہے۔"

"اوہو حکیم صاحب...... آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" خان صاحب چلا اٹھے۔

ان کے پیچھے کھڑی خادمہ دروازہ کی اوٹ میں پتھر ہو رہی تھی۔

"بھئی جب میں آیا تھا تو خادمہ کنواری تھی مگر اب نہیں رہی..... میری مانو تو جلد دونوں کی شادی کر ڈالو۔" حکیم جی نے مشورہ دیا۔

احمد ندیم قاسمی
کی نظموں اور غزلوں کی کلیات
ندیم کی نظمیں (دو حصّے)۔ (قیمت : ۸۰۰ روپے)
ندیم کی غزلیں (قیمت : ۴۵۰ روپے)
اور
ندیم کے خود منتخب کردہ چالیس افسانے
ندیم کے افسانے (قیمت : ۳۵۰ روپے)
انتہائی آب و تاب سے شائع ہوئے ہیں۔
سنگ میل پبلی کیشنز۔ لوئر مال لاہور

ایک تھی چڑیا

فرحت پروین (امر

بہت ڈسٹرب کرتی ہے مجھے یہ چڑیا۔ میں ان بیسیوں چڑیوں کا ہم آھنگ نغمہ سننا چاہتا ہوں جو بچپن ہی سے بہت عزیز ہیں۔ مگر یہ ایک اکیلی چڑیا جسکی آواز بہت سریلی اور بہت واضح ہے' اس ہم آ نغمے سے بالکل الگ ہے۔ جب وہ بولتی ہے تو صرف اسی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ باقی سب آوازیں پس میں چلی جاتی ہیں۔ میں اپنی توجہ ہم آہنگ نغمے پر مرتکز کرنا چاہتا ہوں مگر وہ ایک اکیلی سریلی آواز آوازوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ تب مجھے الجھن ہونے لگتی ہے۔ کتنا بولتی ہے یہ چڑیا۔ اور میں بری ڈسٹرب ہو جاتا ہوں۔ لیکن پھر ہار کر میں صرف اسی کا نغمہ سننے لگتا ہوں۔ سب سے الگ اور سب پر ہوا۔

ہمارے گھر کے آنگن میں بیری کا پیڑ تھا۔ صبح صبح میری آنکھ چڑیوں کی چہکار سے کھلتی جو بیری پ تحاشہ شور مچا رہی ہوتیں۔ مگر انکا شور ہم آہنگ ہو کر صرف ایک آواز' ایک نغمہ لگتا جو کانوں کو بہت معلوم ہوتا۔ میں آنکھیں موندے اس نغمے کو سنتا رہتا۔ اور جب مجھے اپنے محسوسات کو الفاظ میں ڈھا سلیقہ آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ آواز تو پازیب کی جھنکار سے مشابہ ہے جس میں چاندی کے ننھے منے گھ الگ الگ بج کر ایک مجموعی نغمہ تخلیق کرتے ہیں۔ میں آنکھیں موندے اس کی موسیقیت میں ڈوبا رہتا کوئی دوشیزہ' چاندی کی پازیب پہنے' بڑھتی چلی آتی۔ سج سج قدم دھرتی۔ جب کبھی میں کسی کام سے شہ باہر جاتا تو اس دلکش نغمے کی کمی بہت بری طرح محسوس کرتا۔

میں اپنے ماموں زاد بھائی اور عزیز دوست شاہد کی شادی میں پشاور آیا ہوا تھا۔ رات میں کافی سے سویا تھا۔ ابھی میں جانے اور کتنی دیر سویا رہتا کہ بغلی کمرے سے آتی ہوئی آوازوں سے میری آنکھ گئی۔ یہ لڑکیاں بھی چڑیوں کی طرح ایک وقت میں ایک ساتھ بولتی ہیں۔ آج انہوں نے اس نغمے ک پوری کر دی۔ میں آنکھیں موندے اس چہکار کو سن رہا تھا کہ ایک آواز سنائی دی جو سب سے الگ' سے واضح اور سب سے سریلی تھی۔ پھر سب آوازیں پس منظر میں چلی گئیں۔ صرف اسی سریلی چڑیا کی چہکار باقی رہ گئی۔ کون ہے یہ؟ میں نے سوچا اور میرے دل میں اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔

ہم لوگوں کا گھرانا خوشحال متوسط طبقے کا تھا۔ خاندان کے بزرگ بھی کھلے ذہن کے مالک تھے۔

کزنز ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر لیتے تھے۔ شادی بیاہ کی محفلوں میں گانے بجانے اور ناچنے کودنے میں خوب مقابلہ بازی ہوتی۔ مگر یہ سب کچھ ایک حد کے اندر ہوتا۔ یہ حدود سب جانتے تھے اور انکا احترام بھی کرتے تھے۔

ناشتے پر میں نے سب لڑکیوں پر نگاہ دوڑائی اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ کون تھی۔ سب لڑکیاں حسب عادت بیک وقت محو کلام تھیں کہ وہ بولی اور میں نے سب سے الگ وہ آواز پہچان لی۔ میں نے دیکھا صرف اسکی آواز اور لہجہ ہی سب سے الگ نہیں تھا وہ دیکھنے میں بھی سب سے الگ تھی۔ لیکن میں فوری طور پر نہ سمجھ سکا کہ اس کی کیا بات سب سے الگ تھی۔

ہم لڑکوں کے کام اور پروگرام الگ تھے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے باہر کھایا۔ شام کو جب صرف قریبی رشتہ دار رہ گئے تو لڑکیوں نے ڈھولک سنبھالی اور لڑکوں نے شکار کا پروگرام بنا لیا۔ میرا دل جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ میں اسکو قریب سے دیکھنے اور جاننے کا یہ نادر موقع کھونا نہیں چاہتا تھا۔ جب پوری شیطانی پارٹی موجود ہوتی ہے تو ذرا کسی کو غور سے دیکھو تو چھیڑ چھیڑ کر ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ میں طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر کمرے میں لیٹ گیا۔ جب سب لڑکے شکار پر چلے گئے تو میں لڑکیوں کے کمرے میں جا بیٹھا۔ انہوں نے ڈھولک ایک طرف سرکا دی۔

”آج مزا نہیں آرہا‘ گانے کا مقابلہ کرنے والا جو کوئی نہیں۔ تم گاتے ہو فیصل؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

”اول تو مجھے گانا نہیں آتا اور پھر میں اتنی ساری چڑیوں کا اکیلا مقابلہ نہیں سکتا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پھر چڑیوں میں کیوں آن گھسے ہو؟ نکل جاؤ فوراً۔ ابھی۔ اسی وقت۔“ وہ سب میرے سر ہو گئیں۔

”چلو اب جانے بھی دو۔“ وہ بولی۔

شادی بیاہ کی محفلوں میں تعارف سے بے تکلفی تک کے مراحل جو عام حالات میں مہینوں اور برسوں پر محیط ہوتے ہیں‘ منٹوں میں آنا” فانا” طے ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو مقابلے بازی کے چکر میں گیتوں اور مکالموں میں جوابی کارروائی کے طور پر جھگڑا ہوتا رہتا ہے‘ یہ جانے بغیر کہ مخاطب کون ہے۔ متوسط گھرانوں میں جہاں عام حالات میں لڑکے لڑکیوں کو بے تکلفی سے ملنے جلنے کی آزادی نہیں ہوتی‘ ایسے موقعوں پر انہیں اپنی پسند کا ساتھی ڈھونڈنے کا موقع میسر آجاتا ہے اور غالباً بزرگ بھی اسی لیے چشم پوشی سے کام لیتے ہیں تاکہ انکو جوان بچوں کے مسائل سے نمٹنے میں کچھ مدد مل جائے۔

ہم سب مزے مزے کی باتیں کرنے لگے اور پھر آہستہ آہستہ الگ الگ گروپ سے بن گئے۔ اور ہر کوئی اپنی دلچسپی کی باتیں کرنے لگا۔ ”میں نے آپکو پہلے کبھی نہیں دیکھا؟“ میں براہ راست اس سے مخاطب تھا۔

"قندیل" اس نے سر کو قدرے خم کر کے کہا۔

"فیصل" میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ اور وہ مسکرا دی۔

"آپ پڑھتی ہیں؟"

"نہیں۔"

"آپ پشاور میں رہتی ہیں؟"

"نہیں۔"

"آپ لاہور سے آئی ہیں؟"

"نہیں۔"

"آپ بے حد کنجوس ہیں!" میں نے چڑ کر کہا۔

اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ میری ہمت بندھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اسکے چہرے پر ایک حزن آمیز ملائمت تھی۔ اسکی گیلی گیلی چمکیلی آنکھوں می خلوص کی شمعیں روشن تھیں۔ اسکے کانوں کے ننھے ننھے آویزوں اور شبنم کی بوند جیسی کیل میں سے روشنی کی چھوٹ سے ننھی منی کرنیں سی جگمگاتیں تو یوں لگتا جیسے یہ روشنی اسکے چہرے سے پھوٹ رہی ہو۔ وہ انتہائی نفیس گلابی ریشم کا سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ اسکا چہرہ بھی اس رنگ کے عکس یا کسی اندرونی جذبے سے گلابی ہو رہا تھا۔ اور تبھی میرا دل گلاب کی اس کلی کو اپنے دامن میں چھپا لینے کے لیے مچل اٹھا مگر میں نے اپنے چہرے اور آنکھوں کو ہر تاثر سے خالی رکھنے کی کوشش کی۔ تاکہ اسکی ذہین آنکھیں میری چوری نہ پکڑ لیں۔ "زندگی کتنی حسین، کتنی مکمل ہے۔ اس لمحے! کیوں قندیل؟"

"سب کے لیے نہیں۔" اس نے بڑی آہستگی سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں اس لمحے کی بات کر رہا ہوں، قندیل۔" مخملی پردوں، کرسٹل کے فانوسوں اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ پیراستہ اس کمرے میں مدھم مدھم موسیقی کی لہریں تیر رہی تھیں۔ چمکیلے دمکیلے لباسوں اور روشن چہروں والی لڑکیوں کے کھنکتے ہوئے قہقہوں کی جھنکار ماحول کو گرما رہی تھی۔ سامنے قندیل بیٹھی تھی اور ہمارے درمیان رکھی ہوئی چائے کی نفیس پیالیوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس نے اچٹتی سی نظر کمرے کے ماحول پر ڈالی اور تلخی سے مسکرا دی۔ "ہاں میں بھی اسی لمحے کی بات کر رہی ہوں۔ ذرا باہر جھانکو۔ وہ سامنے صحن میں میلے برتنوں کے ڈھیر اور تھکن اور نیند سے بیک وقت نبرد آزما اس لڑکی کی عمر بارہ سال ہے۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اور کراہ کر اٹھتی ہوئی بوڑھی عورت اسکی ماں ہے۔ یہ سب سے آخر میں سوئیں گی اور سب سے پہلے جاگیں گی۔ بولو اب کیا کہتے ہو۔ اس لمحے کی حسین اور مکمل زندگی کے متعلق۔"

اس گلاب کی کلی کے ساتھ اتنے کانٹے کیوں ہیں؟ میں حیرت زدہ تھا۔

"کیا زندگی سے اس طرح لطف اندوز ہوتے ہوئے کبھی تمہارے دل میں احساس جرم جاگا؟" اس نے پوچھا۔

"آپ تو ایکدم فضول خرچی پر اتر آئیں۔" میں نے ماحول کے بوجھل پن کو ہلکا کرنے کے لیے کہا۔

"آپ نے بڑی خوبصورتی سے میرا سوال ٹال دیا۔" قندیل نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"سچ بولوں کہ جھوٹ؟" میں نے شگفتگی سے کہا۔

"تم جھوٹ بولو گے تو میں جان جاؤں گی۔"

"کیا آپ مجھے بے حس سمجھتی ہیں؟" میں نے جھوٹ موٹ برا مانتے ہوئے کہا۔

"نہیں یہ بات نہیں۔ دراصل کنارے سے طوفان کی شدت کا کبھی اندازہ نہیں ہو سکتا۔" وہ بولی۔

"اور تم تو مجھ سے بھی زیادہ دور سے نظارہ کرنے والوں میں سے دکھائی دے رہی ہو۔" میں نے قیمتی لباس اور ہیرے کے زیورات کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا اندازہ درست نہیں فیصل۔ میں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ تم نے کبھی کسی کو مرتے دیکھا ہے؟"

یہ سوال میرے لیے غیر متوقع تھا۔ "نہیں دیکھا۔ مگر تم اتنی خوفناک باتیں کیوں کرتی ہو؟"

"حقیقتیں اس سے بھی زیادہ خوفناک ہوتی ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے مرتے دیکھا یک غریب عورت کو۔ بیماری اور ناداری نے اسکے جسم کو گھلا دیا تھا۔ اسکا نحیف و نزار جسم شدت درد ہرا ہو ہو جاتا تھا۔ لیکن نہ اسے اپنی تکلیف کا دھیان تھا۔ نہ موت کا ڈر اور نہ اگلی دنیا کی فکر۔ اسکی ہوئی آنکھیں اپنی جوان بیٹیوں کے چہروں پر جمی ہوئی تھیں۔ اپنی تکلیف سے بے نیاز وہ ہاتھ جوڑے بھائی کی منتیں کر رہی تھی کہ وہ اسکی بچیوں کا خیال رکھے' یہاں تک کہ زبان نے اسکا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس دنیا میں آخری سانس میں' آخری نظر میں صرف بیٹیوں کی فکر اور التجا تھی۔ تم پوچھو گے نہیں ' وہ عورت کون تھی؟"

"کون تھی وہ؟" میں نے بمشکل کہا۔

"وہ عورت ہے میری ماں تھی۔" اور شدت ضبط سے اسکا گلابی چہرہ سرخ ہو گیا۔

اور مجھے لگا یہی ہے وہ لڑکی جسے میں کہیں نہ پا سکا تھا۔ مجھے وقتاً" فوقتاً" کچھ لڑکیوں میں کشش محسوس لیکن انکے سطحی پن کو دیکھ کر میں مایوس ہو جاتا۔ مجھ پر واضح نہیں تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور اب قندیل یرے بکھرے ہوئے خیالات کو یکجا کر کے دکھا دیا تھا۔ اب میں نے اپنے تاثرات چھپانے کی کوشش نہ میری نظروں کے والہانہ پن کو وہ بھانپ گئی۔ ابھی میں مناسب الفاظ کی تلاش میں تھا کہ وہ بول اٹھی۔ ور سے بات سنتے ہوئے بالکل میرے بیٹے کی طرح آنکھیں پھیلا لیتے ہو۔"

"بیٹے کی طرح!" میں نے دہرایا۔ میں سمجھا کہ اس نے غلطی سے بھائی کی جگہ بیٹے کہہ دیا ہے۔

"ہاں۔ میری دو بیٹے ہیں۔" اس نے بڑے سکون سے کہا۔

اور مجھے لگا جیسے مجھے کسی نے کے۔ ٹو کی چوٹی سے دھکا دے دیا ہے۔ "تم نے اتنی جلدی شادی کیوں ؟" میں نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"میری شادی کو دس سال ہو چکے ہیں اور اب یہ سوچنے کے لیے بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"دس سال!" میں حیرت زدہ تھا۔

"ہاں جب غریبوں کے ہاں پانچ پانچ جوان بیٹیوں کا بوجھ سینے پر دھرا ہو، جبکہ انکی مناسب خبر گیری کرنے والا بھی کوئی نہ ہو تو کسی اچھے رشتہ کو انکار کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا جاتا۔ چاہے لڑکی کتنی ہی کم عمر کیوں نہ ہو۔"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "میں اس خوش قسمت انسان سے ملنا چاہوں گا قندیل۔ جب وہ آئیں تو مجھے ضرور ملانا۔"

"ممکن ہے وہ خود کو اتنا خوش قسمت نہ سمجھتے ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"اوہ!" میں نے دکھ سے کہا۔

"نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میرے شوہر بہت اچھے انسان ہیں۔ میں تمہیں ضرور ملاتی مگر وہ اس شادی میں نہیں آ رہے۔ بچوں کے ساتھ والدین سے ملنے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔"

"جب کوئی جھوٹ بولتا ہے تو میں بھی جان جاتا ہوں۔" میں نے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اتنی دکھی دنیا کے حقیقی دکھوں کے مقابلے میں ہمارے یہ چھوٹے چھوٹے ذاتی دکھ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔" اس نے بڑے رسان سے کہا۔

وہ چند روز میری زندگی کے حسین ترین دن تھے۔ وہ بولتی رہتی، میں سنتا رہتا۔ ذہانت، خلوص اور دردمندی کی آمیزش نے اسکی باتوں میں ایسی تاثیر پیدا کر دی تھی کہ وہ سیدھی دل میں اتر جاتی تھیں۔ اس نے میری شخصیت کو بدل دیا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار غم کا مزا چکھا تھا، درد کی دولت پائی تھی اور اسکی اس عطا کو لیے میں وہاں سے چلا آیا۔ اسے دیکھ کر شدید احساس زیاں مجھے گھیر لیتا۔ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے امریکہ چلا آیا۔

شور شرابے سے دور یہ سرسبز وادی مجھے بہت پسند آئی۔ صبح کو جب میری آنکھ کھلتی ہے تو مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے گھر کے آنگن میں سو رہا ہوں اور بیری کے پیڑ پر چڑیاں شور مچا رہی ہیں۔ کوئی دوشیزہ چاندی کی پازیب پہنے آنگن میں چلنے لگتی ہے دھیرے دھیرے اور تب اس ایک اکیلی چڑیا کی سریلی اور واضح آواز اس ہم آہنگ نغمے پر چھا جاتی ہے۔ میں اپنی توجہ بچپن کے اس مانوس نغمے پر مرتکز کرنا چاہتا ہوں۔ مگر یہ ایک اکیلی آواز ساری آوازوں کو پس منظر میں دھکیل دیتی ہے۔ بہت ڈسٹرب کرتی ہے مجھے یہ چڑیا۔ اور میں ہار کر صرف اسی کا نغمہ سننے لگتا ہوں جو بہت پرسوز ہے---- سب سے الگ، سب پر چھایا ہوا۔

پتھر کو تراش کر بھی دیکھو
یہ فن بھی خدا کی جستجو ہے ---- احمد ظفر

گرفت

محمد حمید شاہد

ہم دو ہیں اور تیسرا کوئی نہیں۔

اگر ہے بھی تو ہم نے اسے ذہن کی سلیٹ سے رگڑ رگڑ کر مٹا ڈالا ہے۔

وہ میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے میرا بدن اس موم کی طرح ہے جو شعلے کی آنچ سے اس قدر نرم ہو جائے کہ جدھر چاہو موڑ لو۔

یہ شعلہ اس کے اندر بھی ہے اور میرے اندر بھی۔

مگر حیرت ہے یہ شعلہ اس کے بدن کو تپا کر مزید سختی عطا کرتا ہے اور مجھے پگھلاتا چلا جاتا ہے۔

یہی سختی اور نرماہٹ پھسلن کی شروعات ہو سکتی ہیں۔

مجھے یقین ہے ہمیں پھسلنے سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔

ویسے ہم دو کے علاوہ ہے بھی کون، جو ہمیں بچا سکے۔

اور اگر ہے بھی تو ہم نے اسے اپنے ذہن کی سلیٹ سے یوں رگڑ رگڑ کر مٹا ڈالا ہے کہ اس کا ہونا نہ ہونا ایک جیسا ہے۔

مجھے خدشہ ہے یوں پھسل کر گرنے سے مجھے گومڑ نکل آئے گا۔

ایسا گومڑ جو میری ساری رعنائی نچوڑ کر مجھے بدوضع کر دے گا۔

پھر جب پک کر پھٹ جائے گا تو مجھے بدبودار خون اور پیپ میں بھگو دے گا۔

اور شاید اس قدر بھگو دے کہ دیکھنے والوں کو ابکائیاں آنے لگیں۔

وہ کہتا ہے چوٹ تو اسے بھی آسکتی ہے۔

مگر میں جانتی ہوں وہ جھوٹ کہتا ہے۔

اسے جھوٹا سمجھنے کی میری پاس ٹھوس دلیل ہے۔ وہ یہ کہ ہم جب بھی پھسلنے کو ہوتے ہیں میرا رخ زمین کی طرف اور اس کا رخ آسمان کی بجائے میری جانب ہوتا ہے مگر ہر بار وہ پشت کے بل اوپر ہی کو اٹھتا ہے۔

عجب واقعہ ہے کہ وہ آسمان کو آنکھ بھر کر دیکھنے سے گریز کرتا ہے اور نظر مجھ پر ہی جمائے رکھت
جس روز بھولے سے بھی اس کی نظر آسمان پر پڑ جائے اس کے ہونٹوں پر لفظ، پپڑی کی صورت جم
ہیں۔

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ وہی لفظ ہیں جو اس کے ہونٹوں سے پھسل پھسل کر پھسلن بنا
ہیں۔ ایسی پھسلن کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس پر لڑھکتی رہی ہوں۔

ہاں پھسلن کی وجہ اس کے ہونٹوں سے پھسلنے والے لجلجے لفظ بھی ہو سکتے ہیں۔

کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ گفتگو کو میں ہی ابتدا دیتی ہوں۔

مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

اتنا کم کہ میں انگلیوں پر گن سکتی ہوں۔

انگلیوں پر گننا مجھے اچھا لگتا ہے۔

میں اسے کہتی ہوں بار بار دو تک گننے سے مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگتی ہے۔

آؤ پھسلتے پھسلتے وہاں ان ٹھنڈے میٹھے چشموں تک جا پہنچیں جن کا متبرک پانی ہمارے بدنو
بانجھ مشقتوں کو دھو کر انہیں زرخیز کر دے گا۔ پھر نئے پھول اگیں گے۔ ایسے پھول، جن کی مہک خد
دلدل کو ڈھانپ لے گی۔

مگر وہ یہ سن کر بپھر جاتا ہے۔

اور میری ان انگلیوں کو، جنہیں دو تک گنتی ازبر ہو چکی ہے، ان انگلیوں سمیت جو گنتی کے
ہی ناآشنا ہیں، سختی سے اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔

عجب سختی ہے جو انگلیوں سے ہتھیلی اور ہتھیلی سے بدن میں نرماہٹ اتارتی چلی جاتی ہے۔

میری ماں کہتی تھی:

عورت پیدا ہوتے ہی آدھی زمین میں دفن ہو جاتی ہے اور زمین میں دفن ہونے والی، باہر ر
والی کو ساری عمر اپنی گرفت میں لینے کے جتن کرتی رہتی ہے۔

اور مجھے کوئی نیچے بہت نیچے کھینچتا چلا جاتا ہے۔

شاید یہ وہی میرے بدن کا حصہ آدھی عورت ہے جس کی بابت میں نے بتایا تھا۔

مجھے اس وقت ماں کی باتوں پر ہنسی آتی تھی جب کہ اب میں الجھن میں پڑ جاتی ہوں۔

میری ہنسی کی سنہری مچھلی نے الجھن کا کانٹا اس روز نگلا تھا جب مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ
علاقے میں داخل ہو چکی ہوں جہاں پھسلن ہی پھسلن ہے۔

دراصل میں پہلے پہل خلوص دل سے سمجھتی تھی کہ میری ماں ناسمجھ ہے۔

مگر جب سے وہ یہ کہنے لگا ہے کہ ساری ہی لڑکیاں ناسمجھ ہوتی ہیں، مجھے اپنی ماں کی باتیں یا

ہنسی نہیں آتی۔

اب مجھے پہلے پہل کی اپنی بے جا ہنسی پر دکھ ہوتا ہے۔

ہمارے گھر کے صحن میں ایک برگد اگا ہوا ہے۔

مجھے یاد ہے یہ اس وقت بھی تھا جب بان کی کھری چارپائی پر لیٹے ایک شخص کو سفید میلی چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔

میں نے ماں کو پہلی مرتبہ دو ہتڑ سینے پر مارتے' بال نوچتے اور دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ وہ تو چپکے چپکے رونے کی عادی تھی۔ یوں کہ سینے کے اندر ہی اندر کچھ ہوتا رہتا جس کی دھمک بہ مشکل مجھ تک پہنچ پاتی تھی۔ ہونٹ دانتوں تلے دبے ہوتے اور آنکھیں بھیگ بھیگ جاتیں۔ مگر یوں منہ کھول کر روتے اور ہاتھ لہرا لہرا کر بین کرتے میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

میں نے بے اختیاری میں اس کے چہرے سے چادر الٹ دی تھی۔

اجنبی...... بالکل اجنبی چہرہ...... سخت یوں جیسے پتھر سے تراشا گیا ہو۔

اس اجنبی شخص کو' کہ جسے میں نہ جانتی تھی اور جس کے لیے میری ماں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی' صبح ہی صبح صحن میں بچھی کھری چارپائی پر ڈال دیا گیا تھا۔

میری آنکھ اس وقت کھلی تھی جب میری ماں بوکھلا کر میرے پہلو سے اٹھی تھی اور اس کے سینے کی دھمک دانتوں تلے دبے ہونٹوں سے شراٹے بھرتی نکلی تھی۔

پھر میری ماں نے میرے نیچے بچھی چادر کو اس قدر تیزی سے کھینچا تھا کہ میں لڑھکتی پرے جا پڑی تھی۔ ماں نے مجھے نہیں سنبھالا تھا حالانکہ وہ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ جب وہ بھاگ کر صحن میں بچھی ہوئی چارپائی تک پہنچی تھی تو اس نے ادھر ادھر دیکھے بغیر چادر کو پھیلا کر اس شخص کے بدن پر ڈال دیا تھا۔

پھر ماں نے اپنے ہاتھوں کی ساری چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں' بال کھول لئے تھے اور ماتھا چارپائی کے پائے سے ٹکرا ٹکرا کر زخمی کر لیا تھا۔

مجھے ماں کے رویے پر حیرت ہوئی تھی۔

میں بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر جلد ہی اس کی لمبی چیخیں لمبی چپ نے نگل لیں۔

اور لمبی چپ اسے تب لگی جب اس نے یونہی رونے دھونے' لمحہ بھر کو نظر بھر کر مجھے دیکھا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ خود بھی چپ کی چادر اوڑھ کر بے سدھ برگد تلے بچھی کھری چارپائی پر لیٹ گئی۔

مجھ پر حیرت' در حیرت کی جمتی تہیں سل کی طرح ہو گئیں۔

حیرت کی سل اس روز تڑخ کر ٹوٹ گئی جب اس شخص نے میرے لیے لجلجے لفظ اگلے تھے جن کے باعث چاروں اور پھسلن ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا تھا...... بالکل وہی چہرہ تھا..... پتھر سے تراشا ہوا۔ وہی جو بہت پہلے

اپنے گھر کے صحن میں برگد تلے دیکھا تھا.... اور جس کے سرہانے میری ماں نے بین کیے تھے، چوڑیاں توڑ ڈا تھیں اور سینے میں دفن دکھوں کو سسکیوں سے چیخوں میں ڈھلنے دیا تھا۔

گھر کے صحن میں اب بس وہی برگد کا درخت ہے اور میں۔

وہ چہرہ جو پتھر سے تراشا گیا ہے فقط میری سوچوں میں ہے۔

محض اس کا چہرہ ہی پتھریلا نہیں اس کا سارا بدن پہاڑوں جیسا ہے۔

ایسا پہاڑ جس کے اندر آتش فشاں کھول رہا ہے..... اور جس نے اپنا دہانہ کھول دیا ہے جہاں لفظوں کا لاوا نکلتا ہے...... یہی لجلجا اور گرم گرم لاوا مجھے آن کی آن میں پگھلا دیتا ہے..... اوپر کو اچھ کودتا۔

اس کا پہاڑوں جیسا بدن اپنے ہی لاوے کا جزو بن کر اوپر ہی اوپر اچھلتا رہا اور میں روز بروز زمین طرف گرتی چلی گئی۔

مجھے وہی گومڑ بھی نکل آیا ہے جس کا مجھے خدشہ تھا۔

وہ قہقہے لگاتا رہا اور کہتا رہا..... اسے بھی تو چوٹ لگ سکتی ہے۔

مگر میں شروع سے جانتی ہوں...... وہ جھوٹ بولتا ہے۔

اب جب کہ میں عین برگد تلے کھڑی ہوں مجھے اپنی ماں خوش نصیب لگنے لگی ہے۔

اس نے پتھر جیسا چہرہ اپنے سامنے بے بس پڑے دیکھا تھا۔

اس پر آنسو بہائے تھے اور بین کیے تھے۔

کاش میں بھی اتنی خوش بخت ہوتی۔

مجھے تو وہ ساری آوازیں سنی پڑ رہی ہیں جو گھر کے دروازے پر بڑھتی چلی جاتی ہیں۔

مجھے خبر ہے وہاں ایک نہیں، پتھر جیسے چہروں والے کئی ہیں۔ وہ بھی ان ہی میں ایک ہے ان سب بیچ اپنی پہچان کھونے والا......

ان سب کو میرے گومڑ نے مشتعل کر رکھا ہے۔

ابھی میرا گومڑ نہیں پھٹا۔

مگر انہیں خدشہ ہے کہ اگر وہ پھٹ گیا تو ان سب کے گھر اور گلیاں خون اور پیپ سے لت پت جائیں گے۔

دروازہ ٹوٹ چکا ہے۔

اب وہ مجھے دھکیلتے ہوئے شہر سے باہر لے جا رہے ہیں۔

میں گرتے پڑتے ان کے آگے آگے بھاگ رہی ہوں اور وہاں پہنچ جاتی ہوں جہاں پھسلن ہے۔

مجھے حیرت ہوتی ہے۔ پتھر چہروں والے سارے مرد کہ جن کے ہاتھوں میں بھی پتھر ہیں، پھسلنا شر

ہو گئے ہیں۔

ان میں سے کسی ایک کو بھی چوٹ نہیں لگ رہی اور مجھے اس پر تعجب نہیں ہو رہا۔

میں اپنے گومڑ کو دیکھتی ہوں اور ان کے پھسلتے اور اچھلتے بدنوں کو دیکھتی ہوں۔

پھر اس تضاد پر زور زور سے قہقہے لگاتی ہوں اور اس کے لیے بانہیں کھول دیتی ہوں جو میرے پیدا ہوتے ہی مجھے اپنی گرفت میں لینے کے جتن کر رہی تھی۔

ان کتابوں میں اساطیر پبلشرز کا کمال فن ملاحظہ فرمایئے:

احمد ندیم قاسمی کے نو (۹) شعری مجموعے بسیط، لوح خاک، دوام، محیط، دشت وفا، شعلہ گل، جلال و جمال، رم جھم، جمال (نعتیہ)

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے پندرہ مجموعے کوہ پیما، نیلا پتھر، کپاس کا پھول، برگ حنا، سناٹا، گھر سے گھر تک، بازار حیات، آس پاس، درودیوار، آبلے، آنچل، سیلاب و گرداب، طلوع و غروب، بگولے، چوپال،

دوسرے شعری مجموعے

چاند پکھراج کا (گلزار) اعتراف (یاسمین گل)

شب نامہ، برگ و شبنم، بزیر شاخ گل، کائنات ثنا (سید منیر)

فصیل لب، صدیوں کا سفر تھا، نین جزیرے (رشید قیصرانی)

افسانوں کے دوسرے مجموعے

دستخط --------- گلزار

افسانوں کے زیر طبع مجموعے

گھنٹی -------- نیلوفر اقبال

زوال کا دن ------ نکہت مرزا

کھڑکی

عرفان احمد

یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ صبح ہوتے ہی زمین پر جونہی روشنی کی صف بچھتی وہ بھی انگلیوا پوروں میں تسبیح کے دانے رولتی چہل قدمی کے لیے سڑک پر آنکلتی۔ اس پہر سڑک پر بس وہی لوگ دَ دیتے جو منہ اندھیرے مسجد کا رخ کیا کرتے۔ ایک زمانہ تھا اس سڑک پر وہ بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتی فٹ کے کنارے کھڑے درختوں کو پیچھے چھوڑ رہی ہوتی جیسے اب سڑک پر چلتے لوگ اس سے آگے نکل ہوتے ہیں۔ اب تو ٹانگوں میں اتنی طاقت ہی نہ تھی۔ مہینوں پنڈلیوں سے درد بھی نہ جاتا تھا لہذا دھیان کی طرف ہٹائے رکھنا مجبوری تھی۔ دن بھر مصروف رہنے کے بہانے بھی اس نے ڈھونڈ ہی نکالے۔ خانساماں رکھا ہی اس لیے نہیں تھا کہ اس بہانے کھانا وہ خود پکا لیتی تھی البتہ سرونٹ کوارٹر میں ایک عو ضرور تھی جو چھوٹے موٹے کاموں کے لیے اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتی تھی۔

گھر تھا کہ تنہائی کا گھونسلا جہاں اسے اپنی اداسی کے پر سمیٹ کر لوٹنا ہی پڑتا۔ گھر سے باہر تھ دور تک جاتی ہوئی بس یہ ایک بے رونق سی سڑک تھی جو اسے زندگی کیے جانے پر اکسائے رکھتی۔ ت چلتی پھرتی زندگی کا بوجھ اٹھائے کبھی بھی صفحہ ہستی سے نہ مٹنے کے مصمم ارادے سے اپنی جگہ پر جمی سڑا کبھی کبھی اسکے پیروں میں سے اتنی زیادہ سرک جاتی کہ مڑ کے دیکھتی تو وہی سڑک جو تھوڑی دیر پہلے ا دم ساز تھی اس کی دشمن دکھائی دیتی۔ اب تک دھوپ درختوں میں سے پتوں کی سیڑھیاں اتر کر ہر تان سو رہی ہوتی۔ سڑک سے اتنا نہ ہوتا اسکی خاطر تھوڑا سا اپنا آپ سمیٹ لیتی' اتنا کہ اسکا گھر قریب آ آخر روز کا ساتھ تھا۔ اتنا تو اسے کر ہی لینا چاہیے تھا۔

ایک وقت تھا صبح سیر کے دوران اردگرد بنگلوں کی بیرونی آرائشیں خاموشی کی زبان میں اسے کچھ کہہ رہی ہوتیں۔ تب تک مکین سو رہے ہوتے اور کھڑکیوں اور روشندانوں میں نصب شور ڈالے کنڈیشنز انہیں مزید سوئے رہنے کو لوریاں دے رہے ہوتے۔ چلتے چلتے اکثر کسی گھر کی بالکنی یا ٹیرس پھولوں سے لدی بیل کو سراہنے وہ چند ساعت ٹھہر جاتی مگر اب تو ان بنگلوں کی چھتوں پر سے اسکے دھیا گیند لڑھکتی ہوئی سڑک پر آگری تھی جس پر سے نظریں ہٹائے بغیر وہ پہروں چلتی رہتی' اگرچہ کبھی کبھار کسی قدم کی ہلکی سی ٹھوکر سے وہ گیند کہیں گم بھی ہو جاتی جیسا کہ اس روز وہ گیند اچھلی اور اتنی بے قابو

کہ سڑک کے کنارے ایک نو تعمیر شدہ اور بے آباد بنگلے کی بالائی منزل پر نصب کھڑکی سے جا لگی۔ نئے طرز کی کشادہ اور خوبصورت کھڑکی جو کسی نایاب لکڑی کے فریم میں اپنے چمکدار شیشے سنبھالے مرمر سے بنی عمارت کے اوپر یوں جڑی تھی جیسے گوری پیشانی پر بندیا۔

بالکل اک ایسی ہی کھڑکی اس تصویر میں بھی نمایاں تھی جسے چند روز پہلے اس نے ڈاک میں موصول کیا تھا۔ اداسیوں اور جدائیوں کے بے رحم سمندر عبور کرتی ہوئی ڈاک جیسے دور دیسوں سے اڑتے خوشخبریوں کے پرندے اپنی اپنی چونچ میں تسلیوں کے دانے لیے اسکے سامنے ڈھیر کر جاتے جنھیں ایک اک کر کے وہ چگتی اور جب ختم ہو جاتے تو اپنی خالی آنکھیں آسمان میں گاڑ لیتی، کیا خبر کوئی پرندہ پھر سے لوٹ آئے ——— یہ خیریت نامے ہی تھے جن سے اسے اپنے ہونے کا پتہ رہتا۔ اگرچہ ان کے موصول ہونے اور انہیں ایک باقاعدگی دیئے رکھنے میں بھی اس کا اپنا ہی ہاتھ تھا۔ آئے دن قلم تھامے وہ کاغذ کالے کر رہی ہوتی اور انتظار کے راستے روشن کرتی رہتی۔ صبح چہل قدمی کے دوران تسبیح کے علاوہ قریب کے پوسٹ بکس کو خط کے لفافے سپرد کرنا بھی اسکا ایک خاص کام ہوتا۔

جیسے جیسے جانے والے جاتے رہے گھر کی دیواریں تصویروں سے بھرتی گئیں۔ یوں تو اسے ایک ایک کر کے سب کے جانے کا دکھ تھا مگر ایک ”ہاں“ جو اس سے سرزد ہوئی زندگی بھر کا پچھتاوا بن گئی۔ ان دیکھی دنیا میں ان دیکھے لوگوں کو بیٹی کا سپرد کر دینا اپنے ہی ہاتھوں اپنے جسم کے کسی حصے کو کاٹ دینے سے کم نہ تھا۔ شاید تب اسکے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ کب جانتی تھی جب سب دور اس پار سدھار جائیں گے تو زندگی پوسٹ بکس تک جانے والی سڑک پر چہل قدمی کرتی رہ جائے گی۔ تصویریں، خط اور کبھی کبھار کے فون تھے جو رابطہ بنے رہے۔ اگرچہ برسوں میں پھیلے اس انتظار میں وہ دن بھی آئے جو ملاقاتوں کے تھے لیکن ایسے دن آتے تو لمحوں میں بیت جاتے اور جب جاتے تو پہلے سے بھی زیادہ اداس کر جاتے، جیسے پھولوں کے موسم لوٹ جائیں تو بھی خالی گلدان مہکتے رہتے ہیں۔

شروع شروع میں سب اپنے بچوں سمیت چھٹیاں گزارنے اسکے پاس آتے بھی رہے لیکن اب وقت کے ساتھ ساتھ اگلی نسلوں کے ہمراہ ان کی مصروفیات اور مجبوریاں بھی جوان ہو رہی تھیں اور یوں ملاقاتوں میں وقفے بڑھنے لگے۔ اس پر گھر میں دستیاب پرانے وقت کی سہولتیں نئے دور کی عادتوں کے برعکس تھیں۔

”امی اب آپ ہمارے پاس چلی آئیں ——— اس گھر کو چھوڑیں اور ہمارے گھر چل کر آرام سے دن گزاریں ———“

ایسے میں وہ چہرے پر ایک رسمی سے مسکراہٹ پھیلا دیتی۔ اب بھلا انہیں کیا بتاتی کہ اس گھر کے در دریچوں سے اسکی وابستگی کی نوعیت کیا ہے۔

”امی اب تو ان صوفوں کے کورز بدل دیں ———“

”پردے پرانے ہو چکے ہیں پھر ان کی ریلنگ کس قدر رکاوٹوں والی ہے۔“

”ریفریجریٹر بدلنا پڑے گا ——— برسوں سے یہ ہی فرج اس گھر میں ہے۔“

"امی اب تو اس میز کی جان چھوڑ دیں——— کتنے روپے چاہیں کبھی کمی رہنے دی ہے آپ کو؟———"

انھیں کیا معلوم وہ چند روپے جو اس کے بیٹے اسے دیا کرتے ہیں، کیا اس کی گزر بسر انہی پیسوں می ہے۔ وہ تو محض ایک احساس تعلق پیدا کئے رکھنے کا بہانہ ہے——— مگر یہ سب کچھ ان پر ظاہر کرنا بھ تو ضروری نہیں۔

بیٹے اور بہوئیں جب اسکے رہن سہن اور اس کے گھر کی اندرونی آرائش کو تنقید کا نشانہ بناتے ت بیٹی کی جدائی کی پھانس اور بھی شدت سے اسکے دل میں چبھنے لگتی۔ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ بیٹی کو بھی اسکے گھ کی پرانی چیزیں اس حالت میں ہرگز قبول نہ ہوں گی لیکن پتہ نہیں کیوں ایسے میں وہ چاہتی تھی، بات کرنے ک سہی، کوئی کھڑکی تو کھلی ہو——— اس مرتبہ کی ڈاک میں بیٹی نے اسے اپنے نئے گھر کی کچھ تصویری بھیجی تھیں۔ وہ پہروں ایک ایک تصویر پر نظریں جمائے گھر کی تفصیل میں کھوئی رہتی، بیٹی کے گھر میں خود ا رہتی بستی محسوس کرتی———

ہر تصویر جس بھی زاویئے سے اتاری گئی تھی ایک کھڑکی تھی جو پس منظر میں ضرور دکھائی دیتی۔ گھ کی بالائی منزل پر نصب وہ خوبصورت کھڑکی بالکل سڑک کے کنارے نوتعمیر شدہ اس بے آباد اور ویران بنگ کی کھڑکی سی تھی۔ تصویر میں دکھائی دیتی کھڑکی کے اندر گرے پردوں کے رنگ سے گھر کی اندرونی آرائش اندازہ بھی ہوتا تھا۔ شام کو جب ہوائیں بادل گھیر لاتی ہوں گی تو اکثر وہ کھڑکی کھول کر موسم کا نظارہ کر ہوگی۔ ممکن ہے اسکے بچے جب لان میں کھیلتے ہوں تب بھی وہ اسی کھڑکی سے انہیں پکارتی ہو۔ پھر اسی کھڑ سے وہ موسم کی کروٹ کا اندازہ بھی کرتی ہوگی اور اس دن کے بارے میں سوچتی ہوگی، آیا اسے کپڑے دھو سکھانے کے لیے باہر پھیلانے ہیں کہ نہیں۔ بارش کی رفتار بھی وہ اسی کھڑکی سے دیکھتی ہوگی۔

اب جب بھی چہل قدمی کرتے ہوئے وہ سڑک پر اس بنگلے تک نکل آتی تو پتہ نہیں کیوں دور دکھائی دیتی بنگلے کی کھڑکی میں اسے اپنی بیٹی کی پرچھائیں نظر آتی۔ ایک روز جب وہ بنگلے کے باہر کھڑی اپنے کسی دھیان میں گم تھی اچانک بنگلے کے مرکزی داخلے پر تعینات گارڈ نے اسے چونکا دیا———

"بیگم صاحب! گھر تو مکمل ہو گیا ہے مالک آنے ہی والے ہیں۔"

جانے کیوں اسے بنگلے کے آباد ہونے کا انتظار رہنے لگا۔ اندر ہی اندر سے وہ یہ ارادہ کئے ہوئے تھ کہ بنگلے میں داخل ہو کر کھڑکی تک ضرور جائے گی۔ ایسے میں وہ ان تمام بہانوں کے تانے بانے بنتی جن کی بن پر اسے بنگلے کے اندر گھومتے ہوئے بالائی منزل کی اس کھڑکی تک جانا تھا۔ اسے چھونا تھا۔ ممکن ہے وہ ا کھڑکی سے لپٹ کر رونے بھی لگ جائے——— اور کبھی ایسا بھی سوچتی کہ اگر بنگلے کے مالک کو وہ صا طور پر بتا بھی دے کہ اس کھڑکی سے اسکا کیا تعلق ہے تو یوں بھی اس کا مقصد پورا ہو سکتا ہے لیکن پھر یہ سو کر کہ ممکن ہے یہ بات مالک کو قائل نہ کر سکے وہ یہ خیال ذہن سے جھٹک دیتی۔

ان دنوں اس کا بڑا بیٹا اپنے بیوی بچوں سمیت اسے ملنے آیا ہوا تھا——— بہو گھر میں ہر وق

تے پھرتے ڈرائنگ روم میں رکھی سنگھار میز کو تنقید کا نشانہ بنائے رکھتی۔

”بھلا سیٹنگ روم میں اس ”اٹیک“ کو سجانے کی تک کیا ہے؟—— آئینہ اس قدر دھندلا ا ہے کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا—— ہماری بیٹی کے رشتے کی بات اس شہر میں ہو رہی ہے۔ شاید منگنی ں رسم اسی گھر میں ہو—— خدا کے لیے امی اس پرانے وقتوں کی ڈریسنگ ٹیبل کو یہاں سے ہٹائیے —— اسے ڈس پوز آف کر دیجئے۔“

بیٹے اور بہو کی آرائش خانہ کے سلسلے میں نت نئی تبدیلی کے ہر مشورے کا مقابلہ وہ خاصی مزاحمت ے کرتی چلی گئی—— مہمانوں کی آمد قریب تھی اور ڈریسنگ ٹیبل بہو کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح ہ رہی تھی—— اس پر یہ کہ ڈریسنگ ٹیبل گھر میں کہیں اور بھی تو رکھی نہیں جاسکتی تھی۔

”باقی ہر تبدیلی جو تم چاہتی ہو کر لو بہو لیکن میں اسے یہاں سے نہیں ہٹاؤں گی——“

”تو پھر تو امی یہ ضد والی بات ہوئی نا—— آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ اول تو ڈریسنگ ٹیبل ائنگ روم میں رکھی نہیں جاتی۔ اس پر اتنی پیٹیپر قسم کی ڈریسنگ——“

کئی روز تک ڈریسنگ ٹیبل گھر میں تنازعہ کا باعث بنی رہی بعض اوقات بحث ناخوشگوار لہجوں اور لوں کے تبادلے کی صورت بھی اختیار کر لیتی۔

ایک شام جب اسے کسی کام سے گھر کے باہر جانا تھا واپس آئی تو ڈرائنگ روم تو کیا گھر کے کسی نے میں وہ ڈریسنگ ٹیبل نہیں تھی—— پتہ نہیں کیوں انہی قدموں گھر سے نکلی اور تیز رفتاری ے کھڑکی والے بنگلے کی طرف چل پڑی۔ آج جانے کہاں سے اسکی ٹانگوں میں اتنی طاقت بھی آگئی تھی اور لیوں میں درد بھی نہیں تھا—— جونہی کھڑکی والے بنگلے پر اس کی نظر پڑی وہ ایک لمحے کو وہیں رک ں—— کھڑکی کھلی تھی اور بنگلے کے اندر کاروں اور لوگوں کا ہجوم تھا۔ تو گویا بنگلہ آباد ہو گیا اور اب آسانی سے اندر جاسکتی ہے—— کھڑکی والے کمرے تک—— لیکن کس بہانے؟ —— یہ سوچ کر وہ کچھ دیر وہیں رکی رہی——

”بس جی قدرت کے کھیل ہیں اپنے بنگلے میں آباد ہونے کی دیر تھی کہ چل بسی—— مالکن ج صبح ہی آئی تھیں—— زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔“ بنگلے کی جانب جاتے ہوئے کچھ لوگ اسکے یب سے گزرے۔ ان کی بات سن کر خوشی کی ایک پھوار اس کے اندر پھوٹ پڑی۔ گویا اس لمحے بنگلے میں خل ہونے کے لیے کسی واقفیت' کسی بہانے کی ضرورت نہیں تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ بنگلے کی عمارت ں تھی——

”میت اوپر ماسٹر بیڈ روم میں ہے——“ کسی نے اسکی راہنمائی کی—— سیڑھیاں ھ رہی تھی کہ آنکھوں میں دریا چڑھ آئے۔ مشکلوں سے وہ اپنا آپ ضبط کئے ہوئے تھی مگر جونہی اس نے مڑکی کے سامنے بیڈ پر رکھی میت دیکھی اس سے رہا نہ گیا اور سارے بند ٹوٹ گئے۔ میت کے سرہانے ماڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"ماں لگتی ہے —— اتنا تو مائیں ہی رو سکتی ہیں ——" کمرے میں موجود سوگوار عورتوں میں چہ مگوئیاں سی رینگنے لگیں —— سینہ پیٹتے ہوئے اسے بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی کہ سفید چادر سے ڈھکی لاش اسکی اپنی ہے کہ بیٹی کی۔

برسوں پہلے ایک روز جب وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے ہی کسی دھیان میں گم تھی تو وہ اچانک عقب سے نمودار ہوئے تھے اور بغیر کچھ بولے چپکے سے اسے ایک ہار پہنا گئے۔ اس شام عہد و پیان کئے پورا ایک برس ہونے کو تھا۔ وہ عکس آج بھی اس آئینے میں محفوظ تھا جو اسکے بچوں کو دھندلا دکھائی دیتا تھا۔

اس کے بالوں کی چاندی کا تقاضا بھی تو یہی تھا کہ وہ اس آئینے کو دھندلا ہی رہنے دیتی۔

ناتمام ، ناگزیر اور ناشنیدہ کے بعد
فکر کی پاسداری اور حرف کی تہہ داری کے شاعر
محسن احسان کا ایک اور شعری مجموعہ
//نارسیدہ// زیرِ طبع ہے

اُردو غزل کی ایک جیتی جاگتی مثال
نجیب احمد
کی غزلوں کا اوّلین مجموعہ
عبارتیں شائع ہوگیا ہے
قیمت : ۱۲۰ روپے
ناشر: جنگ پبلشرز ، ڈیوس روڈ ، لاہور

کنتری

نسرین قریشی

"گیارہ برس کی عمر میں ہی پکی جنانی جیسے چھل ہیں تیرے۔ یوں تو باپ تیرا ہر وقت تیرے روگ کی دہائی دیتا پھرتا ہے۔ تیری یہ دھمال دیکھے تو پسلیوں کی چھال اتار کر مٹکے میں ڈال دے۔ آنے دے آج اس پوستی کو۔ تیرے سارے کسب اسے بتاؤں گی۔ اور بھی تو چھوریاں ہیں پر تیرے جیسی ہتھ چھٹ ایک بھی نہیں۔ دیکھ ذرا میرے لمڈے کی لات سیدھی نہیں ہو رہی۔ اب اگر اسے کبھی چھوا تو تیرا جھٹکا کر ڈالوں گی۔ حرامجادی کونسلی کہیں کی!"

"جا' لے جا اندر اٹھا کر اسے' نہیں تو دوسری لات کا بھی کڑکا کر دوں گی۔ سمجھا دے اسے خوب سے۔ شرم نہیں آتی لٹکن اٹھا کر مجھے نہاتے جھانک رہا تھا۔"

"تجھ روگن میں ہے ہی کیا جھانکنے کو۔ نہ اگاڑ نہ پچھاڑ۔ تو بیچ بجار نہائے تو بھی کوئی نہیں دیکھے گا۔ اری گلہائی..... اب بھی تو اولے سے نکل کر ہی مارا ہے۔ کونسا ٹھڈ لگ گیا تجھے دیکھنے کو۔"

صابو نے جلدی سے خود کو ڈھانپا اور اندر بھاگ گئی۔ ایسے جھمیلے تو دن رات ہوتے رہتے تھے۔ وہی بدقسمت تھی۔ ماں اسے جنتے ہی مر گئی اور باپ سے کسی دوسرے عورت نے بیاہ نہ کیا۔ صابو روتے سوتے پل ہی گئی۔ ڈھارے کی اس بستی میں پندرہ بیس ہی گھر تھے۔ پر پچاسیوں ننگ دھڑنگ بچوں کے شور و غل سے کسی پل ٹھہراؤ نہیں تھا۔ کالے سوکھے ٹیڑھی ہڈیوں والے آوارہ بچے سارا دن کوڑے کے ڈھیروں پر موج میلہ کرتے رہتے۔ ان ڈھیروں کے ساتھ ہی گہری گہری کھائیاں تھیں جہاں ڈھارے والے کچی شراب کے مٹکے دباتے۔ بچے تپتی دوپہروں میں ان کھائیوں میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے رہتے۔ کبھی کبھی صابو اور سلو بھی ان ڈھلانوں میں پھسل جاتے۔ سلو ہی تو ایک سنگی تھا جو صابو سے مار کھا کر بھی اسکے ساتھ ہی چپکا رہتا۔ بیمار اور چڑچڑی صابو سے کسی اور کی تو بنتی ہی نہیں تھی۔ اسکی بیماری بھی ایسی تھی جسکی سمجھ کسی سیانے کو نہ آئی۔ اسکا باپ ہر چوتھے روز رتے حکیم جی سے اسکی دوا لاتا۔ مالش کرتے کرتے اسکے ہاتھ شل ہو جاتے پر صابو کی حس نہ جاگتی۔ اسے کسی کھٹی میٹھی چیز کے ذائقے کا کوئی ادراک ہی نہ تھا۔ اسکی زبان پر ننھے ننھے ذائقے کے ابھار ہی نہیں تھے۔ نہ ہی اسے کسی بو' خوشبو کا احساس تھا۔ وہ تو بس چھوئی ان چھوئی تھی۔

دن بھر پتھر کی بڑی کونڈی میں نمک کی ڈھیلیاں کوٹتی رہتی۔ پھر چھان پھٹک کر انکی چھوٹی چھوٹی پڑیاں باندھتی۔ کاغذ کے تکون ٹکڑوں میں نمک جما کر اسے تین بل دے کر آخری سرے کو اندر کی جانب موڑ دیتی۔ شام ہوتے ہی ٹوکری ادھ بھری ہو جاتی۔ نمک کوٹتے کوٹتے آدھا بدن تو نمکین ہو جاتا پر صابو کو کبھی احساس نہ ہوا۔ باقی لڑکیاں بھی یہی کام کرتیں پر وہ کام ختم ہوتے ہی نہا کر ہاتھوں باہوں پر سرسوں کا تیل ملتیں، تب بھی انگلیوں کی پوروں میں ترپ ترپ چنگیں پھوٹتی رہتیں۔ بار بار وہ زبان کی نوک سے اپنی جلد کو چکھتی رہتیں۔ صابو ان عذابوں سے بے نیاز تھی۔ مٹکا دبانے کے لیے بھی سبھی کام وہ خود کرتی۔ بازار سے گڑ، چھال اور کشمش خرید کر لاتی اور کبھی کبھی سرکنڈے لینے بھی خود ہی چلی جاتی۔

صابو کا باپ رات دیر سے گھر آتا تب تک وہ کچے دارو کا مٹکا تیار کر رکھتی۔ کبھی کبھی نمک کوٹتے ہوئے وہ سلو کو ساتھ بٹھا لیتی۔ کام کرتی رہتی اور ساتھ ساتھ اپنے دکھڑے سناتی رہتی۔ سلو اٹھتے ہوئے اسکا بازو پکڑ کر چکھ لیتا اور وہ سر جھٹک دیتی۔ اب وہ چودھویں برس کی ہو رہی تھی پر بالکل سیدھی سلیٹ جیسی۔ ڈھارے کے کسی لونڈے نے مڑ کر دوسری بار اسے نہ دیکھا۔ بس اک بچپن کا بیلی سلو ہی تھا پر اسکی ماں کو صابو سے ازلی بیر تھا۔ جونہی وہ اسے صابو کے ساتھ دیکھتی اپنی اوڑھنی ماتھے پر باندھ کر اسے ہاتھوں کے اشاروں سے ننگا نچوا دیتی۔ صابو اس سے دس ہاتھ آگے تھی۔ وہ بھی بھاگ بھاگ کر اسے نئے محاوروں سے مزین ہم قافیہ اور ہم وزن گالیوں سے اندر تک دھکیل آتی۔ بیچارہ سلو دونوں سے مار کھاتا۔ پر پھر بھی صابو کے ساتھ سارے کام کراتا۔ فقیرہ دوپہر کو دارو پی کر خراٹے لیتا رہتا اور صابو ساری دوپہر نمک کوٹتی رہتی۔

فقیرے کا دارو ڈھارے میں سب سے اچھا ہوتا۔ مل کے مزدور اکثر فقیرے کو پیشگی پیسے دے دیتے۔ جو آدھے تو صابو کی بیماری پر اٹھ جاتے اور باقی سے مٹکے کا سامان آجاتا۔ اب سلو نے سبزی ترکاری کی ریڑھی لگا لی تھی۔ رات کو گھر آنے سے پہلے وہ صابو کے پاس ضرور جاتا۔ اور جس رات اسکی بھٹی جلتی وہ وہیں رہتا۔ دارو کشید ہوتا رہتا اور وہ لمبے لمبے سانس بھرتا رہتا۔ صابو کے بازو بھیگ جاتے تو غیر ارادی طور پر انکو تھام کر چکھ لیتا اور پھر جھجک جاتا۔ صابو کی جلد پر دوائی کی رگڑائی سے جگہ جگہ زخم سے آگئے تھے اور پوریں بھی زخمی رہنے لگی تھیں۔ وہ ہر انگلی پر الگ الگ پٹی باندھے رکھتی۔ اوپری جلد غائب ہونے سے اب اسکے زخموں میں ہلکا سا درد محسوس ہونے لگا اور سلو کے چھونے سے کبھی کبھی اسے جھرجھری سی آجاتی۔ لمس کی ہلکی سی لرزش بکھر جاتی۔ پاؤں کے دونوں انگوٹھوں سے تپش اٹھ کر سر کے دائیں جانب چلی جاتی۔ فقیرا وہیں پڑے پڑے سو جاتا اور سلو آگ جلاتا رہتا۔ جوں جوں بوتلوں میں دارو کشید ہوتا، صابو انہیں بند کر کے رکھتی رہتی۔ ذرا سا کھٹکا ہوتا تو سلو باہر جا کر دیکھ آتا جہاں سلامت اور بابا فیکا پہرہ دے رہے ہوتے۔ ہر گھر کی بھٹی اپنی باری سے دہکتی۔ اور پہرہ بھی باری پر لگتا۔ کئی بار پولیس چھاپہ مارتی پر ہفتہ طے ہونے پر چند ماہ گزر جاتے۔

ڈھارے میں سب کو سبھی کچھ پتہ ہوتا۔ فقیرے کو اپنی بیٹی کی کچھ بہت چنتا نہیں تھی۔ اس نے سلو کی آنکھوں میں بیٹی کا مستقبل دیکھ رکھا تھا۔ پر وہ اسکی بڑھتی ہوئی بیماری سے کبھی کبھی خوفزدہ ہو جاتا۔ اب تو

ماہو کے کندھوں اور پیٹھ کی جلد سن رہنے لگی۔ ریڑھ کی ہڈی کے دو اطراف سویاں سی چبھتی رہتیں۔ اسکی م عمر لڑکیاں اس سے بہت مختلف تھیں۔ وہ آپس میں اکٹھی کھیلتیں' چھیڑ چھاڑ کرتیں' ایک دوسرے کو لدگدی کرتیں تو ہنستے ہنستے دوہری ہو جاتیں۔ صابو چپ کر کے انہیں مچلتے لہراتے اور پھڑکتے دیکھتی رہتی۔ گھر کر اپنے بدن کو چھوتی' ٹٹولتی پر بہت ہلکی سی تھپک ہی ہوتی۔ ہاں سلو جب کبھی اسے چھوتا تو ایک نامعلوم سا رتعاش جاگ اٹھتا۔ اسے پتہ تھا کہ بیماری لاعلاج ہے۔ وہ اکڑوں بیٹھ کر کئی بار اپنے گھٹنوں کو آپس میں زور ے بجاتی پر دیر بعد کہیں درد کا جھٹکا پڑتا۔

بدن کے جوڑوں کی ساری ہڈیاں تو ننگی تھیں جو اسے خود بھی چبھتی رہتیں۔ سوائے چہرے کے ابو پر کہیں بھی سولھویں برس کی چھاپ نہیں تھی۔ جب سے سلو نے ریڑھی لگائی وہ صبح جاتا اور شام کو گھر تا۔ فقیرا دن بھر سوتا رہتا اور شام کو نمک کی پڑیوں والی ٹوکری اٹھا کر مل کے مین گیٹ پر چلا جاتا۔ سات بجے ردوروں کو چھٹی ہوتی۔ فقیرے کی ٹولی کے سارے مزدور اسی سے دس دس پیسے کی پڑیا خریدتے اور منکے گجر ے ڈیرے جا بیٹھتے---- دارو کے گھونٹ کے ساتھ نمک لگی انگلی چاٹتے رہتے۔ یہ نمک کی پڑیا انکے لیے بابوں کا نعم البدل تھی۔ رات کو فقیرا گھر آتا تو پیشگی رقم اس کے پاس ہوتی۔ سلو کے مصروف ہونے سے بو کے شب و روز اور بھی مدھم اور بے حس ہوگئے۔ اس پر اکتاہٹ اور مردنی کی دبیز تہیں چڑھنے لگیں۔ اپنی ہم عمر لڑکیوں سے کترانے لگی۔ ان کی ابلتی جوانی سے اسے نفرت ہونے لگی۔ ان کے لبریز کالے اور راز بدن دیکھ کر اسکا جی چاہتا خود کو بھٹی کی آگ میں جھونک ڈالے۔ اب اس نے کام بھی کم کر دیا۔ اور سہ کو کھاٹ پر رضائی ڈالے لیٹی رہتی۔ سلو سے بھی ناراض رہنے لگی۔ وہ بیچارہ دن بھر سڑکوں پر ترکاری بیچتا شام کو مل کے گیٹ پر آن ٹھہرتا۔ جو بچی کچی سبزی ہوتی وہ بھی بک جاتی۔ گھر آنے سے پہلے وہ صابو کے ، ضرور جاتا پر آجکل اسکی ماسی ہندوستان سے کنبے سمیت آئی ہوئی تھی۔ آج بھی صابو نے اس سے کوئی ، نہیں کی۔ وہ یونہی نمک کی ڈھلیاں تھیلے سے نکال کر ایک طرف رکھتی رہی۔

"یہ پٹیاں کھول کر صاف کر لے۔ کتنی گندی ہو رہی ہیں۔ بڑے ڈاکٹر نے بھی یہی کہا تھا۔ اوپری ل میں تو حس نہیں ہوتی پر کھال کے نیچے ماس میں تو ہے نا۔ اسی لیے تو تیرے زخم دکھتے ہیں۔ تجھے یہ نمک ڈالے گا۔ چھوڑ دے۔ اب نہ پیسا کر۔ میں شہر سے چھوٹی چکی لے آؤں گا۔ رات کو خود ہی پیس دیا ں گا۔ ماسی اپنے سارے ٹبر ٹیر کے ساتھ یہیں رہنے کو آگئی ہے---- کل اسی لیے تو آیا نہیں۔ آج جلانی ہے نا۔"

صابو نے ایک نظر سلو کی جانب دیکھا اور اٹھ کر باہر لکڑیاں جمع کرنے لگی۔ مٹکا تیار تھا۔ اس نے کچا ڑے دیگچے میں انڈیل دیا۔ خمیر کی تیز باس اس کے آس پاس پھیل گئی۔

"صابو یہ دیکھ۔ تجھے دکھاؤں حیدر آباد کی کتری۔ یہ بس اتنی سی بوتل ہے۔ بڑی تیز ہے۔ ماسی نے ہے۔ وہاں لوگ اسے کتری کہتے ہیں۔ لے۔ ذرا سی چکھ تو لے۔....."

صابو چپ چاپ لکڑیاں بھٹی میں جوڑتی رہی۔ سلو نے آگے بڑھ کر ہولے سے اسکا ہاتھ تھاما' اور

باہر لے آیا۔ اس نے آہستہ آہستہ اسکی تمام انگلیوں کی پٹیاں کھول دیں۔ اسکی انگلیاں چکنی اور گلابی ہو گئی تھیں۔ باہوں کی کھال ادھڑ گئی تھی..... سلو نے منہ سے بوتل کا ڈھکن کھولا... اور اسے صابو کے بازوؤں اور ہاتھوں پر انڈیل دیا۔ اسکے زخموں سے شوں شوں کرتا جھاگ اٹھنے لگا۔ پھر اسے لگا جیسے وہ آسمانی پنگوڑے پر بیٹھی ہے۔ اور وہ اوپر سے نیچے آرہا ہے۔ گردن کی پچھلی ہڈیوں سے آتشیں لہریں اٹھنے لگیں۔ نہ جانے اک لمحے میں ہی اسکے بدن میں کیسا بھونچال سا آگیا تھا۔ تیز گرم گرم لہریں اسکے رگ و ریشہ میں اترنے لگیں۔ اور پھر بدن کی بے حسی کا باریک سا جال ٹوٹتا گیا۔

سلو نے اسکے بازوؤں سے ساری کتری اپنے اندر جذب کر لی تھی۔ اسکے کھردرے ہاتھوں کا لمس آج پہلی بار صابو کی حسیات کی دہلیز پار کر گیا تھا۔

ناصر کاظمی کی شخصیت اور شاعری پر لکھی جانے والی پہلی کتاب

ناصر کاظمی ـــــ شخصیت اور فن

مُصنّفہ : ناہید قاسمی
قیمت : ۸۵ روپے

یہ کتاب دورِ حاضر کے اس بڑے
غزل گو کے فن کا بھرپور محاکمہ ہے

ناشر : فضلِ حق اینڈ سنز، پبلشرز، دربار مارکیٹ، لاہور

"کاوش بٹ جدید اردو غزل میں سلاستِ اظہار اور طہارت کی ایک عمدہ مثال ہے"
(احمد ندیم قاسمی)

اُردو غزل کے تازہ فکر شاعر کاوش بٹ کے شعری مجموعہ "لفظوں کی عدالت" کے بعد دوسرا مجموعہ

"عہد"

خوبصورت ٹائیٹل اور گٹ اپ کے ساتھ منظرِ عام پر آ چکا ہے

فلیپ : احمد ندیم قاسمی
تعارف : مرتضیٰ برلاس

پبلشرز "آسمان" لاہور

لری

فوزیہ چودھری

اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور اس کا بچا ہوا ٹکڑا جس پر راکھ موجود تھی ، ایش ٹرے میں مسل دیا۔ ے توقف کے بعد اس نے اپنی نیم وا آنکھیں اوپر اٹھائیں اور انہیں پوری طرح کھول دیا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ ے ہونٹ پھیل گئے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کی یہ مسکراہٹ بے معنی ہے۔ تھکی ہوئی ، مضمحل سی ، وہ اپنی لو مسکراہٹ کے پردے میں چھپانے کی بے کاری سی کوشش میں مصروف تھا اور بری طرح ناکام ہو رہا تھا۔

"میں اس سارے عمل سے اکتا گیا ہوں، تھک گیا ہوں ، مجھ سے یہ یکسانیت کی زندگی نہیں گزاری جاتی۔ اگرچہ نئے لوگوں سے ملتا ہوں ، کوشش کر کے گفتگو کے لئے نئے نئے موضوعات ڈھونڈتا ہوں۔ گھر سے نکلتے وقت التزاماً تیار کرتا ہوں تاکہ مجھے ایک ہی راستے سے گزرتے ہوئے یکساں سڑکوں ، عمارتوں اور چہروں کی دیکھنے کی بوریت نہ ہونا پڑے، مگر میں اس سب کچھ کے باوجود خود کو خوش رکھنے میں ناکام ہوں۔"

وہ اپنی تھکی تھکی آواز میں بولتا چلا گیا اور میں نے اسے درمیان میں ٹوکنا مناسب خیال نہ کیا۔ یوں محسوس ہوتا ہ آج سب کچھ بیان کر دے گا۔ اس کے اندر اداسی کی جو گھمبیرتا ہے اسے وہ ایک ہی بار نکال باہر کر دینا چاہتا وہ خود کو ہلکا پھلکا کر سکے۔

اس نے نئے سرے سے سگریٹ سلگایا اور کچھ دیر تک اس کے لمبے لمبے کش لیتا رہا۔ اس کی کھلی کھلی آنکھیں ہو گئی تھیں اور وہ سگریٹ کے دھوئیں کے بڑے بڑے مرغولے منہ سے باہر نکالے بغیر انہیں حلق سے نیچے اضطراری انداز میں اس کے پاؤں ایک دوسرے کو مسل رہے تھے۔

"یہ کبھی کبھار مجھے کیا ہو جاتا ہے" اس نے خود کلامی کے انداز میں سرگوشی کی۔

میں نے تب بھی دخل اندازی مناسب نہ سمجھی۔ شاید وہ سب کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر کہہ نہ پاتا تھا۔

"میری چاروں طرف آوازوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے۔ میں اس ہجوم میں گھر جاتا ہوں مگر یہ کیسی لاتعلقی ہے کہ ں کوئی آواز بھی سننا نہیں چاہتا۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ، یہ غیر دلچسپ لوگ ، یہ غیر دلچسپ آوازیں ا غیر دلچسپ گفتگوئیں ، یہاں کچھ بھی دلچسپ نہیں ہے۔ وہ دلچسپ حقیقت ، وہ دلچسپ آواز اور وہ دلچسپ گفتگو۔ ود نہیں ہے۔"

اس نے کرسی کی پشت سے سر اٹھایا اور پہلو بدلتے ہوئے اپنی آنکھیں نرمی سے کھول دیں۔ ایک ناتمام سی پرچھائیں اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ وہ ابھی مزید بولنے پر آمادہ تھا۔ "یا میں وہاں موجود کیوں نہیں میری قربت میں چہروں پر رنگ جھلکتے ہیں ، بیخودی طاری ہوتی ہے۔ مجھے خاموشی سے پہروں تکا جاتا ہے۔ جہاں ں ہو جاتے ہیں۔ خاموشی خوبصورت اظہار بن جاتی ہے اور پھر میں اس خاموشی کو بولتے ہوئے سنتا ہوں ، کیا

تمہارے ہاں بھی خاموشی کو کتی ہے؟" اس نے مجھے شریک گفتگو کرتے ہوئے کہا "کیا تم انکشاف ذات کے اس ت
سے کبھی گزرے ہو؟ جب خود میں ایک اور وجود کا احساس ہوتا ہے، جس کے بدن سے اٹھنے والی خوشبو، تمہارے بد
خوشبو ہی ہوتی ہے۔ جس کی محسوسات بھی ویسی ہی ہوتی ہیں۔ جس کے سوچنے کا انداز بھی وہی ہوتا ہے۔ جس کی سکھ میں سانجھ ہوتی ہے۔ مگر میں یہ سب تم سے کیوں پوچھ رہا ہوں؟"

وہ ایک لمحے کو اپنی خود کلامی سے چونکا۔ مگر اگلے ہی لمحے پھر گویا ہوا "اتنی بسیط کائنات میں انسان کی ہی کیا ہے؟ کم مایہ، حقیر --- کیا یہ سوچ ہی انسان کو اپنا مقام یاد دلانے کے لئے کافی نہیں ہے؟ ایسے میں انسانی !
معنی دارد ---؟

لاینحل الجھن کا احساس مایوسی کی شکل میں اس کے لہجے میں اتر آیا وہ مضمحل لہجے میں بولا "میں دوستو
بیٹھتا ہوں، قہقہے لگاتا ہوں یا غالباً وہ میری باتوں پر بے اختیار قہقہے لگاتے ہیں۔ میں بھی تو انہیں لطیفے پہ لطیفہ سنا۔ جا رہا ہوں۔ دلچسپ لطیفے، قہقہہ بار لطیفے، بے معنی لطیفے، خود ساختہ لطیفے، مگر اچانک ہنستے ہنستے مجھے یوں محسوس ہو۔
ہے کہ میری یہ ہنسی کھوکھلی ہے، محض خود فریبی ہے، میں دھوکا دے رہا ہوں۔ مگر کس کو؟ دوستوں کو، یا پھر
ہی۔ ہنس کر میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ میں خوش ہوں یا خوشی کو خود پر طاری کر لیتا ہوں۔ مگر پھر اندر کہیں
بھری ٹیس اٹھتی ہے۔ دل بوجھل ہونے لگتا ہے اور یہ بوجھ تنہائی اور اکلاپے کے جان لیوا احساس کو اور زیادہ ابھارتا
اتنے سارے لوگوں کے ہجوم میں بھی میں تنہا ہو جاتا ہوں۔ وہی دوست اور ہمنوا جو میری باتوں پر بے ساختہ قہقہے
ہیں، ہنستے ہیں، نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں انہیں مجھ میں سو عیب نظر آنے لگتے ہیں۔ میں نے بارہا انہیں چھپ چھ
اپنی باتیں کرتے سنا ہے"

"تم بہت تھکے ہوئے لگتے ہو۔ کچھ دیر کو نیند لے لو۔ طبیعت بحال ہو جائے گی تمہاری۔" میں ے پہلی
کلامی کرتے ہوئے اسے درمیان میں ٹوکا۔

"نہیں جسمانی تھکاوٹ میرا کچھ نہیں بگاڑتی ۔ میرا تو سارا وجود ہی گھائل ہے" اس نے ایک طویل سانس کھینچی۔ اور ہاتھوں کی کنگھی سر کے پیچھے ڈال دی اور انگڑائی کے انداز میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی پہلو بدلا۔ "میں بہت مصروف رکھتا ہوں۔ بے شمار ایسے کام بھی کرتا ہوں جنہیں کرنے کو میرا دل ہرگز نہیں چاہتا۔ مگر بظاہر مصروفیت کے باوجو میں پہروں سڑکوں پر آوارہ پھرتا ہوں۔ جب مجھے خود پر بھٹکنے کا گمان ہوتا ہے تو پہروں بے
کے عالم میں، خالی الذہن ہو کر بستر پر لیٹا رہتا ہوں اور اپنے کمرے کی چھت پر لگی کڑیوں کا حساب جوڑ کر گن گن لیتا یہ فرار کا سب سے آسان اور قابل عمل طریقہ ہے۔ تب مجھے خود پر اس کچھوے کا گمان ہونے لگتا ہے جو اپنی گردن خول میں چھپا کر خود کو دنیا کی نظروں سے اوجھل کر لیتا ہے۔ مجھ پر پہروں یہ "خود نگری" کی کیفیت طاری رہتی ہے اپنی گردن اندر کئے اپنے اندر جھانکتا ہوں جہاں چاروں طرف بند دروازے میرا منہ چڑا رہے ہوتے ہیں۔ ہر راستہ تھوڑی تک میرے ساتھ چلتا ہے اور پھر گم ہو جاتا ہے۔ میری ساری زندگی ان گم شدہ راستوں کی تلاش میں گزری ہے میں
بھی ان راستوں کی تلاش میں ہوں اور جب کبھی میں نے یہ تلاش ختم کی ہے تب مجھے خود پر ایک سخت دھات کا ہونے لگتا ہے جو لوہے کی طرح مقناطیس کی طرف مسلسل کھنچتی جا رہی ہے اور کشش کا یہ سفر ختم ہونے میں نہیں
پتہ نہیں اس نے اپنے اندر کیسے کیسے مقناطیس ذخیرہ کر رکھے ہیں اور یہ اتنے طاقتور ہیں کہ کشش کے سفر کو ختم ؛

نہیں دیتے۔ میں اس کی طرف مسلسل کھینچتا جا رہا ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کشش کا یہ سفر صدیوں سے اسی طرح جاری و ساری ہے۔"

بولتے بولتے اس کی آواز دھیمی پڑ گئی اور چہرے کے کھنچاؤ میں بھی قدرے کمی واقع ہوئی۔ کافی دیر سے اس نے نیا سگریٹ نہیں سلگایا تھا۔ سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اس کے سامنے میز پر دھرے تھے۔ "بس تمہیں ایک بات بتاؤں؟" اس نے مجھ سے براہ راست مخاطب ہو کر کہا ! آدمی زندگی تو اپنی صفائیاں پیش کرتے ہوئے گزر جاتی ہے۔"

وہ بے ربط گفتگو کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا جسے اس نے فوراً ہونٹوں میں دبا لیا۔ میں نے لائٹر جلا کر اسے سگریٹ سلگانے میں مدد دی۔ اس نے ایک طویل کش لیا اور اپنی بات جاری رکھی "اور اپنی بات کی صفائی ہم اس وقت پیش کرتے ہیں جب ہم خود کو درست سمجھتے ہیں۔ کیا تم میری بات سے اتفاق کرتے ہو؟" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یقیناً" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اس نے تھکے ہوئے انداز میں اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹیک دیا۔ ادھ جلا سگریٹ اس کی انگلیوں میں دبا اسی کی طرح خاموشی سے سسک رہا تھا۔ اسے آج سگریٹ سے بھی رغبت نہ تھی۔ سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر اس نے آنکھیں بند کیں اور دونوں باروں آنکھوں پر رکھ دیئے۔ غالبا وہ سستانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی اپنی ٹانگیں میز کے نیچے پسار دیں۔ اب وہ قدرے پرسکون نظر آ رہا تھا اور اس کی اضطراری کیفیت میں کمی واقع ہو گئی تھی۔

"غالباً تم تھک گئے ہو کیا میں تمہارے لئے کافی بناؤں؟" اس نے ٹیک چھوڑتے ہوئے کہا، اور نیا سگریٹ سلگانے کے لئے لائٹر جلایا، خالی ڈبی میز کے نیچے پڑی باسکٹ میں ڈال دی۔ "وقتی طور پر تو شاید کافی اور سگریٹ اپنا کچھ نہ کچھ اثر چھوڑتی ہوں گی۔ مگر اندر موجود گہری ویرانی کو کون چھانٹے۔ ہم سب حالات کا شکار ہیں۔ ہم وہ کچھ نہیں کر پاتے جو کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی سوچا؟"

اس نے پھر مجھے مخاطب کیا "آج تم جو کچھ ہو کیا تم نے کبھی ایسا بننا چاہا تھا؟ چلو بالفرض مان لیتے ہیں کہ تم صحافی بننا چاہتے تھے۔ اور وہ تم بن بھی گئے ہو، مگر کیا سب حالات تمہارے موافق تھے یا جس طرح تم پڑھنا چاہتے تھے، جس طرح زندگی گزارنا چاہتے تھے، جس پائے کے صحافی بننا چاہتے تھے ویسے بن پائے؟ یقیناً تم میری بات سے اتفاق نہیں کرو گے"

اس کی گفتگو میں جوش اور شدت پیدا ہو رہی تھی۔ آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اس کے ہاتھ بھی گردش میں تھے۔ اس کا چہرہ بھرا بھرا اور سرخی مائل تھا۔ میں نے پہلی بار غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ تاریک سرخی مائل ڈورے قدرے براؤن پتلی کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر غالباً سب سے زیادہ بولتی ہوئی چیز اس کی آنکھیں ہی تھیں جو کبھی نیم وا اور کبھی پوری کھل جاتی تھیں۔

وہ پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں ہے۔ مکمل طور پر غیر حاضر۔ اس پر اکثر اس طرح کے دورے پڑتے تھے۔ وہ بالکل گم ہو جاتا تھا۔ گرد و پیش سے بے خبر۔ اپنے آپ سے بیگانہ۔ شاید وہ اس طریقے سے کچھ relax کرتا تھا۔ اس کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔

نئے پیکٹ سے سگریٹ نکالا اور اسے سلگاتے ہوئے بولا۔ "انسانی نفسیات بھی عجیب ہے، ہم ہر کام صرف اپنے مفاد خاطر کرتے ہیں۔ دوسرے کے مفاد کا تو انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہی مفاد پرستی اور نفسا نفسی انسان کو یکا و تنہا ۔ ہونے ہے۔ حتیٰ کہ موت میں بھی انسان کی خود غرضی کا پہلو ہی نمایاں رہتا ہے۔ مر کے انسان تو دنیاوی جھمیلوں سے آ ہو جاتا ہے مگر حقیقی معنوں میں اصل دکھ پیچھے رہ جانے والے اٹھاتے ہیں۔"

اداسی اس کے اردگرد ڈول رہی تھی اور پھر اس کی آنکھوں سے بہنے لگی۔ اس اداسی میں سینکڑوں سنسان ج اگ آئے۔ اس کے لہجے میں سناٹے بول رہے تھے۔ وہ اس درخت کی طرح اجاڑ نظر آ رہا تھا جس پر عرصہ دراز سے بارش ہوئی ہو، جو پانی کو ترسا ہوا ہو، اس میں زندگی تو موجود تھی مگر اکھڑی ہوئی بے سہارا۔

میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں" اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے اس اداسی، مایوسی ڈیپریشن کو چھانٹنے کی کئی ایک تدبیریں سوچی ہیں مگر یہ سوچ سے بھی زیادہ تیزی سے اپنا اثر دکھاتی ہے۔ سمندر کی و تیز لہر کی طرح یہ دل کے ساحل سے ٹکراتی ہے اور اپنے نمکین اور کڑوے پانی کی ایک تہہ پیچھے چھوڑتی ہوئی گزر ہے۔ مگر اسے کھرچنے میں زمانے لگتے ہیں۔"

اس نے اپنی ادھیڑ عمر آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ آنکھوں کے دونوں اطراف جھریوں کے بل کچھ اور سخت ہو ۔ تھے۔ تھکی ہوئی بوجھل آنکھیں جنہیں مزید استعمال کرنے کی خاطر، گوشوں کو سکیڑ کر بمشکل دیکھتے ہوئے وہ دور خلاؤں گھور رہا تھا۔ جیسے یہ آنکھیں موت تاک رہی ہوں۔ مگر بھلا موت تاکنے سے آتی ہے۔ موت بھی بے نیاز ہے اس کا ایک ا فلسفہ ہے۔

اس کی آنکھوں میں بے چینی امڈ آئی جو ناتمام خواہشات کا مظہر تھی۔ "کچھ خواہشات ناتمام ہی رہنی چاہئیں، کی عدم تکمیل ہی ان کے وجود کا باعث ہوتی ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

اس نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا، مگر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر، اگلے ہی لمحے وہ پھر ا اسی محبوب دنیا میں تھا جو اسے بیحد عزیز تھی۔ وہ میرے وجود سے آشنا ہوتے ہوئے بھی مجھ سے بیگانہ تھا۔ "شاید ان کا اسی میں ہے کہ یہ نامکمل اور ادھوری ہی رہیں۔ پھر مجھے کبھی کبھار ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک لامتناہی راستہ ۔ اور میں اس پر چلتا جا رہا ہوں۔ بغیر کسی رکاوٹ کے۔ اگرچہ میرے اندر ہچکچاہٹ، ڈر، خوف اور جھجھک موجود ہوتی ہے مجھے یہ راستہ بہرحال طے کرنا ہوتا ہے۔ اس کی منزل کیا ہے؟ اس سے غرض نہ رکھتے ہوئے، ہر اٹھنے والا قدم مجھے ک لے جا رہا ہے؟ کس زندگی کی طرف؟ کن دنیاؤں کی طرف؟ کہ اس کا لامتناہی پن ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ بظاہر مو اس راستے کا انت معلوم ہوتی ہے۔ مگر نہیں یہ تو صرف ٹریک بدلنے کا نام ہے۔ یقیناً موت کے بعد بھی یہ سفر ختم نہ ہو گا بلکہ انسان ٹریک بدل کر پھر کسی اور راستے پر چلنے لگے گا جدھر وہ راستہ جائے گا۔ ہماری کیا حیثیت ہے؟"

وہ خود کلامی کے انداز میں دھیرے سے بولا اور اپنے دونوں بازو میز پر ٹکا کر اپنے سر کو ان کے حصار میں د دیا۔

اس کے دھیمے لہجے کی گونج کمرے میں پھیل گئی۔ میرا ذہن اس کی باتوں میں کھو کر رہ گیا تھا۔ کچھ ا خاموشی کا گزرا۔ میرے پاس اس کے لئے تسلی کے لفظ بھی نہ تھے۔

"سنو" میں نے اسے مخاطب کرنے کے لئے میز پر پڑے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ایک یخ سنسناہٹ میر جسم میں دوڑ گئی۔ وہ ٹریک بدل کر اپنا سفر شروع کر چکا تھا۔

نگاری

نگہت سلیم

وہاں کے رہنے والوں نے ایسی باتیں صرف قصوں میں سنی تھیں۔ شاید پہلے کبھی ایسا ہوا ہو مگر کسی کو د نہ تھا۔ کھیت' کھلیان' پنگھٹ' مزار' برگد سب مہربہ لب تھے۔ ابھی فیصلہ ہونا تھا۔ سب کو انتظار تھا۔ بہت بجھ گزر چکا تھا۔ بہت کچھ گزرنا تھا۔ گمان کی آخری حد پہ کھڑی میراں نے وریام اور شمشاد کو پیغام بھجوایا "آ ے مل لیں۔"۔ مگر دونوں میں سے کوئی اب تک نہ آیا تھا۔ گلیوں' چوپالوں اور بیٹھکوں میں اسکا ناکردہ گناہ سی زنگولے کی مانند رقصاں تھا۔

ملنگ شاہو چوپال کے قریب بوڑھے برگد تلے ایک پردیسی مجذوب کے مزار پر دھمال ڈال رہا تھا۔

تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا

دیئے منڈیروں پر جلنے کو تھے کہ شمشاد آئی۔ چہرے پر عجب سی دمک۔ ہونٹوں پر غیر مرئی سم...... میراں تو سمجھی تھی اس کی سہیلی اسکے غم میں پیلی پڑ گئی ہو گی لیکن...... یہ رنگ بھی قدرت کا ب اسرار ہیں! وہ بولی "وریام گلی کے پچھواڑے ہے۔ تیرے لیے جانا مشکل ہو گا—— کچھ کہنا ہو تو بتا۔"

"ایک دفعہ ملنا چاہتی ہوں---" میراں اپنی گھٹی گھٹی آواز سن کر خود حیران رہ گئی۔ شمشاد کی نکھوں میں اڈے تمسخر نے کہا—— اب فائدہ؟—— لیکن وہ آگے کو چلی اور میراں پیچھے پیچھے۔

اسکی اونچی پگ کا طنطنہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ میراں کو لگا جیسے وریام اپنی سفید گھوڑی پر نیزے کا رخ کی جانب کرنے کو ہے۔ وہ اسکے قریب ٹھہر گئی اور شمشاد کچھ پیچھے——

وریام کی چپ اسکے دل میں انی کی طرح اترنے لگی۔ آخر وہ خود بولی۔

"فیصلہ جانے کیا ہو؟ لیکن سب جانتے ہیں میرے ساتھ ظلم ہوا ہے——"

وہ خاموش رہا۔

وہ پھر بولی...... "تو کیا کہتا ہے وریامے؟"

وہ اب بھی خاموش تھا۔ میراں نے دیکھا اسکی نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں اور چہرہ ٹھہرے پانی ں طرح—— وہ اپنی اونچی پگ سنبھالنے لگا۔ پھر کھنکھارتے ہوئے بولا۔ "کوئی اتنا زور آور نہیں ہو تاکہ ندر سے لڑ سکے۔"

"تو کیا——— تو میرا ساتھ......؟" وہ بھک منگی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"میں چاہتا تو ہوں کہ تیرا ساتھ نبھاؤں لیکن یہ لوگ!"

"بس کر دریا ے...... میں ہی غافل تھی۔ کوچ کی آواز نہ سن سکی۔ میرا پنوں تو دور نکل چکا ———"

بس اتنا کہہ کے وہ پلٹ گئی۔ خواب کی پھولوں بھری پوشاک لیر لیر ہو کے اڑنے لگی۔ فیصلے سے فیصلہ ہوا۔ شاید وہ کسی گمان میں تھی۔ مگر ہوائے دوستاں تو رخ بدل چکی تھی اور سناٹا ایسا کہ اپنی ہی آ نفس لرزا دے۔

کبھی کبھی کسی خانہ بدوش قافلے کا پڑاؤ ادھر ہوتا تو جیسے راتیں جاگ اٹھتیں۔ الاؤ کے درمیان قا کے ساتھ بستی والے بیٹھ جاتے اور ان سے دور دراز زمینوں کے قصے سنا کرتے۔

سرد راتوں میں کھلے آسمان کے نیچے جب آتش اپنا سحر جگائے تو آس پاس بیٹھے ہوؤں کی روحیں دو پل اپنے مکان سے باہر آجاتی ہیں۔ زمین و زماں سے ماورا، وریام اور میراں کی روحیں جب الاؤ کے رقصاں ہوتیں تو انہیں نہ شمشاد کا خاکستر چہرہ دکھائی دیتا اور نہ میراں کے بھائی سجاول اور خالہ زاد ریشم انجان رستے پر نگاہ جاتی۔ بستی والے ملنگ شاہو کے دھمال میں محو ہوتے۔ اسکی جوانی اور عالم سرشاری قافلے والے حیران ہو کے پوچھتے۔ "یہ ملنگ پیدائشی ایسا ہے یا بعد میں؟———"

"اللہ لوک ہے اللہ لوک۔" بستی کے بزرگ سوال کی کنجی دور پھینک دیتے——— اور قافلے سردار افریقہ کے مخصوص رقص کا ذکر چٹخارے لے کر سنانے لگتا کہ جب چودھویں کی رات کو اپنے دیو خوش کرنے کے لیے انسانی جان کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے تو شرط یہ ہوتی ہے کہ قربان کیا جانے والا غیر سے ہو——— میراں لرز جاتی اور شکر کرتی اسکی بستی میں ایسی کوئی رسم نہیں۔ جب خانہ بدوش عور صحرائی گیت الاپتیں جسکا مطلب کچھ یوں ہوتا کہ رات میں چمکنے والے تاروں کا بھید کوئی کوئی جانتا ہے، تو سوچ میں ڈوب جاتی——— اور کسی شام گھنے کھیتوں کے درمیان گزرتے ہوئے وریام سے پوچھتی "ہمار مقدر کے تارے ایک ہی سمت میں ہیں یا دور دور کھڑے ہیں۔"

وہ حیران ہوتا۔ ایسی باتیں وہ کیسے سوچ لیتی ہے۔ پھر ہنس دیتا۔ "کہیں تو انہی سوچوں میں نہ رہ اور میں———" وہ چونک اٹھتی اور اسے جملہ پورا نہ کرنے دیتی۔

وہ صبح بستی پر رات کی طرح طلوع ہوئی۔

سجاول اور [illegible] رات کے کسی پہر بستی چھوڑ گئے تھے۔ کھوجی بھی انکا نشان نہ پا سکے۔ قیامت قیامت کو جنم دیتی ہے۔ شام ابھی پوری طرح بجھنے نہ پائی تھی کہ ریشم کے خاندان کے مرد سجاول کے گھر آور ہوئے۔ وہ چار اسلحہ بردار مرد تھے۔ میراں کے بوڑھے ماں باپ انکے قدموں پر گر کر بیٹے کے گناہ

معافی مانگتے رہے لیکن گھڑ سوار بھائی کے جرم میں بہن کو آنگن سے گھسیٹ کر لے گئے۔ نہتے ہاتھ والوں میں ریام بھی تھا جسے اپنی نیزہ بازی پر، اپنی شجاعت پر بڑا مان تھا، لیکن آتشیں اسلحے کے آگے ڈٹ جانا کوئی معمولی ات نہ تھی۔ اس نے بین کرتے ہجوم میں خود کو چھپا لیا۔

بستی کا بھیم بھرم خاک ہو گیا تھا۔ میراں کی چیخیں، اسکے ماں باپ کی فریادیں، رات بھر بستی میں گونجتی رہیں ــــــ سب جاگتے رہے۔ میراں نہیں لوٹی۔ وریام کبھی بے چینی سے ریشم کی بستی کی جانب نکلتا، کبھی باہم مشورہ کرتے خمیدہ کمر بوڑھوں کی گن سن لیتا۔ بادام و سرس کی خوشبوئیں بھیس بدل کے جا چکی تھیں۔ سبز پگڈنڈیوں کے بیچ سے آتی میراں کی سرگوشیاں وریام کے آس پاس گھیرا ڈال رہی تھیں ــــــ چوپال کے بڑوں نے ریشم کے خاندان والوں سے رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی۔ تیسرے دن نیم بے ہوش میراں کھیتوں میں مل گئی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اسکی لاش ملتی لیکن اس کی سانس کی ڈوری نے اسکے ماں اپ اور وریام سمیت تمام بستی کو الجھا دیا۔

ہوش میں آنے کے بعد میراں کو سب سے پہلے وریام کا خیال آیا ــــــ اپنی ہمزاد شمشاد کا خیال آیا یکن جب وقت کے سدھے گھوڑے کی باگ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو مٹی میں رلنا ہی پڑتا ہے۔ منظر وہی تھے یکن بدل چکے تھے۔ لوگ وہی تھے مگر ان کے چہروں پر لکھی تحریریں اور تھیں۔ تین دن میں تو اس کے ماں اپ بھی عہد فراعنہ کی پتھریلی مورتیوں میں ڈھل چکے تھے۔ اب بستی میں کوئی تازہ کھدا گڑھا، کوئی اندھا کنواں ہی اسکا منتظر ہو سکتا تھا۔

رسوائی کے زہر کو مارنے کے لیے زہر مہرے کی ضرورت تھے اور زہر مہرہ بننا آسان تو نہیں۔

وریام نے اپنی کلف لگی پگ درست کی اور چوپال سے اٹھ آیا۔ بھلا اسکے ماں باپ اکلوتے چاند کا گہن کیسے برداشت کر سکتے تھے۔

دلوں کے بھید لمبے تھے اور وقت کا ہر کارہ چوٹ پر چوٹ لگا رہا تھا ــــــ بالآخر فیصلہ ہوا۔ کہنے کو تو سکے حق میں ہوا ــــــ کوئی تازہ گڑھا نہیں کھدا ــــــ کوئی اندھا کنواں نہیں بھرا۔ البتہ رسوائی کے زہر کو ارنے کے لیے ایک زہر مہرہ ہاتھ آگیا۔

ملنگ شاہو ــــــ بس وہی ایک زہر مہرہ تھا پوری بستی میں ــــــ وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ ہر ہر نفس پہ موت لکھنے کی بجائے ایک بار جج دھج سے موت کا انتظام کر دو۔ وہ لہولہان پاؤں لیے جلتے صحرا میں بھاگتی رہی۔ اسکا ستارہ وریام کے ستارے سے بہت دور تھا۔ پھر ایک مدار میں دونوں کیسے آتے۔ ا کا.. غم جو بستی الوں سے اوجھل تھا اسکے دل کے زانو پہ سر رکھے روتا رہا۔ روہی کے صحرا اور دور افتادہ ٹیلوں اور گہرے انیوں کی پراسراریت اسکے وجود میں اترتی چلی گئی۔ وہ ایسی مٹی کی مانند گھلنے لگی جسکے گھلنے کا علم پاس والی زمین کو بھی نہیں ہوتا۔

یہی ملنگ شاہو تھا جسکے لیے وہ وریامے سے کہتی تھی۔ "اس بیچارے کو تو پتہ ہی نہیں کہ انسان کے یب میں مزار کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے۔"

دھمال ڈالتے ڈالتے اچانک وہ چونک اٹھتا اور میراں کے قریب آکے راز داری سے بس ا
——"تاروں سے انکا بھید لے لو۔"

پھر ایک دن وہ بھی ہوا جسکا ہونا باقی تھا۔

پوری بستی زنگاری ہوگئی!

ہوائے چرخ کچھ اس رخ پہ چلی کہ گلیاں اور چوبارے نیلے تھوتھے میں نہا گئے۔ وہ بستی وا پہلے دن اسکے دکھ میں روئے تھے مگر اسکے آنے کے بعد انہوں نے اپنے چہروں پر بیگانگی کی تختیاں لٹکا لی لمب اپنے دلوں پر جمے زنگ کو انہوں نے اپنے چہروں پر مل لیا تھا۔ زنگاری چہرے والوں کی بارات ڈ باجوں کی گونج میں بڑھتی آرہی تھی——

بارات کا دولہا سفید گھوڑی پر اونچی پگ لیے وریام تھا۔ اسکے ساتھ والی گھوڑی دلہن شمشا تھی۔ جسکے پھولوں اور مہندی کی مہک سبز پگڈنڈیوں تک پھیل گئی تھی۔ وریام نے گھڑی دو گھڑی میرا دیکھا جو غم کی سیاہ بدلی میں گہنائی ہوئی تھی اور سر پر پرانی پھٹی اوڑھنی ڈالے میلے ننگے پاؤں سے مزار وا برگد کے نیچے بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے زنگاری چہروں کو دیکھ رہی تھی۔

باراتی رقصاں تھے۔ افریقہ کے جنگلی قبیلے مالایا کا سوبوہا رقص جاری تھا۔ بھینٹ کے لیے ان نے میراں کو منتخب کیا تھا۔ اپنی ہی بستی کے انسان کو——اس ظالمانہ رقص میں ملنگ شاہو بھی شامل تھا۔

یکایک ڈھول باجوں کی آواز گھٹنے کی بجائے بڑھنے لگی۔ اتنا بڑھی اتنا بڑھی کہ میراں کو کھیتوں۔ سبز پگڈنڈیوں سے، گلیوں، چوباروں، پنگھٹ سے، اور پھر خود اپنے اندر سے ڈھول بجنے کی آواز سنائی د لگی۔ قیامت اٹھاتی یہ آواز اسکی روح کے تاروں سے الجھ گئی۔ وہ سحر زدہ سی اٹھی اور دھمال ڈالتے م شاہو کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ پل دو پل اسے تکتی رہی۔ پھر اسی کی طرح دھمال ڈالنے لگی اور بیخود ہو باراتیوں کے رقص میں شامل ہوگئی۔

غزل اور نظم کی بھرپور شاعرہ
ریحانہ روحی کا مجموعۂ کلام
عشق زاد
بہت جلد منظر عام پر آرہا ہے

واھا

احمد ندیم قاسمی

میں نے بکریاں چراتے چراتے آدھی صدی گزار دی ہے۔ میں نے کبھی چھٹی نہیں کی۔ عید کی نماز
، کر بھی ریوڑ کو ہانکا ہے اور جنگل کی طرف نکل گیا ہوں۔ میں سوچتا ہوں گاؤں بھر میں بکریوں کے مالک
ف اس لیے صبح سویرے اپنی بکریاں میرے باڑے میں چھوڑ جاتے ہیں کہ یہ دن بھر چریں گی تو شام کو
ھ سے بھرے ہوئے تھن لے کر واپس آئیں گی۔ بکریوں کو ہر روز چرنے لے جانے کی ایک اور وجہ بھی
۔ میں اپنی نوری بیٹی کو شان سے رخصت کرنے کے لیے جہیز کی رقم جمع کر رہا ہوں۔ ویسے تو میں بہت سادہ
آدمی ہوں اور میں تو اپنی بیٹی کو سادگی ہی سے رخصت کر دیتا اگر بیگے نے مجھے طعنہ نہ دیا ہوتا۔ اس نے کہا
کہ تمھارا ریوڑ میرے ریوڑ سے بڑا سہی پر جس شان سے میں نے اپنی بیٹی کو رخصت کیا ہے، اسی شان سے
اپنی بیٹی کو رخصت کرنے کی کوشش کرو گے تو خون تھوکنے لگو گے۔ میں جانتا ہوں بیگا اس جھوٹی شان کی
میں مقروض ہو گیا ہے، اور اب اس کی باقی زندگی یہ قرضے اتارنے میں گزرے گی، پر اس نے بھری
ال میں میری غیرت کو للکارا تھا، اس لیے میں روکھی سوکھی کھا کر، حلال کی اتنی کمائی جمع کر رہا ہوں کہ اتنی تو
ے نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہو گی۔ میں بھلا کیسے ناغہ کر سکتا ہوں۔

بکریاں غریب لوگ پالتے ہیں۔ امیروں کے ہاں تو گائیں، بھینسیں ہوتی ہیں۔ انھیں تو اگر بکری سے
ئی دلچسپی ہے تو صرف اس لیے کہ اس کا گوشت مزیدار ہوتا ہے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے کہ بکریاں دودھ
دیتی ہیں اور یہ دودھ غریبوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ پھر بکری کی مینگنیاں اگر خشک کر کے
لے میں جلائی جائیں تو لکڑی سے بھی زیادہ روشن روشن جلتی ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس گاؤں کی
ں بھی بیوائیں ہیں ان کے ہاں ایک ایک بکری ہوتی ہے۔ وہ بڑی مشکل سے اس بکری کی چرائی دے پاتی
۔ میں جب ہر مہینے ان سے بکری کی چرائی لیتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میں ان کا گلا گھونٹ رہا ہوں۔ پر کیا
وں۔ مجبور ہوں۔ میں اگر ان سے چرائی نہ لوں تو میری اولاد کیا چرے اور نوری کا جہیز کیسی بنے۔ اس
ائی کا ایک حصہ جنگل کے داروغے کو بھی دینا ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے چرائی لیتا ہے اور یہ چرائی سرکار کو چلی
ی ہے۔ یہ اس کی بھی مجبوری ہے۔

آج سے چند سال پہلے جب میں شام کو جنگل سے واپس آتا تھا تو میری اولاد بکریوں کے میمنوں کی

طرح "میں ——— میں ———" پکارتی ہوئی میرے آس پاس جمع ہو جاتی تھی۔ میں انھیں جنگل سے توڑ کر لائے ہوئے بیر اور کنگیر اور تھمٹیر مٹھی مٹھی بھر دیتا تھا تو ان کی تو عید ہو جاتی تھی۔ پھر جب نوری بیٹی انھیں بکریوں کا دودھ پلاتی تھی تو انھیں تو جیسے اس دودھ کا نشہ سا ہو جاتا تھا۔ وہ یوں پھیل پھیل کر سوتے تھے جیسے اپنے اپنے کھٹولے کے بادشاہ ہیں۔

نوری میری بیٹی ہے۔ میری بیوی تو آخری بیٹے میراں بخش کو جنم دیتے ہی چل بسی تھی بے چاری۔ نوری میرے بڑے بیٹے خدا بخش سے دو سال چھوٹی ہے۔ خدا بخش مدرسے میں منشی ہے اور اپنی بہن کے جہیز کی رقم جمع کرنے میں میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔

جس روز میری بیوی اگلے جہان کو سدھاری، اس روز مجھ سے ناغہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ میں اپ دکھ میں بکریوں والوں کا دکھ بھی بھوگتا رہا کہ گھروں آنگنوں میں بندھی ہوئی یہ بکریاں ممیا ممیا کر کیا کیا قیامتیں نہیں ڈھا رہی ہوں گی۔ اسی لیے جب میں بیوی کو دفنا چکا تو ریوڑ کو جمع کر کے جنگل میں چھوڑ آیا۔ فاتحہ ک چٹائی بعد میں آ کر بچھائی۔

میں ہر روز صبح سویرے نماز پڑھنے مسجد ضرور جاتا ہوں۔ مجھے فجر کی نماز پڑھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اگر میں یہ نماز نہ پڑھوں تو دن بھر بے چین رہتا ہوں۔ میں اس نماز میں اپنے خدا سے ملاقات کرتا ہوں۔ بع میں جب بکریاں میرے چار طرف چر رہی ہوتی ہیں تو میں اپنے خدا سے دعائیں مانگتا ہوں۔ اور خدا میری د ضرور قبول کرتا ہے۔ پندرہ سولہ سال پہلے میں نے اپنی نوری بیٹی کے لیے پروردگار سے دعا کی تھی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ربا! میری نوری اتنے تیز تاپ جوگی نہیں ہے۔ وہ تو لڑھک جائے گی۔ پروردگار نے میری س لی اور نوری دوسرے ہی دن کلکاریاں مارنے لگی۔ میں اس نوری کی بات کر رہا ہوں جو اس وقت میرے لیے جھاری میں پانی بھر رہی ہے اور روٹیوں میں گڑ اور پیاز اور اچار رکھ رہی ہے۔ وہ اپنے گھر کی ہو گئی تو میں آدھا رہ جاؤں گا۔ پر میں فجر کی نماز کے بعد خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ میں اسے اتنی شان سے رخصت کروں کہ بیگا اور اس کے ساتھ سارا گاؤں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہ جائے کہ ایک چرواہا اپنی بیٹی کو بادشا زادیوں کا سا جہیز کیسے دے رہا ہے۔

میں نے بیٹے خدا بخش کے لیے بھی پروردگار سے دعائیں مانگی ہیں۔ وہ میری دعا کی برکت سے پہل سے دوسری جماعت میں اور دوسری سے تیسری جماعت میں جا بیٹھتا ہے۔ میں اس کے لیے پٹواری بننے کی د مانگتا ہوں پر وہ تو دسویں جماعت پاس کر کے مدرسے میں منشی لگ گیا ہے۔ چلو ایک ہی بات ہے۔ لوگ پٹوار سے جتنا ڈرتے ہیں، منشی سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں۔ ایک ہی بات ہے۔

نماز پڑھ کر جب میں مسجد سے گھر واپس آتا ہوں تو ایک ایسے گھروندے کے دروازے کے پاس سے بھی گزرتا ہوں جہاں کوئی بیس بائیس سال پہلے مہراں رہتی تھی۔ وہ بیاہ کر کسی دوسرے علاقے میں چلی گئ ہے۔ پر جب میں یہاں سے گزرتا ہوں تو وہ مجھے اپنے گھروندے کے دروازے میں کھڑی نظر آ جاتی ہے۔ مم حیران ہوں۔ میں تو ادھیڑ ہو رہا ہوں، پر مہراں مجھے جوان ہی نظر آتی ہے۔ اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں، ا

کے آنسو ——— سب کچھ چمک رہا ہوتا ہے اور میں اس چکاچوند میں لپٹا ہوا اس دروازے کے پاس سے گزر جاتا ہوں۔ یہاں سے گزرتے ہوئے میں نے ایک بار اس سے کہا تھا کہ مہراں! میں تیرے بغیر مرجاؤں گا۔ اور اس نے کہا تھا کہ وارے! میں بھی تیرے بغیر مرجاؤں گی۔ اب میں جیتا جاگتا آدمی بکریاں چراتا پھرتا ہوں اور ——— اور وہ جانے کیا کر رہی ہو گی بے چاری۔ اس کے بیاہ سے دو تین دن پہلے جب وہ میرے انتظار میں، دروازے پر کھڑی تھی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے پلک پلک بھری ہوئی تھیں تو اس وقت گلی کو خالی پا کر میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور چوم لیا۔ وہ ہاتھ اتنا ٹھنڈا ——— اتنا یخ تھا کہ مجھے اپنا اور مہراں کا بچپن یاد آگیا۔

ہم دونوں چھ چھ سات سات سال کے ہوں گے۔ ہم دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے جب موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ساتھ ہی اولے بھی گرنے لگے۔ اولے برسانے والے بادل بہت گرجتے ہیں اور بجلیاں کڑکاتے ہیں۔ پر مہراں ایک ہی نڈر تھی۔ سب بچے ادھر ادھر پناہ لینے بھاگے پر مہراں اولے چنتی رہی اور دونوں مٹھیاں بھر کے میرے پاس یوں خوش خوش آئی جیسے موتی چن لائی ہو۔ میں نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر اس کے ہاتھوں کو جھٹکا دیا اور کہا کہ یہ اولے گرا دے۔ اس نے مٹھیاں کھول دیں اور میں نے اس کے ہاتھ چھوئے تو وہ یخ ہو رہے تھے۔ تب میں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبا دبا کر گرم کیا تھا اور کہا تھا کہ میرا بابا کہتا تھا، اتنے یخ تو مرجانے والے ہوتے ہیں۔ میرے منہ سے یہ کیسی گندی بات نکل گئی تھی۔ اللہ کرے وہ اپنے گھر میں زندہ سلامت بیٹھی ہو۔ بیاہ سے دو تین دن پہلے بھی اس کے ہاتھ ایسے ہی یخ تھے مگر میں انھیں اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم نہ کر سکا۔ ریوڑ آگے نکل گیا تھا اور لوگ آنے جانے لگے تھے اور ہاتھوں کو گرم کرنے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔

ب میرے پاس اتنا روپیہ جمع ہو گیا جو بیگے نے خواب میں بھی نہیں دیکھا ہو گا تو میں نے اپنے دل یں طے کیا کہ اب نوری بیٹی کو رخصت کرنے کا وقت آگیا ہے، سو چپکے سے تیاری کر لینی چاہیے۔ میں نے دا بخش بیٹے کو بھی نہ بتایا کہ وہ مجھے گھر میں بٹھا کر خود جہیز کا سامان خریدنے چلا جائے گا اور بچتیں کرتا پھرے گا۔ میرا ارادہ آدھا لاکھ روپیہ لٹا دینے کا تھا۔ سو ایک روز میں نے کوئی پینتیس ہزار روپے اپنی ٹیک میں ڑس لیے۔ پندرہ ہزار برات کی دعوت کے لیے رہنے دیے۔ مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے کے بعد میں نے اپنے وست خان محمد کی منت کی کہ وہ دو تین دن تک میرے ریوڑ کی دیکھ بھال کرے اور میرے جانے کے بعد ہی بخش وغیرہ کو بتائے کہ میں ایک ضروری کام سے کہیں جا رہا ہوں۔ خان محمد میرا پرانا دوست ہے۔ مان یا۔ میں بسم اللہ پڑھ کر گاؤں سے نکلا۔ میں زندگی میں پہلی بار اپنی گاؤں سے باہر جا رہا تھا۔ مجھے تو عمر بھر ہر وز گھر سے جنگل اور جنگل سے گھر کا سفر درپیش رہا۔ جنگل سے واپسی پر ہر روز کی طرح مجھے مہراں اپنے روازے میں کھڑی نظر آتی رہی مگر وہی مشکل۔ وہ جوان کی جوان اور میں ادھیڑ عمر کا بوڑھا!

یہاں سے کئی کوس دور ایک قصبہ رویل ہے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ اس قصبے کی دکانیں سونے اندی کے زیوروں، ریشم کے کپڑوں اور پلنگوں کے رنگین پایوں سے بھری رہتی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ

پرانے زمانے میں بادشاہ اپنی شاہزادیوں کے بیاہ پر پلنگوں کے رنگین پائے رویل ہی کے کاریگروں سے بنوا تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ رویل میں جتنا بھی سامان خریدو، وہاں کے دکاندار سارا سامان خچروں ا گدھوں پر لاد کر، جہاں لے جانا ہو وہاں پہنچا دیتے ہیں۔ اللہ کا نام لے کر میں رویل کا راستہ پوچھتا چل پڑا۔

دوپہر کو میں ایک چھوٹے سے گاؤں کی ایک گلی میں سے گزر رہا تھا جب سامنے سے آتی ہوئی اد عمر کی ایک عورت میرے سامنے رک کر مجھے پاگلوں کی طرح گھورنے لگی۔ اس کے ہاتھ اور ہونٹ کانپے۔ اور وہ بولی۔ ”یہ کہیں تم تو نہیں ہو دارے؟“

میں نے آواز کی کھنک سے اسے پہچانا۔ وہ مہراں تھی۔ چہرے پر مٹی اڑ رہی تھی اور آنکھوں شام اتر رہی تھی۔ ”مہراں!“ میں نے کہا۔ ”یہ تم ہو مہراں؟ کیا یہ سچ مچ تم ہو؟“

گلی خالی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا تو وہ اتنا ٹھنڈا تھا جیسے اس نے ابھی ابھی مٹھی میں سے او گرائے ہیں۔ اتنا یخ تو مرجانے والوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ پر وہ تو زندہ سلامت میرے پاس کھڑی رو رہی تھی۔

وہ مجھے اپنے گھر میں لے آئی۔ مجھے ایک چارپائی پر بٹھا کر خود میرے سامنے زمین پر بیٹھ گئی اور روئی، اتنا روئی جیسے وہ ساری کی ساری آنسو بن کر بہہ جائے گی۔

میں اسے کیسے روکتا کہ آنسو تو میرے آنکھوں سے بھی بہہ رہے تھے۔ ہم دونوں کچھ دیر یونہی چ چاپ بیٹھے، آنسوؤں کی زبان میں باتیں کرتے رہے۔ پھر ایک جوان لڑکی سر پر دو گھڑے رکھے آئی تو ہم اس حالت میں دیکھ کر، ٹھٹھک کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ مہراں نے اٹھ کر اس کے سر پر سے اوپر کا گھڑا ا تو دوسرا گھڑا اس نے خود اتار کر رکھ دیا اور پھر اسی طرح ششدر مجھے دیکھنے لگی۔ تب مہراں بولی۔ ” میری بیٹی مریاں ہے دارے۔ بس یہی ایک میری بیٹی ہے۔ اس کا باپ سدھار چکا ہے۔ چرس پی پی کر ا افیون کھا کھا کر اس نے اپنا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹا اور چل دیا۔ میں گاؤں کے اکا دکا کھاتے پیتے گھروں محنت مزدوری کر کے بیٹی کا اور اپنا پیٹ پال رہی ہوں۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دے دارے۔“

میں نے مریاں کی طرف دیکھا تو یکایک وہ دروازے میں کھڑی مہراں بن گئی۔ ہو بہو مہراں۔ پھر نے اپنا سر جھٹکا۔ مریاں کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا تو مہراں بولی۔ ” جا بیٹی اندر جا کر بیٹھ۔ مجھے دار سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

لڑکی اندر چلی گئی تو مہراں نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنے چہرے کے آنسو پونچھے اور بولی۔ ”میں تم سے کہا تھا دارے کہ میں تیرے بغیر مر جاؤں گی۔ پر میں بے حیا تو زندہ ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”مہراں میں نے بھی تو تم سے یہی کہا تھا اور میں بھی تو تیرے بغیر بے شرمی سے ز ہوں۔ بعض انسان یوں زندہ رہتے ہیں جیسے عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہوں۔ ہم دونوں عمر قید کاٹ رہے مہراں۔“

مہراں بولی۔ ”تم تو اب بھی اچھے خاصے جوان لگ رہے ہو۔ مونچھوں میں چند سفید بال آگئے تو ہوا۔ تمہارا چہرہ تو بھرے جوان کا چہرہ ہے۔ اب ذرا ادھر میری طرف دیکھو۔ ہڈیوں پر کھال منڈھی رہ گئی۔

اور بس۔ نشی گھر والے نے میری آدھی صحت کا بیڑا غرق کیا اور باقی آدھی اس فکر نے کھا لی کہ میں اپنی اکلوتی بیٹی کو خالی ہاتھ کیسے رخصت کروں۔ شکل صورت کی اچھی ہے اس لیے ایک جگہ اس کی منگنی تو کر دی ہے پر اب لڑکے والے کہتے ہیں کہ زیور اور کپڑے اور تواپرات کے بغیر اگر ہم لڑکی بیاہ لائے تو شریک کہیں گے کہ کہیں سے بھکارن اٹھا لائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں لگ بھگ بیس ہزار کا جہیز ہونا چاہیے اور مجھ بد بخت کے پاس تو بیس روپے بھی نہیں۔ سو دیکھنا دارے۔ یہ لڑکی چند سال میں مجھ سے زیادہ بوڑھی ہو جائے گی۔ بس اس روگ نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔"

وہ جیسے مجھے بولنے کا موقع دینے کے لیے چپ ہوئی۔ میں کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ وہ چونک کر بولی۔ "تم کہیں میرے رونے سے تو نہیں گھبرا گئے دارے؟ پر ابھی تو میں آدھا بھی نہیں روئی جتنا مجھے تمہارے سامنے رونا چاہیے تھا۔" پھر وہ کچھ رک کر بولی۔ "اور مجھ بد بخت نے تم سے لسی پانی کا بھی نہیں پوچھا۔ اپنا ہی رونا لے کر بیٹھ گئی۔" پھر وہ پکاری۔ "اے مریاں۔ ادھر آ بیٹی۔ میری بات سن۔"

اور جب تک مریاں باہر آتی، میں فیصلہ کر چکا تھا۔ اس فیصلے سے مجھے ایسا لطف آیا جیسے میں نے ایک بار پھر صبح کی نماز پڑھ لی ہے۔ جیسے پروردگار نے میری ساری نمازیں قبول کر لی ہیں۔ میں نے ایک ایسا جھوٹ بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس پر کتنے ہی سچ قربان کیے جا سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ کر کے میں اتنا خوش، اتنا ہلکا پھلکا ہو گیا تھا کہ مسکرانے لگا۔

مہراں میری مسکراہٹ دیکھ کر چونکی۔ "کیوں دارے؟" اس نے حیران ہو کر سرگوشی سی کی۔ "کیا بات ہے؟"

مریاں آ چکی تھی۔ میں نے اسے اپنے قریب بٹھا کر کہا۔ "مہراں۔ تم سمجھتی ہو میں تمہارے حال سے بے خبر رہا؟ میں تو اپنے گاؤں میں بیٹھا اور اپنے ریوڑ کے پیچھے چلتا، تم پر سے گزرتی ہوئی ایک ایک آفت کو دیکھتا رہا ہوں اور سوچتا رہا ہوں کہ کاش میں تمہارے کسی کام آ سکتا۔ پر میں کرتا بھی کیا۔ عورت مرد کا رشتہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ میں نے سوچا کہیں میں تمہاری زندگی کی بربادی کا سبب نہ بن جاؤں۔ اسی لیے دور دور سے دیکھتا اور سنتا اور پوچھتا رہا۔ مجھے معلوم تھا۔ تم ایک لڑکی کی ماں ہو اور تمہارا گھر والا نشہ کرتے کرتے مر چکا ہے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ تم نے مریاں کی منگنی کر دی ہے پر غریبی نے تمہارے پاؤں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں۔ اسی لیے تم ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتیں۔"

پھر میں نے سچ بولنا شروع کیا۔ "دیکھو مہراں۔ مریاں تمہاری بیٹی ہے تو میری بیٹی بھی تو ہے۔ اور میری نوری میری بیٹی ہے تو تمہاری بیٹی بھی تو ہے۔ اور مریاں دو چار سال بڑی ہے نوری سے، اس لیے مجھ پر پہلا حق تو مریاں بیٹی کا ہوا نا۔ کیوں مریاں بیٹی؟"

اور مریاں میرے قریب بیٹھی تنکے سے مٹی کریدتی رہی۔

مہراں پھر سے رونے لگی تھی۔ بولی۔ "میں سمجھی تھی کہ تم نے میری کوئی سار نہ لی اور تم بھی عام مردوں کے سے مرد نکلے۔ ہائے میں بد بخت تمہارے خلاف کیسی کیسی باتیں سوچتی رہی۔"

میں نے اطمینان سے ٹیک کھولی اور نوٹوں کی تھبی مہراں کی طرف بڑھا دی۔ "یہ پینتیس روپے ہیں۔ پچیس ہزار میری مریاں بیٹی کے جہیز کے اور دس ہزار برات کی دعوت کے۔"

مہراں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ہائے دارے۔ تم یہ کیا کر رہے ہو؟ اپنی بیٹی کا حق میری ـــــــ"

"تو کیا تمہاری بیٹی میری بیٹی نہیں ہے؟" میں نے مہراں کا یخ ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسے نو تھبی تھما دی۔ ساتھ ہی میں نے کہا۔ "دیکھو مہراں ــــــ میں تو نقد سودا کر رہا ہوں۔"

"نقد سودا؟" مہراں کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ "نقد سودا کیسے؟"

"سنو۔" میں نے کہا۔ "مریاں کا باپ نہیں ہے نا؟ تو یہ تمہارے سامنے کون بیٹھا ہے؟ یہ مریاں کا باپ ہے۔" اور میں نے بازو پھیلا کر مریاں کو اپنے ساتھ لگا لیا۔۔ "اور وہاں گاؤں میں نوری نہیں ہے نا؟ تو مہراں۔۔ تمہاری صورت میں اسے ماں مل گئی ہے۔ یہ نقد سودا نہیں ہے تو کیا ہے۔!"

گلزار

جتنا بڑا شاعر ہے اتنا بڑا افسانہ نگار ہے

دستخط

گلزار کے تیس بے مثال افسانوں کا مجموعہ

شائع ہو گیا ہے

معیاری طباعت بلیغ سرورق

قیمت : ۱۶۰ روپے

اساطیر پبلشرز ۴۵ اے مزنگ روڈ۔ لاہور

یگانگت کی قوس قزح

مشکور حسین یاد

اب کیا عرض کروں کسی کو اپنا بنانے کا مسئلہ میرے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ ہاں میرے لیے یہ بات اس وقت مسئلے کی صورت اختیار کر سکتی ہے جب میں کسی کو غیر سمجھتا ہوں۔ میں تو اس بھری پری دنیا میں کسی کو غیر ہی نہیں سمجھتا اور پھر میرا یہ سمجھنا محض کوئی خیالی بات نہیں ہے۔ میں اپنی اس سمجھ کے دفاع میں کہنے کے لیے بہت سے ٹھوس دلائل رکھتا ہوں۔ مثال کے طور پر میری پہلی دلیل تو اس ضمن میں یہ ہے کہ جب ہر شخص میری طرح کے آنکھ ناک ہاتھ پاؤں وغیرہ رکھتا ہے تو مجھے کسی کو غیر سمجھنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے کسی کو اپنا سمجھنے کے لیے پہلی ٹھوس بات تو یہی نظر آتی ہے کہ میرے دوسرے ابنائے جنس میری طرح ہی کے مخلوق ہیں۔ پھر میں ان کو اپنا کیوں نہ سمجھوں۔ کیا اپنا سمجھنے کے لیے آدمی کا ڈھانچہ بدلنا پڑتا ہے۔ کیا اپنایت ایک طرح کا ہونے کو نہیں کہتے یا نہیں کہہ سکتے۔ سب لوگوں کے پیکر ایک ایسے ہیں یا سب لوگوں کے پیکر کا ایک ایسا ہونا ہی جب مجھے اپنایت کا بھرپور احساس دلاتا ہو تو میں خواہ مخواہ کسی کو غیر کیوں سمجھوں۔ لہٰذا جب کوئی واقف یا ناواقف میرے پاس ملنے کے لیے آتا ہے تو میں اسے سینے سے لگانے میں یا اس سے بغلگیر ہونے میں ذرا بھی تامل سے کام نہیں لیتا۔ مجھے ہر نارمل شخص قابل قرب نظر آتا ہے یعنی ایسا پیارا نظر آتا ہے کہ میں اسے سینے سے لگائے بغیر نہیں رہ سکتا الا یہ کہ کوئی خاص صورت حال مانع نہ ہو۔ مجھے اپنی اس حرکت پر دوستوں عزیزوں اور رشتہ داروں کے بہت سے طعنے بھی سننے پڑتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں میں ایسا کسی حکمت عملی یا چالاکی کے تحت کرتا ہوں۔ یعنی میں بہت دور اندیش واقع ہوا ہوں کہ سمجھتا ہوں اس دنیا میں ہر شخص سے کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی کام تو پڑ سکتا ہے اس لیے اسے پہلی ملاقات ہی میں اپنا بنا لو تاکہ وہ بوقت ضرور کام آسکے۔ مجھے اس حقیقت کو ماننے میں کوئی باک نہیں ہے کہ آدمی کو آدمی سے کام تو پڑ سکتا ہے اور پڑتا ہے لیکن خدا شاہد ہے جب میں کسی کو اپنا ایسا انسان سمجھ کر گلے سے لگاتا ہوں تو اس وقت میرے ذہن میں دور دور تک بھی اس طرح کے مطلب کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ البتہ میرے ذہن میں غالباً یہ بات ضرور ہوتی ہے جسے آپ شعوری یا لاشعوری بھی نہیں کہہ سکتے بس وہ میرے ذہن میں ہوتی ہے یعنی جب میں کسی دوسرے شخص کو دیکھتا ہوں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ میں اس دنیا میں تنہا نہیں ہوں۔ میرے ایسا دوسرا بھی کوئی موجود ہے۔ اس سے مجھ میں فوراً اپنایت کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ مجھے اپنے میں اور اس دوسرے شخص میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

آپ یہاں یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ میں نے جو ابھی ابھی دوستوں عزیزوں اور رشتے داروں کا ذکر کیا ہے کیا اپنایت دوستی عزیزداری اور رشتہ داری سے کوئی الگ چیز ہوتی ہے؟ کیا دوست، عزیز اور رشتہ دار اپنے نہیں ہوتے؟ دوست، عزیز اور رشتہ دار یقیناً اپنے ہوتے ہیں لیکن اپنایت، دوستی عزیز داری اور رشتہ داری سے آگے کی چیز ہے۔ ضروری نہیں کہ جو شخص آپ کا دوست ہے وہ آپ کا اپنا بھی ہو۔ اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں جو آپ کا عزیز یا رشتہ دار ہے وہ آپ کا اپنا کہلانے کا بھی مستحق ہو۔ دوستی اور عزیز داری وغیرہ محدود چیزیں نہیں۔ آپ ہر کسی کو دوست نہیں بنا سکتے۔ ہر کوئی آپ کا عزیز یا رشتہ دار نہیں ہو سکتا۔ لیکن آپ ہر شخص کو اپنا سمجھ سکتے ہیں اور ہر شخص آپ کو اپنا بنا سکتا ہے۔ بلکہ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بس آپ کے سمجھنے کی دیر ہے ہر شخص آپ کا اپنا تو پہلے ہی سے ہے۔ جیسا کہ میں سطور بالا میں عرض کر چکا ہوں ہر شخص اپنایت تو اپنے وجود کے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے---- ممکن ہے آپ فرمائیں "پھر تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنایت ایک بہت ہی سطحی چیز ہے۔" ____ جی ہاں یہی تو میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اپنایت بہت سطحی چیز ضرور ہے لیکن جتنی یہ سطحی ہے اس سے کہیں زیادہ گہری بھی ہے، مگر میں سمجھتا ہوں سطحی ہونا جس وسیلے سے اس دنیا میں سب سے بڑھ کر گہرا ہوتا ہے وہ انسان کا چہرہ ہی ہے۔ انسان کی ذات یعنی اس کا باطن اپنی جگہ جو کچھ ہے سو ہے لیکن انسان کے خدوخال کا بھی اس کائنات میں ابھی تک کوئی جواب دریافت نہیں ہو سکا۔ کیونکہ تاحال دنیا کی کسی چیز کی سطح اتنی دلکش اور اپنے باطن کے راز فاش کرنے والی ثابت نہیں ہو سکی جتنی کہ انسان کے نقش نگار کی سطح ہے۔ ہم ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیں تو ہمیں ہر آدمی میں کیا کچھ نظر نہیں آتا۔ بہرحال مجھے تو جس قدر اپنایت کا شدید احساس کسی دوسرے شخص کے خال و خد کو دیکھ کر ہوتا ہے اس قدر شدید احساس کسی دوسری چیز کو دیکھ کر نہیں ہوتا۔ دنیا کی دوسری چیزوں سے بھی اپنایت کا احساس ابھرتا ہے لیکن آدمی کے ظاہر کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یعنی آدمی کا ظاہر اپنے میں کچھ کم کشش اور اپنایت نہیں رکھتا۔ ممکن ہے آپ یہاں یہ فرمائیں کہ صاحب یہ تو بڑی عام اور معمولی سی بات ہے۔ وہ جو فارسی کا ایک مشہور شعر ہے۔ کند ہم جنس باہم جنس پرواز-- کبوتر با کبوتر باز با باز-- بس انسان کے ظاہر کو اتنی سی بات سمجھئے۔ جی ہاں میں بھی یہ عرض کر رہا ہوں کہ ایک ہم جنس ہم جنس کو دیکھ کر اپنایت کا اسقدر شدید احساس کرتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ اسی وقت پرواز کرنا اور اڑنا شروع کر دیتا ہے۔ مگر کیا یہ کوئی کم بات ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو دیکھ کر اڑنا شروع کر دے یعنی بلند ہو جائے۔ محبت بھرے انداز میں اس کا ساتھ دے۔ اپنی رفاقت کا ثبوت پیش کرے--- مجھے تو شکایت ہی یہ ہے کہ کبوتر تو کبوتر کو دیکھ کر اڑنا شروع کر دیتا ہے پھر آدمی کو دیکھ کر آدمی اڑنا شروع کیوں نہ کرے۔ چنانچہ آپ مجھے ہزار کبوتر یا باز ہونے کا طعنہ دیتے رہیں میرے لیے تو ایک آدمی میں اس کا آدمی ہونا اسقدر پیارا لگتا ہے کہ میں اسے اپنے سینے سے لگائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میرے دوست احباب سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسی احساس یگانگت کے تحت میں بجلی کے کوندے کی طرح اپنے دل کی ہر بات بتانے کے لیے ہر وقت کمربستہ اور حاضر رہتا ہوں۔ میرا کوئی راز راز نہیں ہے بلکہ سرے سے میرا کوئی راز ہی نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیجئے کہ میں کسی راز کو راز رکھنا

نہیں جانتا۔ یقیناً میں ایسی باتوں کو عام کرنے کا قائل نہیں ہوں جن سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ لیکن ایسے رازوں کا افشا ہونا بہت ضروری سمجھتا ہوں جو محبت کے انوار سے بھرے پڑے ہوتے ہیں۔ یگانگت اور اپنایت سے بڑھ کر محبت بھرا راز اور کونسا ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس کو تو ہمیشہ فاش ہوتے رہنا چاہیے۔ محبت کا راز فاش ہوتا ہے تو اردگرد روشنی پھیلتی ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے آپ کو اندھیروں میں گھرا ہوا کبھی محسوس نہیں کیا۔

ہر بندۂ خدا کو اپنا سمجھنے میں یقیناً میرے والدین کی تربیت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ہمارے گھر کے افراد کے علاوہ جس کا ہمارے گھر سے ذرا سا تعلق بھی ہوتا تھا وہ اگر بزرگ ہے تو ضرور ہم اسے تایا، چچا، ماموں اور بھائی جان کہتے تھے اور اگر وہ ہم سے چھوٹا ہوتا تو ہمارا بھائی کہلاتا تھا۔ خواتین میں گھر کی ملازمہ کبھی ہماری خالہ ہوتی تو کبھی پھوپھی کہلاتی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ملازمہ ہماری ماں کی منظور نظر ہوتی تو اسے ہم خالہ کہتے تھے ورنہ پھوپھی تو یقیناً ہوتی تھی کیونکہ ہمارے بابا جان اسے معاملے میں ہماری ماں کی نسبت زیادہ وسیع القلب تھے۔ ہماری ماں جلدی سے کسی کو اپنی بہن بنانے کو تیار نہ ہوتی تھیں جبکہ ہمارے بابا جان کا کہنا تھا "کوئی اچھا یا برا بعد میں ہوتا ہے پہلے وہ خدا کی مخلوق ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک آدمی کو آدمی سے اپنایت کا رشتہ قائم کرنے میں تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔" یہی وجہ ہے کہ بابا جان کے پاس جب بھی کوئی شخص کام کی غرض سے آتا وہ اس کا کام اسی خلوص کے ساتھ سرانجام دیتے تھے جیسے وہ ہمارے لیے کوئی کام کر رہے ہوں۔۔۔۔ اور وہ کام نہ ہوتا یا اس کے ہونے میں تاخیر ہوتی تو بابا جان کو ایک عجیب قسم کی بے چینی سی لاحق ہو جاتی تھی۔ کام بن جاتا تو بے حد خوش ہوتے تھے جیسے وہ کام کسی غیر شخص کا نہیں ہوا خاص ان کا اپنا کام ہوا ہے۔ اور اگر وہ کام نہ ہوتا تو اس شخص کے سامنے بے حد شرمندگی اور ندامت محسوس کرتے۔ اب وہ شخص ان سے ہزار کہہ رہا ہو کہ "سید صاحب اس میں آپکی طرف سے تو کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ آپ خواہ مخواہ شرمندگی محسوس کر رہے ہیں۔" مگر بابا جان کہتے "بھائی اگر یہ کام فلاں شخص نے نہیں کیا تو آخر وہ شخص میرے اور آپ جیسا ہی آدمی تو ہے۔ مجھ میں اور اس شخص میں کیا فرق ہے۔۔۔۔ اگر اس نے یہ کام نہیں کیا تو مجھے ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے میں نے یہ کام نہیں کیا۔ میں بے حس اور غافل ہو گیا ہوں۔"

_____ اس کے علاوہ ہمارے بابا جان کسی کے کام آنے میں عموماً یہ بھی نہیں دیکھتے تھے کہ وہ شخص ہے کون؟ دوست یا دشمن۔۔۔۔ ہماری ماں چیختی چلاتی رہ جاتی کہ ارے جس شخص کا کام آپ کرنے چلے ہیں معلوم ہے اس نے فلاں وقت میں آپکے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔۔۔۔۔ بابا جان جواب دیتے "وہ اس کا اخلاق تھا یہ ہمارا اخلاق ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ہم اپنا اخلاق خراب کیوں کریں۔ اور پھر بیوی آدمی کی مجبوریاں بھی تو سو طرح کی ہوتی ہیں۔ معلوم نہیں اس وقت اس بے چارے پر کیا بیت رہ ہو جو اس نے ہمارے ساتھ اس طرح کے ردعمل کا اظہار کیا یا ہمارے ساتھ اس طرح پیش آیا۔" مجھے اپنے بابا جان اس وقت بہت یاد آئے جب میرے ایک عزیز نے مجھے منافق اور بزدل کہا اور وہ بھی اس بات پر کہ اسے میرے گھر کے قریب اپنے ایک دوست سے ملنا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ اب اسے آنا ہے تو میں اس کا دل کیوں توڑوں اور یہ کہوں کہ تم ضرور آؤ لیکن میں نہ آسکوں گا کہ میں نے ایک جگہ جانے کا پہلے سے وعدہ کر رکھا ہے۔ میرا

خیال تھا جتنی دیر ہمارا وہ عزیز اپنے دوست کے پاس بیٹھے گا میں واپس آجاؤں گا مجھے دیر ہوئی تو میرے ا عزیز نے مجھے یہ انعام دیا--- یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس سے کبھی کوئی برائی کی ہو البتہ اس نے میر ساتھ کیا نہیں کیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ بہرحال مجھے دکھ ہے کہ اپنی اس قسم کی حرکتوں کی وجہ سے و ایک بری طرح ٹوٹا ہوا انسان ہے۔

میں جب دوسروں کو اپنا سمجھنے کی اس عادت کے تحت عام آدمی کو اپنا سمجھتا ہوں اور وہ مجھے ا نہیں سمجھتا تو اتنا دکھ اور افسوس نہیں ہوتا جتنا دکھ اور افسوس اس وقت ہوتا ہے جب پڑھے لکھے لوگ بھی خصوصیت کے ساتھ اہل قلم اور ادیب حضرات جلدی سے ایک دوسرے کو اپنا نہیں سمجھتے۔ اپنا سمجھنا تو بڑ بات ہے جن دنوں میں امریکہ مشاعرے پڑھنے گیا ہوا تھا وہاں میری بے تکلفی دوسرے لفظوں میں یگانگت اس رویہ پر ہمارے ایک معروف شاعر جو اپنے اشعار ماشاء اللہ بہت اچھل اچھل کر اور کود کود کر پڑھتے ہی کہنے لگے ”مشکور کھل کر بات کرنے کی میں نے تمہیں کب اجازت دی۔“ اسی طرح ہمارے ایک مزاح نگا جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ بہت مرنجاں مرنج اور دوست قسم کے آدمی ہیں، یار لوگوں نے ک ارے نہیں مشکور وہ تو اپنے آپ کو بہت بڑا بیوروکریٹ سمجھتا ہے۔ ذرا خط لکھ کر دیکھو وہ تمہیں کبھی جوا نہیں دے گا--- چنانچہ ہم نے بڑی محبت کے ساتھ ان حضرت کو ایک نہیں کئی خط لکھے۔ آخر میں انہیں حضور فیض گنجور بھی لکھا مگر وہ پاٹے خاں ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر آ عام آدمی کے ساتھ اپنائیت سے پیش آئیں گے تو وہ عموماً آپ کو مایوس نہیں کرے گا جس سے پتا چلتا ہے آدمی بنیادی طور پر دوسرے ابنائے جنس کو اپنا ہی سمجھتا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ آدمی کے پاس دوسروں کو اپنا سمجھنے کے بے شمار رنگ ہیں جن میں سے گنتی چند رنگ ہی آدمی کی عام آنکھ کو دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں تک دکھائی دے سکنے کا تعلق ہے تو جس طرح ا سمجھنے کے رنگ بے شمار ہیں اسی طرح ان رنگوں کے دکھائی دینے کے امکانات کا بھی کوئی شمار نہیں---- پ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی ان امکانات کے پوشیدہ رہنے کی بھی کوئی انتہا نہیں---- اسی طرح میں نے ا گفتگو کے عنوان میں آدمی کی یگانگت کے آشکار رنگوں کو یگانگت کی قوس قزح سے تعبیر کیا ہے ورنہ یوا آدمی کی یگانگت کے رنگوں کے پھیلاؤ اور احاطہ کو خیال میں لایا جائے تو یہ ایک بہت بڑا دائرہ بنتا ہے جس حصار میں دنیا و مافیہا اور آخرت سبھی کچھ آجاتے ہیں۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ آدمی کسی کو غیر تو سمجھنا نہیں چاہتا۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو پتا چل جاتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ یعنی اپنے ابنائے جنس کے سا آدمی کے کسی سلوک کسی رویہ سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کسی کو غیر سمجھ رہا ہے۔ کسی دوسرے کو ا سمجھنے کا مثبت شدید رویہ عشق و عاشقی ہے اور کسی غیر کو اپنا سمجھنے کا شدید منفی رویہ عداوت اور دشمنی ہے جس طرح ہم کسی غیر کو بڑی شدت کے ساتھ اپنا سمجھتے ہوئے اس پر عاشق ہو جاتے ہیں، اسی طرح کسی غیر بڑی شدت کے ساتھ اپنا سمجھتے ہوئے اس کے دشمن بھی بن جاتے ہیں۔ عاشقی ہو یا دشمنی یہ سب یگانگت رنگ ہیں۔ اگر آپ آدمی کی عاشقی اور دشمنی کو یگانگت سے علیحدہ کر کے یعنی خالص رنگ میں دیکھنا چا ہیں تو پھر اس کے ان ہر دو رویوں کو غیر جنس مخلوق میں دیکھنے کی سعی فرمائیے۔ (آپ یہاں مسکرا سکتے

لیکن اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے)۔ مثال کے طور پر کوئی شخص پورے اخلاص کے ساتھ یعنی اسے اپنا سمجھے بغیر ایک گھوڑے پر عاشق ہو سکتا ہے۔ اس جگہ آپ گھوڑے کے بجائے کوئی دوسرا جانور بھی رکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح کوئی شخص پورے اخلاص کے ساتھ ایک مرغے کا دشمن بن سکتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ غیر جنس پر تو یگانگت کے بغیر عاشق بھی ہو سکتے ہیں اور اس کے دشمن بھی لیکن ایک آدمی آدمی کا عاشق ہوتا ہے یا دشمن ہوتا ہے تو وہ اسے شدید طور پر اپنا سمجھ کر ہوتا ہے۔ یگانگت کے بغیر آدمی نہ تو دوسرے آدمی کا عاشق ہوتا ہے اور نہ دشمن---- یگانگت تو جیسے اس کے خون میں رچی بسی ہوئی ہے۔ یوں لگتا ہے آدمی کے جذبات کا سارا کھیل ساری قوت اور ساری توانائی یگانگت کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے---- بیگانہ رہ کر تو آدمی اپنے کسی ایک جذبہ کا بھی اظہار نہیں کر سکتا۔ بالفاظ دیگر جذبات کا دوسرا نام یگانگت ہے اور یگانگت کا دوسرا نام جذبات ہے۔ اسی لیے آدمی کو یگانگت کی قوس قزح کے جتنے رنگ فنون لطیفہ میں نظر آتے اور کہیں نظر نہیں آتے بلکہ سچ پوچھئے تو جہاں یگانگت کی قوس قزح پھیل کر پوری کائنات کو احاطہ کرتی نظر آتی ہے وہ فنون لطیفہ ہی کے تو انفس و آفاق ہیں---- بڑے اہل قلم کا تو کیا ذکر میں ایک معمولی لکھنے والا آدمی ہوں۔ جب قلم اٹھا کر کوئی ایک مصرعہ یا ایک فقرہ لکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے عشق و عاشقی کی کسی بہت ہی سرسبز و شاداب اقلیم میں قدم رکھ دیا ہے۔ اسی طرح جب میں کسی خوبصورت چہرے یا کسی خوبصورت پیکر کو دیکھ رہا ہوتا ہوں تو مجھے یوں لگ رہا ہوتا ہے جیسے میں کوئی بہت ہی خوبصورت قسم کی شاعری یا اعلیٰ قسم کا ادب تخلیق کر رہا ہوں۔ غالباً میں اسی لیے کوئی بلند پایہ شاعر یا ادیب نہیں بن سکا کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی حسین میرے سامنے آیا ہو اور میں ٹوٹ کر اس پر عاشق نہ ہوا ہوں۔ زندگی بھر عاشقی میرے بائیں ہاتھ کا کھیل رہا ہے۔ جبھی تو میں اپنے دائیں ہاتھ میں قلم لے کر کوئی عمدہ ادب تخلیق نہ کر سکا۔ بلکہ اگر آپ میرے ساتھ زمان و مکاں کی قید سے ذرا بلند ہو کر دیکھیں تو میں پورے وثوق کے ساتھ یہاں تک اعلان کرنے کی جرات کر سکتا ہوں کہ آج تک دنیا میں جتنے حسین پیدا ہو چکے ہیں اور آئندہ مستقبل میں جتنے پیدا ہونگے وہ سب کے سب میرے معشوق ہیں اور میں ان کا عاشق ہوں' پکا کھرا اور اس قدر سچا جس قدر کہ کوئی سچا عاشق ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو اپنی کسی بات کی سچائی کا اس قدر یقین نہیں دلا سکتا جس قدر کہ میں اپنے سچے عاشق ہونے کا آپکو یقین دلا سکتا ہوں۔ لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے کہ آپ بھی میری طرح دنیا کے تمام لوگوں کو اچھی طرح بھینچ کر اپنے سینے سے لگائیں۔ مجھے امید ہے کہ اس کار خیر میں آپ مجھ سے کسی طرح پیچھے نہیں رہیں گے---- بلکہ مجھے تو یہ خطرہ ہے کہ آپ عاشقی کے اس میدان میں بھی مجھ غریب کو کہیں بہت پیچھے ہی نہ چھوڑ جائیں اور میں بے چارہ اس بھری پری کائنات میں پاگلوں کی طرح تنہا کھڑا تکتا ہی نہ رہ جاؤں۔

ضیاء جالندھری

○

درد سمیٹتی ہوئی صبح کی لالہ تاب لَو
دل میں گزشتہ شب کی یاد آنکھ میں آتے دن کی ضَو

دل پہ سہج سہج کھُلا غنچہ مثال وہ جمال
دیکھیں تو اُسکی ایک چھب سوچیں تو اُس کے رُوپ سَو

ترکِ تعلقات سے جانچ نہ دل کی کیفیت
وہ تھا انا کا برف زار، یہ ہے لہو کی گُپت لَو

خواہشِ خود فریب کا سلسلہ ٹُوٹتا نہیں
پھر کہیں روشنی سی ہے، پھر کہیں پھوٹتی ہے لَو

سینے میں سیلِ پیچ و تاب، سلسلۂ شکستِ خواب
سوچ، سوالِ اضطراب، تازہ بتازہ نَو بہ نَو

دشت میں میرے رہنما، ریت پہ سُرخ نقشِ پا
شمعیں جلا کے رکھ گئے اپنے لہو سے پیش رَو

دَورِ ہوس پرست میں ڈھونڈ رہی ہے آنکھ اُنہیں
جن کی نظر میں ہیچ تھا خوانِ شہی سے نانِ جو

شام و سحر بدل گئے، قلب و نظر بدل گئے
یاد ہے مجھ کو اِس کے ساتھ آئی تھی ایک تیز رَو

ساقی فاروقی

○

وہ اضطراب ہوں جو خیر و شر سے باہر ہے
حصارِ ساحرِ شام و سحر سے باہر ہے

جو آگ میں جلائی تھی اپنے سینے میں
فغاں کہ دسترسِ شعلہ گر سے باہر ہے

عجب قیام ہے، منظر تمام دیکھ لیے
کہ وقت، حلقۂ دامِ سفر سے باہر ہے

مگر نگاہ میں سیپی کے ایک زخم کا سوگ
جو خواب گینۂ چشمِ گہر سے باہر ہے

میں آج بھی ہوں اسیرِ قیاس آرائی
ترا جمال گرفتِ نظر سے باہر ہے

بیدل حیدری

○

ترا بیمار اچھا ہو رہا ہے
یہ پہلی بار ایسا ہو رہا ہے

اچانک دل جو پسپا ہو رہا ہے
کہیں سے چھپ کے حملہ ہو رہا ہے

ترے جانے سے ہر شے میں کمی ہے
بس اِک صدمہ زیادہ ہو رہا ہے

دل اشکوں میں کھرل ہو گا ابھی تو
ابھی تو ریزہ ریزہ ہو رہا ہے

ہم اور فاقے اکٹھے ہیں ابھی تک
ابھی تک تو گزارا ہو رہا ہے

قدم اگلی صدی میں رکھ رہے ہیں
سفر پچھلی صدی کا ہو رہا ہے

اُتار اِس جامۂ ہستی کو بیدلؔ
یہ پیراہن پرانا ہو رہا ہے

○

دشمن کو تو زیر کر لیا ہے
اب خود سے مرا مقابلہ ہے

آنسو ہیں کہ خون کی پنیری
آنکھیں ہیں کہ دشتِ کربلا ہے

سورج کی دلیریاں تو دیکھو
شبنم پہ کمند ڈالتا ہے

دن کا تو عذاب سہہ ہی لیں گے
مرنا تو تمام رات کا ہے

تصویرِ بہار اب نہ کھینچو
ٹہنی سے پرند اُڑ گیا ہے

اب کے تو عذابِ شب نے بیدلؔ
بینائی کو بانجھ کر دیا ہے

گوہر ہوشیارپوری

○

پُرزہ پُرزہ تھا دامنِ من و تو
گوشۂ گور، مامنِ من و تو

بوٹا بوٹا دو رویہ سرو و چنار
ایک اندر سے گلشنِ من و تو

من و تو کے محاذ گرم رہے
اے دریغا تفنّنِ من و تو

من و تو پر یقین بھی سب کا
اور سارے ہی دشمنِ من و تو

داد اُس شخص کو ملی ہے جسے
طاقتِ ترک کردنِ من و تو

زہے تعلیم مصطفےٰؐ کا اثر
زہے تابِ گذشتنِ من و تو

○

حل جو کرلیں مسائلِ من و تو
اِک نہیں، سو سکون کے پہلو

کتنے رنگوں میں اِک گلاب کا پھول
سینکڑوں خوشبوؤں میں اِک خوشبو

کوئی دن ہو، اسی خیال کا دن
کوئی شب ہو، وہی گلِ شب بو

سالہا سال ایک دھیان کی موج
وہی رمنے، وہی رمِ آہو

کتنی پھیلی ہیں سرحداتِ جمال
اے گرفتارِ عارض و گیسو!

دل بہرحال گرمِ ذکرِ حبیبؐ
ہر نفس لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو

محب عارفی

○

جیسے باہر ساز کے پردے سے نکلا ہی نہیں
ہوں کہاں میں، کسی سے پوچھوں کوئی سنتا ہی نہیں
اب نگاہِ نارسا کہتی ہے شوقِ دید سے
جو نظر آ ہی نہیں سکتا، وہ ہوگا ہی نہیں
وہ تو خوشبو ہے، نظر پاتی رسائی کس طرح
ویسے کی پائے طلب نے کوئی کوتاہی نہیں
عالمِ اسباب دنیا ہے معموں کی سو میں
ہو گیا گم ایسی دنیا میں کہ دنیا ہی نہیں
خندہ زن ذوقِ پرستش ہے مذاقِ دید پر
اور کچھ بھی ہے، وہ بُت اپنا سراپا ہی نہیں
بند آنکھوں کو نظر آتی تھی اک دنیا جہاں
کھُل گئیں آنکھیں تو دیکھا، کچھ وہاں تھا ہی نہیں
حسن کا پندار محتاجِ نیازِ عشق ہے
دھوپ کو خود مکتفی ہونے کا یارا ہی نہیں
ظالم اُس کی کچھ اُمید افزا ادائیں بھی تو ہیں
مجھ کو شکوہ اُس سے اُسکی بے رخی کا ہی نہیں
عشق کے معنی ترسنا، حسن ترسانے کا نام
لاکھ سمجھاتا ہوں دل کو، دل سمجھتا ہی نہیں
دیکھ لینے کی اجازت بھی غنیمت ہے محب
دیدنی بھی ہے دہن اُس کا، رسیلا ہی نہیں

○

پوچھتا ہوں گردشِ وقتِ تغیر زا سے میں
کیوں بدل پاتا نہیں امروز کو فردا سے میں
کیا تماشا ہے کہ دنیا خود مرا اعجاز ہے
پھر ہوا ہوں خود برآمد بھی اِسی دنیا سے میں
میں بھنور جس کا ہوں وہ دریا نظر آئے سراب
آ گیا ہوں تنگ اپنے دیدۂ بینا سے میں
وہ حیا پیکر ہے مشتاقِ نظر اِس راز کو
پا گیا اُس کی ادائے اشتیاق افزا سے میں
مجھ کو وہ سروِ خراماں خود نہیں آتا نظر
کچھ اُگا لیتا ہوں خود اُس کے نقوشِ پا سے میں
پا گیا ہوں کچھ رموزِ پیکرِ زیرِ نقاب
اُس کے اندازِ نمودِ قامتِ رعنا سے میں
جاگتی آنکھوں کی دنیا دیکھ آیا ہوں تمام
کیا کروں گا جا کے باہر خواب کی دنیا سے میں
اب حقیقت مانتا جاتا ہوں اِک اک وہم کو
ہو رہا ہوں وہم خود کس شانِ استغنا سے میں
وادیِ لا ہے یہ منزل بھی کہ پہنچا ہوں جہاں
راہِ لا پر عمر بھر چل کر مقامِ لا سے میں
دوستوں کے قرضِ احسانات اتر سکتے نہیں
بس محب اب لاپتہ ہو جاؤں آہستہ سے میں

آفتاب اقبال شمیم

○

ہوں دیکھنے میں عام سا منظر زمین کا
منسوب ہے مجھی سے مقدّر زمین کا

زنجیر سی پڑی ہے دلوں کے کواڑ پر
یہ سرحدیں ہٹا کہ کھلے در زمین کا

بدلے لہو کے رنگ سے، وُہ بھی ذرا سی دیر
رہتا ہے ورنہ ایک ہی منظر زمین کا

مجھکو مرے شعور کی برکت سے مل گیا
اِس شہرِ کائنات میں یہ گھر زمین کا

سو جاؤں فکرِ شعر میں بےفکریوں کیساتھ
چادر ہو آسمان کی، بستر زمین کا

جیتا ہوں خود کو بیچ کے بازارِ نثر میں
میں رہنے والا شاعری کی سرزمین کا

○

بھیجا ہے مے کدے سے کِسی نے پیامِ غم
آؤ کہ منتظر ہے کوئی ہم کلامِ غم

لے جائے اب جہاں کہیں شبدیزِ زندگ
تھامی ہوئی ہے ہاتھ میں ہم نے زمامِ غم

یوں اپنے ظرف کا نہ تمسخر اُڑایئے
سر پر اُنڈیلئے، یہ بچا ہے جو جامِ غم

آئے گا ایک رقعۂ خالی جواب میر
اُس کے بجائے بھیجئے نامہ بہ نامِ غم

مفرور معتبر ہیں، ملیں گے یہیں کہیر
اپنے زیاں کے کھوج میں والا کرامِ غم

سب کو بُلائے عشرتِ ارزاں نے کھا
اب تُو ہی رہ گیا ہے برائے طعامِ غم

توصیف تبسم

○

قافلہ عمر کا تھا رہگزری تھے ہم بھی
اپنے ہونے میں گرفتار سبھی تھے ہم بھی

سایۂ تاک میں کچھ دیر اُسے یاد کریں
عہدِ بے نام کے جب بیخبری تھے ہم بھی

ذکرِ ہجراں پہ اگر آنکھ بھر آئی اُس کی
حسرتِ وصل میں آغوشِ تہی تھے ہم بھی

گھر جو لوٹے تو کہیں دفن کر آئے خود کو
یوں نہ کرتے تو یہاں دربدری تھے ہم بھی

جو دیا ہٹ گیا منظر سے وہ کب یاد آیا
یاد آیا، اسی محفل میں ابھی تھے ہم بھی

بجھ گئی رات ستاروں کو بجھا کر، توصیفؔ
تھے ستارہ، ہدفِ تیرہ شبی تھے ہم بھی

خلیق احمد خلیق

(قطعہ بند)

تازہ پیمانِ وفا زیست سے کرتے جانا
بس یونہی دشتِ تمنّا سے گزرتے جانا

زندگی رہ میں کھڑی کس کو ملی ہے لوگو
چیز کرنے کی ہے، بس شوق سے کرتے جانا

یہ وہ مُورت ہے جو بنتی ہی چلی جاتی ہے
اپنے حِصّے کا کوئی رنگ بھی بھرتے جانا

اِسکے پیرائے میں جی لو تو سپھل ہے جیون
ہر نئی رُت میں، نئی طرح سنور کے جانا

زیست کی بگڑے مزاجوں سے بگڑ جاتی ہے
اِس دلآرام سے تکرار نہ کرتے جانا

خوشگواری کی فضا تان کے سر پر نکلو
ایک ہالے میں تبسّم کے، گزرتے جانا

حلقۂ ہست سے باہر جو نکلنا ٹھہرے
روح کو پیار کی دہلیز پہ دھرتے جانا

صوفی دِکھتے ہو کسی سلسلۂ نو کے خلیقؔ
دو گھڑی پاس ہمارے بھی ٹھہرتے جانا!

ظفر اقبال

○

اُسکے گلاب، اُسکے چاند جس کی بھی قسمت میں ہیں
آپ، ظفرؔ، کس لیے اتنی مصیبت میں ہیں

ایک ہی صحرا سے ہے واسطہ اپنا ابھی
کوئی دنوں سے تو ہم ایک ہی وحشت میں ہیں

دینا ہے دھوکا کہاں، چھوڑنا ہے کس جگہ
فکر ہے ساری اُسے جس کی معیّت میں ہیں

چھان پھٹک ہو چکی، غور بہت کر چکے
کچھ نہیں کُھلتا کہ ہم کون سی حالت میں ہیں

طے نہ جنھیں کر سکا زندگی بھر کا سفر
فاصلے ایسے بھی کچھ اپنی طبیعت میں ہیں

اپنے تقاضے الگ، اپنی ضرورت جُدا
پھنستے ہی مشکل میں ہم کافی سہولت میں ہیں

اِس میں بھی کوئی اگر رہنے ہمیں دے، کہ ہم
وہم بشاشت میں ہیں، خوابِ مسرّت میں ہیں

پہنچے ہی پہنچے یہاں آ گئے سو انقلاب
ہم بھی رہے بے خبر، آپ بھی غفلت میں ہیں

پھیلا ہُوا ہی سہی شور ہمارا، ظفرؔ
ہیں فقط افسانہ ہم، اور، حقیقت میں ہیں

○

اِک اور شور تو ہے اُس کے جی میں آیا ہو
میں اُس کو یاد دلاتا ہوں کچھ بھُ

اُسے میں دوسری بار آزماؤں گا، ورنہ
ہے ایک بار تو وہ میرا آزما

گزر گئی ہے مری عمر آستیں کے بغیر
یہ سانپ مجھ کو ملا ہے پلا پل

حساب کر کے بہت خوش ہُوا ہوں آخری وقت
کہ میں نے پایا ہُوا ہے نہ کچھ

میں چھوڑ کر اُسے خود ہی نکل گیا اِک رات
جو آس پاس تھا اِک شہر سا

بس ایک لَے ہی ذرا مختلف رہے گی، کہ میر
سناؤں گا وہی نغمہ سُنا

میں اِس پہ خود نہیں چلتا ہوں اب تو بات ہے ا
یہ راستہ ہے دگرنہ مرا ب

یہ شاعری تو کبھی میرے بس کا روگ نہ تھی
کسی نے ہے مجھے کس کام پر ل

میں ایک بوجھ ہوں خود اپنے آپ پر کبھی
کبھی اُٹھایا ہُوا ہے، کبھی گرایا

جون ایلیا

○

خُود تک آنا تو اِک بلا ٹھیرا   آخرِش اپنا سامنا ٹھیرا
جانے کیا بات ہے جو بھائی مجھے   جانے کیا دل کا مدّعا ٹھیرا
اپنا ہونا فقط ہُوئے جانا   اپنے ہونے کا اک گِلہ ٹھیرا
ہم جہاں گرد تھے مگر اپنا   آخر اپنے میں ٹھیرنا ٹھیرا
نہیں دُشوار زندگی کرنا   پر یہ 'لمحہ' تو اِک بلا ٹھیرا
خانۂ دل میں تفرقہ تھا بپا   سو ہر اک غم جُدا جُدا ٹھیرا
جوؔن جانی! ترا عبث کا سفر
از کجا . . . یعنی تا کجا ٹھیرا

○

دِل سے اِک رشتہ یاد کا ٹھیرا   جانے پھر اس کے بعد کیا ٹھیرا
پُرسخن، عُمر بھر رہے خاموش   یعنی سب کچھ کہا ہُوا ٹھیرا
جانے کس شے کا نام منزل ہے   جو ہُوا طے وہ راستا ٹھیرا
پڑنے والا ہے مجھ میں کال مرا   میں تو اپنے سے اب گیا ٹھیرا
طورِ بے ماجرائی بھی اپنا   ماجرا ناک ماجرا ٹھیرا
اے شمیمِ ملولِ یاد انگیز   خیمہ گاہِ صبا میں کیا ٹھیرا
اب درِ دل پہ تم نہ دو آواز   اب تو میں بے دلی میں آ ٹھیرا
اِس فریبِ گمانِ بودش میں
آخر "اِلّا" بھی جوؔن "لا" ٹھیرا

مرتضیٰ برلاس

رویّے اجنبی اور بام و در انجان لگتے ہیں
ہم اپنے گھر میں رہتے ہیں مگر مہمان لگتے ہیں

درختوں سے نہیں رونق تو انسانوں سے ہوتی ہے
یہ جنگل ہیں سَروں کے، جو ہمیں ویران لگتے ہیں

نہ منظر میں ہے تبدیلی، نہ پس منظر ہی بدلا ہے
ہے قصّہ ایک، لیکن مختلف عنوان لگتے ہیں

بہت نازاں تھے جو اپنے ستم پرور رویّے پر
ہمارے ضبطِ غم پر اب وہی حیران لگتے ہیں

ہے گر دریا میں خاموشی، اِسے پایاب مت جانو
تہِ اِمواج کچھ سوئے ہوئے طوفان لگتے ہیں

ہمارا نام لکھ لکھ کر مٹانے کا یہ مطلب ہے
ہمیں برباد کرنے کے بہت ارمان لگتے ہیں

سماعت سے اگر پہلے سزا تجویز کر دی ہو
دلائل بے گناہی کے تو پھر بے جان لگتے ہیں

میں ارباب سیاست کو وطن دشمن نہیں کہتا
مگر یہ دوست ایسے ہیں کہ جو نادان لگتے ہیں

○

غیر کے آ گئے، یہ سَر خم دیکھئے کب تک رہ
بے حسی کا اب یہ عالم دیکھئے کب تک رہ

کب دعائیں مُستجب ہوں کب ہمارے دن پھر
دل پریشاں، آنکھ پُرنم دیکھئے کب تک رہ

دوست اور دشمن کے چہرے تک کے واضح نہ ہو
دیپ کی لَو، اتنی مدھم دیکھئے کب تک رہ

برف بھی پگھلے گی اور سُورج بھی چمکے گا ضر
سرد مہری کا یہ موسم دیکھئے کب تک رہ

صبحِ نو کے جشن میں حائل نہ تھے شب کے رفی
چاند تارے اور شبنم دیکھئے کب تک رہ

کیسے کیسے سرکشیدہ جھک گئے اک وار
ہاں مگر سینہ سپر، ہم دیکھئے کب تک رہ

جو محرک ہے مرے تخلیقِ فن کے واسط
فکر میں یہ شدتِ غم دیکھئے کب تک ر

محسن احسان

○

ـب اس رُت کی چھل بل دیکھتے ہیں
ندے آنکھیں مَل مَل دیکھتے ہیں
"کنارِ آبِ رکنا باد" ہیں ہم
ہمیشہ گھر میں جل تھل دیکھتے ہیں
ا پتوں سے کچھ کہہ کر گئی ہے
سخن آمادہ جنگل دیکھتے ہیں
بچھا کر ہم سرِ دہلیز آنکھیں
خود اپنی راہ ہر پل دیکھتے ہیں
ی خورشید کی اُمید میں ہم
اِعوں کو مسلسل دیکھتے ہیں
چلو اس بار خود کو ڈھونڈتے ہیں
چلو یہ چال بھی چل دیکھتے ہیں
ین جس سے بام و در ہوئے تھے
، دستِ ہنر شل دیکھتے ہیں
وفا جس کے دریچے میں کھڑی تھی
اسی گھر کو مقفّل دیکھتے ہیں
کوئی سمجھائے یہ محسنؔ کو جا کر
در و دیوار پاگل دیکھتے ہیں

○

زمیں ہماری طرف آسماں ہماری طرف
مگر کہیں نہیں اہلِ جہاں ہماری طرف

ہمیں خبر نہیں اور امرِ واقعہ یہ ہے
کہ ایک سیلِ بلا ہے رواں ہماری طرف

یہ آگ سردیاں تقسیم کر گئی ایسے
تپش تمہارا مقدر، دھواں ہماری طرف

ثوابِ راحتِ دنیا و دیں تمہارا نصیب
عذابِ کشمکشِ بے اماں ہماری طرف

انہیں تھا دعوۂ دریا دلی پر ایسے ہوا
پلٹ کے آ گئے تشنہ وہاں ہماری طرف

کھلی جو آنکھ صفِ دشمناں میں شامل تھا
یہ زعم تھا کہ ہے اِک مہرباں ہماری طرف

عجیب رُت ہے یہ محسنؔ کہ پھر ہوا کے یقین
اڑا کے لائی ہے گردِ گماں ہماری طرف

ماجد صدیقی

○

سر اُٹھانے کی رہ میں ہمارے لئے ہر کہیں ہے کڑے سے کڑا چودھری
یہ بڑا چودھری، وہ بڑا چودھری، اِس سے آگے بھی ہے اِک بڑا چودھری

ریوڑوں پر جھپٹتے ہوئے گرگ سا، آنگنوں گھونسلوں میں گھسے سانپ سا
جھونپڑے جس جگہ بھی دکھائی دیئے، ان میں دیکھا اکڑتا کھڑا چودھری

سبزۂ زیرِ سنگِ گراں نے ذرا سر اُٹھایا جہاں اُس کا جی جل اُٹھا
صورتِ حال ایسی جہاں بھی ملی، اِس سے ہے مخمصوں میں پڑا چودھری

نام سے اِک اسی کے تھی منسوب جو لہلہاتی فضا میں پتنگ اوج کی
ڈور ہاتھوں سے اس کی نکلتے ہوئے دیکھ کر ہے زمیں میں گڑا چودھری

خوں میں اُترا نشہ چودھراہٹ کا، وہ دیکھ سکتا تھا کیسے بھلا ٹوٹتے
لے کے پلٹا ہے وہ انتقام اونٹ سا، ایسی ہٹ پر جہاں بھی اَڑا چودھری

زیردستوں کو رن میں دھکیلا گیا، آن سے جان سے ان کی کھیلا گیا
پر جو ماجدؔ ہوئے اس سے روکش ذرا، ان سے آخر تلک ہے لڑا چودھری

○

تا عمر اقتدار کو دیتے ہوئے ثبات
رکھ دی گئی بگاڑ کے ملت کی نفسیات

پیڑوں پہ پنچھیوں میں عجب سنسنی سی ہے
گیدڑ، ہرن کی جب سے لگائے ہوئے ہیں گھات

مخلوق ہو کوئی بھی مگر دیکھنا یہ ہے
کرتا ہے کیا سلوک یہاں کون، کِس کے ساتھ

اشکوں سے کب دھلی ہے سیاہی نصیب کی
تسخیر جگنوؤں سے ہوئی کب سیاہ رات

ہم نے یہ بات کرمکِ شب تاب سے سُنی
ظلمت نہ دے سکی کسی اک بھی کرن کو مات

ماجدؔ کسی کے ہاتھ نہ آئے نہ آ سکے
کٹ کر پتنگ ڈور سے، منہ سے نکل کے بات

شفیق سلیمی

○

کبھی منزل کبھی رستہ کوئی کیسے بدلتا ہے
ہمیں معلوم ہی کب تھا کوئی کیسے بدلتا ہے

ہمارے درد کی اوقات ہی کیا ہے زمانے میں
کسی کے ہاتھ کا لکھا کوئی کیسے بدلتا ہے

کہانی کے سبھی کردار ہوں جب موم کے پتلے
کوئی کیسے بدل دے گا، کوئی کیسے بدلتا ہے

خس و خاشاک کی صورت جو لے جائیں انائیں بھی
بھلا رُخ اُن ہواؤں کا کوئی کیسے بدلتا ہے

یقیں سے بے یقینی کے سفر تک ساتھ تھا میرے
بدل کر اُس نے دکھلایا، کوئی کیسے بدلتا ہے

○

پنجرہ توڑ اڑان کو نکلے بے پَر کے پنچھی
مار اڈاری چھت پر جا بیٹھے گھر کے پنچھی

شاخِ تن سے کتر کتر کر پھینک رہے ہیں پر
پتھر مار اڑائے کوئی یہ ڈر کے پنچھی

ڈھلتی پھرتی چھاؤں رہے کب ایک ٹھکانے پ
ایک ہی ڈال کے یار ہوئے ہیں کب زر کے پنچھ

کلغی والے گردن ڈالے مٹی چاٹتے ہیں
موتی چگتے دیکھے ہم نے بے سر کے پنچھی

خشک رُتوں میں بادل برسے پیڑ نہال ہوئ
اک مدت کے بعد نہائے جی بھر کے پنچھ

(ابوظبی)

شفیع ضامن

○

دُودِ بارُود سے پھر کیوں ہیں فضائیں کالی
کیوں اُتر آئی ہیں گھر گھر میں بلائیں کالی

دُلہنیں سیجوں پہ کیوں خاک بسر بیٹھی ہیں
مائیں کیوں اوڑھ کے پھرتی ہیں ردائیں کالی

جب بھی اعصاب کو سہلانے لگی دھوپ ذرا
چار جانب سے اُمڈ آئیں گھٹائیں کالی

ظلم یہ ہے کہ بنے پھرتے ہیں کرنوں کے نقیب
جن کے دِل بغض بھرے ، جنکی صدائیں کالی

جب تلک حرمتِ انساں نہ ہو مقصودِ نظر
سارے اِنعام غلط ، ساری سزائیں کالی

پیار اُن لوگوں سے کیوں مانگ رہے ہو لوگو!
جن کے سینوں میں پنپتی ہیں انائیں کالی

یہ ترقی ہے کہ معراجِ تنزّل ضامنؔ
آب آلودہ ، زمیں شور ، ہوائیں کالی

○

روشنی آئے کہیں سے نہ ہوا ہی آئے
ایسی آفت تو کسی پر نہ الٰہی آئے

اے مجھے جُرم کی سولی پہ چڑھانے والے!
تیرے آگے مری ناکردہ گناہی آئے

پیار بیوپار ہی ایسا ہے کہ ہر فصل کے بعد
دِل کے حِصّے میں یہی غم کی اُگاہی آئے

دیکھئے اِس کو ملے کب کسی منزل کا سُراغ
اور کب راہ پہ بھٹکا ہوا راہی آئے

رن پڑا تو صفِ اعدا میں کھڑے تھے سارے
وہ جو کرنے کو مری پشت پناہی آئے

تو جو خود اپنی نفی کرتا پھرے تو ضامنؔ
کیوں کہیں سے ترے ہونے کی گواہی آئے

اشفاق حسین

○

سکونِ دل کی خاطر اک سہارا ڈھونڈتے ہیں
جو گردش میں نہیں ہے وہ ستارا ڈھونڈتے ہیں

یہ دریا زندگی کا پار کیسے ہو کہ جب ہم
کنارے پر کھڑے ہیں اور کنارا ڈھونڈتے ہیں

ابھی تو تجھ سے وابستہ ہیں پچھلے زخم سارے
شبِ رفتہ! اب تجھے ہم کیوں دوبارا ڈھونڈتے ہیں

کوئی گھر ہی نہیں تو بے گھری کا زخم کیسا
سکونت کے لیے اک استعارا ڈھونڈتے ہیں

ہماری خواہشِ بے خواہشی جو راکھ کر دے
ہم اپنی شخصیت میں وہ شرارا ڈھونڈتے ہیں

زمیں اچھی لگی ہے آسماں پر جا کے ہم کو
کہاں ہے اس زمیں پر گھر ہمارا، ڈھونڈتے ہیں

سروں پر آ گیا سورج مگر اشفاق ابھی ہم
سحر ہونے کا ہلکا سا اشارہ ڈھونڈتے ہیں

○

آنکھوں میں اک نمی سی ہے، چہرہ اداس ہے
کس داستانِ درد کا یہ اقتباس ہے

شاید بتا سکے یہ گئے موسموں کے راز
تودوں میں برف کے جو چھپی سبز گھاس ہے

ہجرت کی منزلوں میں ہر اک خاندان کی
اک نسل مطمئن ہے مگر اک اداس ہے

سرکش ہوا کو یہ ابھی معلوم ہی کہاں
ہر ایک موجِ آب سمندر اساس ہے

اے سایہ دار پیڑ! میں جلتا ہوں دھوپ میں
اے چشمۂ سکوں! مجھے شدت کی پیاس ہے

جو جانتا ہے، اب وہی کہتا ہے، کون ہو
لہجے میں اس کے پھر بھی بلا کی مٹھاس ہے

اشفاق اس سے کیسے چھپاؤں میں دل کی بات
چہرہ شناس ہی نہیں، وہ دل شناس ہے

صفدر سلیم سیال

○

خُود سے بڑا کسی کو تونگر نہیں کہا
اپنے مکاں کو پھر بھی بڑا گھر نہیں کہا

ویسے تو ہر مقام پہ ہم منفرد رہے
لیکن کسی کو اپنے سے کمتر نہیں کہا

ہم نے تری زمین کو چُوما مگر اُسے
مسجد نہیں کہا اُسے مندر نہیں کہا

جو بھی کسی سبب سے جُھکا پیشِ شہر یار
ہم نے اُسے کہیں بھی قلندر نہیں کہا

کہنا پڑا تو ہم نے سر دار بھی کہا
لیکن کسی کو کچھ بھی پسِ در نہیں کہا

کیا لوگ تھے، سفر کی صعوبت کے باوجود
حالات سے لڑے، اُنھیں ابتر نہیں کہا

کیا یہ بہت نہیں کہ حقیقت کے باوجُود
تجھ کو کسی کے آگے ستمگر نہیں کہا

ہم عمر بھر دکھاتے رہے سب کو آئنہ
ہم نے بُرا کسی کو بھی صفدر نہیں کہا

○

بدل جائیں زمین و آسماں سچ بولنا ہے
تمھیں سُود و زیاں کے درمیاں سچ بولنا ہے

مجھے کس نے ڈبویا تھا، مجھے کس نے بچایا
خدا کے واسطے آبِ رواں سچ بولنا ہے

جہاں میلہ لگا ہو جھُوٹ کی اُونچی دکاں پر
اگر جاں بھی چلی جائے، وہاں سچ بولنا ہے

وہ کس کے نقشِ پا اُلجھے ہوئے تھے بارشوں سے
چراغِ گوشۂ کوئے بُتاں سچ بولنا ہے

خلافِ دشمناں سچ بولنا آساں ہے لیکن
تمھیں اب کے خلافِ دوستاں سچ بولنا ہے

ہنر یہ بھی تمھیں اب سیکھنا ہوگا جہاں میں
کہاں خاموش ہونا ہے کہاں سچ بولنا ہے

مشکور حسین یاد

○

ب زیست نظر آتی ہے حاصل سی کوئی چیز
ہر دہر میں رہتی نہیں باطل سی کوئی چیز

ہم ناقصوں کا بخت بھی دیکھو کہ ہمیں ہے
سینے سے لگائے ہوئے کامل سی کوئی چیز

ہر غنچے کی آغوش میں ہے یلیٰ موسم
ہر غنچے کی آغوش ہے محمل سی کوئی چیز

ہر لحظ ہمیں رکھتی ہے سرگرم تمنّا
ابل سی کوئی چیز مقابل سی کوئی چیز

ہو جاتی ہے اِک شوخ حسینہ سے ملاقات
آ جاتی ہے جب سامنے مشکل سی کوئی چیز

ہر کیسے نہ ہر حُسن سے قُربت ہو ہماری
رکھتے جو نہیں ہم حدِ فاصل سی کوئی چیز
شکورؔ یہ اعزاز کسی کو نہیں حاصل
ں ایک تری ذات ہے فاضل سی کوئی چیز

سید شوکت حسین کاظمی

○

اس طلسمِ دلربا کا کوئی دروازہ نہیں تھا
مجھ گرفتارِ بلا کو اس کا اندازہ نہیں تھا

ایک کو مصلوب کرکے ساری خلقت مطمئن تھی
اس نے بھگتا، اس کے جُرموں کا جو خمیازہ نہیں تھا

کس توقع پر پرندے گھونسلے آباد کرتے
ایک بھی جھونکا ہوا کا باغ میں تازہ نہیں تھا

وہ جو ہلکی سی کسک تھی، تم بھی کیسے جان لیتیں
غم کا نقّارہ نہیں تھا، دل کا آوازہ نہیں تھا

میرا اندیشہ ہے وہ گردِ پریشانی کی تہہ تھی
وقتِ رخصت چہرۂ محبوب پر غازہ نہیں تھا

ثاقب عرفانی

○

جفائیں بھول جانا چاہتا ہوں
تعلق کو نبھانا چاہتا ہوں

تعصب کی سیہ تاریکیوں میں
نئے سُورج اُگانا چاہتا ہوں

وَرا ہو کے پھر اُمیدِ ثمر سے
نئے پودے لگانا چاہتا ہوں

کلاشنکوف، بارودی دھوئیں سے
نئی نسلیں بچانا چاہتا ہوں

محبت، سادگی، اخلاص، الفت
سلیقے کا گھرانا چاہتا ہوں

وسیلہ ہوں جو ثاقب مغفرت کا
وہ یادیں چھوڑ جانا چاہتا ہوں

سید نواب حیدر نقوی

○

زینتِ محفل بنے، پھر اجنبی بنتے گئے
آپ نے جیسا بھی چاہا، ہم وہی بنتے گئے

لاکھ شہرِ ناشناساں میں تھے ہم ناآشنا
سجدہ ہائے شوق وجہِ آگہی بنتے گئے

شوخیٔ عکسِ جمالِ یار دیکھا چاہیئے
آئینہ خانے ہُنر کے حَیرتی بنتے گئے

ایک وہ موسم کہ عقل و ہوش بیگانے سے تھے
پھر وہ رُت آئی، دھندلکے روشنی بنتے گئے

وہ جو مردانِ جہانِ رزم آرائی نہ تھے
آخرش پیغمبرانِ آشتی بنتے گئے

وسعتِ صحرائے غم تھی جاں گُسل راہی مگر
نقشِ پائے یار میری زندگی بنتے گئے

خالد احمد

○

بھ جدائی کے دامن میں بھی چھوڑ دیں
ربط رکھیں، اگر دوستی چھوڑ دیں

ستے ہنستے اچانک اُٹھیں، چل پڑیں
جسم سے روح تک سنسنی چھوڑ دیں

س پڑاؤ پہ، کس موڑ پر، کس گھڑی
ان کہی داستاں، ان کہی چھوڑ دیں

ں مہکتے، پرندے چہکتے رہیں
اور ہم اہلِ غم، شاعری چھوڑ دیں

وڑ دیں آس بھی، حسن کی پیاس بھی
پونچھ لیں چشمِ تر، عاشقی چھوڑ دیں

ئی چرچا نہ ہو، کوئی رسوا نہ ہو
عشق کا ساتھ کب سائے بھی چھوڑ دیں

سے، غولِ بیاباں کے بھٹ ہو گئے
گھر بنانا نہ اب آدمی چھوڑ دیں

ہ کہاں جائیں گے، سکھ کہاں پائیں گے؟
کس طرح ہم اب ان کی گلی چھوڑ دیں

رِوش اک گُلِ گرد کا تخت ہے
راہِ صحرا وُہ کیونکہ تہی چھوڑ دیں

ں بلندی کو دیں وہ سرافرازیاں
پست کتنے علم وُہ یونہی چھوڑ دیں

ئم ملنے کی خو، پھول کھلنے کی خو
کس طرح چشمِ نم عاجزی چھوڑ دیں

غ ٹھہرے یہ سیرِ عدو کے لیے
گر کچھ اہلِ وطن سرکشی چھوڑ دیں

نچ دریاؤں کا نطق کس کو ملا؟
کیا ہم اس بات پر فخر بھی چھوڑ دیں

اے فقط نغمگی! اے فقط تازگی!
چھوڑ پائیں تو دریا دلی چھوڑ دیں

اختر ضیائی

○

کبھی چمن میں کبھی راہ پر ملے گا ہمیں
ہر ایک بار برنگِ دگر ملے گا ہمیں

غبارِ وقت میں رُوپوش ہو گیا تو کیا
جو چاند دل میں سدا جلوہ گر ملے گا ہمیں

اگر صحیفۂ دانش میں اُس کا ذکر نہیں
تو پھر کہاں سے مقامِ بشر ملے گا ہمیں

چلے چلو کہ ستارہ شناس کہتے ہیں
اُفق کے پار وفا کا نگر ملے گا ہمیں

کسے خبر تھی نشیب و فرازِ ہستی میں
جگر کا خُون ہی زادِ سفر ملے گا ہمیں

ہجومِ سینہ فگاراں میں ڈھونڈ اخترؔ کو
انھیں کے ساتھ وہ آشفتہ سر ملے گا ہمیں!

(لندن)

پروفیسر افضل علوی

○

تذکرہ اُس کا، مگر اُس میں حوالے میر
کام کرتے ہیں عجب یار، نرالے یہ

اب کوئی صبحِ درخشاں نہیں پہلے جد
ساتھ ہی لے گیا اپنے، وہ اجالے م

وہ ہے دلگیر تو اب اُس کا مداوا ی
اپنے دکھ دے دے مجھے، خواب اُٹھا لے

کوئی تو پیار سے اک بار پکارے
کوئی تو چاہ کے ارمان نکالے

سلیم کوثر

○

ہ جو آئے تھے بہت منصب و جاگیر کے ساتھ
یسے چپ چاپ کھڑے ہیں تری تصویر کے ساتھ

رف زنداں کی حکایت ہی پہ مامور نہیں
یک تاریخ سفر کرتی ہے زنجیر کے ساتھ

ب کے سُورج کی رہائی میں بڑی دیر لگی
رنہ میں گھر سے نکلتا نہیں تاخیر کے ساتھ

کتنا پامال ہوا شہر تمنّا لیکن
ری یادیں نہیں اُتریں تری تصویر کے ساتھ

یکھتے کچھ ہیں، دکھاتے ہمیں کچھ ہیں کہ یہاں
کوئی رشتہ ہی نہیں خواب کا تعبیر کے ساتھ

اب کسی اور گواہی کی ضرورت ہی نہیں
جرم خود بول رہا ہے تری تحریر کے ساتھ

یاد بھی ابرِ محبّت کی طرح ہوتی ہے
ایک سایا سا چلا جاتا ہے رہ گیر کے ساتھ
کس قدر پھیل گیا وحشتِ ہجراں کا غُبار
آؤ اب جشن مناؤ دلِ دل گیر کے ساتھ

میں تو خود اپنی ہی سچائی کا مجرم ہوں سلیم
میرا غالبؔ سے تعلق نہ کوئی میرؔ کے ساتھ

○

مجھ کو اسی بات کا تو غم ہے
دُنیا مری آرزو سے کم ہے

نادیدہ زمانے دیکھتا ہوں
چہرہ ہے ترا کہ جامِ جم ہے

یہ کیسے نشاں اُبھر رہے ہیں
یہ تو ہے کہ وقت ہم قدم ہے

میرا بھی گزر نہیں ہے جب سے
یہ دل تری یاد کا حرم ہے

جیتے ہوئے لوگ ہار جائیں
اے کارِ جنوں بڑا ستم ہے

مٹّی ہی کا کھیل ہے یہ سارا
مٹّی ہی وُجود کا عدم ہے
ہر پل کوئی سوچتا ہے مجھ کو
ہر لمحہ مرا نیا جنم ہے

دیکھوں تو ذرا میں نام اپنا
اے لوحِ جہاں، کہاں رقم ہے

سلطان سکون

○

کوئی جب بول سچا بولتا ہے
خلاف اس کے زمانہ بولتا ہے
اُسی کا بول بالا بولتا ہے
وہ جس کے پاس پیسہ بولتا ہے
کوئی ہوتا ہے اعلیٰ ظرف جتنا
وہ اتنا دھیما دھیما بولتا ہے
وہ ہو سکتا ہے زہریلا بھی اتنا
کوئی جتنا بھی میٹھا بولتا ہے
یقیناً بے عمل ہوتا ہے وہ، جو
ضرورت سے زیادہ بولتا ہے
ضروری تو نہیں اندر سے خوش ہو
بظاہر وہ جو ہنستا بولتا ہے
چھپانے سے چھپا کب حال دل کا
زباں چپ ہو تو چہرہ بولتا ہے
ہماری خشک آنکھوں پر نہ جاؤ
کہ باطن میں تو دریا بولتا ہے
سبھی اقدار ہو جاتی ہیں خاموش
جہاں کاغذ کا ٹکڑا بولتا ہے
سہارے جب بھی چپ ہو جائیں سارے
سہارا پھر خدا کا بولتا ہے
ابھی گاؤں میں ہے صبر و قناعت
وہاں راتوں کو چرخہ بولتا ہے
محبت کی ابھی قدریں ہیں باقی
ابھی بن میں پپیہا بولتا ہے
وہاں ممکن نہیں میری رسائی
جہاں تیرا ستارہ بولتا ہے
چلوں تنہا تو مجھ سے چپکے چپکے
تری باتیں ہی رستہ بولتا ہے
مرے دل کی منڈیروں پر تو اب بھی
تری یادوں کا کاگا بولتا ہے
نجانے کیوں بُرا لگتا ہے جو بھی
ترے بارے میں اچھا بولتا ہے
سکوںؔ ہوگا سویرا بھی یقیناً
ابھی تو گھپ اندھیرا بولتا ہے

رشک خلیلی

○

ں ایک شہر میں جاؤں کہاں اماں کے لیے
ست و ریخت بھی لازم ہے ہر مکاں کے لیے

ں دواں ہوں شب و روز کارواں کے لیے
نشاں ہے بہت مجھ سے بے نشاں کے لیے

حادثات گزرتے ہیں، یاد رکھتا ہوں
ں اپنی عمرِ گریزاں کی داستاں کے لیے

ی بحال ہے امید کامیابی کی
ی ہے وقت کسی سعیٔ رائیگاں کے لیے

ں اہلِ درد کا انداز ہی بدل دوں گا
ر مجھے کوئی موقع ملا فغاں کے لیے

لمحہ گزاریں گے زندگی کب تک
ائیں کرتے ہیں جو عمرِ جاوداں کے لیے

ھی کبھی بڑی شدّت سے میں یہ سوچتا ہوں
بات ہوتی ہے کیا مرگِ ناگہاں کے لیے!

○

ہر مکاں کا دروازہ، ہر مکاں کا رستہ ہے
اہلِ شہر کہتے ہیں، شہر ایسے بستا ہے

رنج و غم کے ماروں میں یہ تو دیکھنا ہوگا
کون دل گرفتہ ہے، کون دل شکستہ ہے

ہر گلی کے نکڑ پر گونجتے ہیں آوازے
یہ پتہ نہیں چلتا کون کس پہ ہنستا ہے

ایک خود فریبی ہے ایسی آرزو کرنا
پیاس جب بھڑکتی ہے، ابر کب برستا ہے

نبض دیکھ کر کوئی یہ بتا نہیں سکتا
کس کا خون مہنگا ہے، کس کا خون سستا ہے

ایسا وار کرتا ہے زندگی کا زہر آخر
آدمی کا سایہ ہی آدمی کو ڈستا ہے

رشکؔ، ہجر کی شب کا یہ عذاب کیا کم ہے
خواب دیکھنے والا خواب کو ترستا ہے

رُوحی کنجاہی

○

لے کے اک روز تیرے غم کی آڑ
کاٹنے ہیں مجھے دکھوں کے پہاڑ
بستیاں پھر نہ بس سکیں اس میں
مری دنیا نہ اس طرح بھی اجاڑ
سازشوں سے نہ کام لے پیارے
سامنے آ، مقابلے میں پچھاڑ
نہ رہوں تیرے کام کا، غمِ دہر
اپنے پنجے نہ یوں بھی دل میں گاڑ
میں بغاوت پہ ہو چلوں مجبور
غَلَطی پر نہ اس قدر بھی لتاڑ
جانے کب میرے بخت جاگ اُٹھیں
آنکھ ہے اور تیرے در کے کواڑ
دل سنبھلتا دکھائی دیتا نہیں
پڑ گئی اس میں جانے کیسی دراڑ
بات میں بات بھی تو ہو کوئی
بے سبب چیخ مت، گلا مت پھاڑ
کُھلی چھُٹی ہے تجھ کو اے رُوحی
کچھ بنا مجھ کو چاہے اور بگاڑ

○

وہ دریا پیتا رہتا ہے
سمندر کتنا پیاس
مٹے گی کب زمیں کی بھُوک
بشر تک اس کا کھا
نگاہِ ابر کہتی ہے
سمندر ایک قطر
دیئے کی آنکھ میں روشن
کوئی خورشید جیس
مسافر سے کہو کوئی
ستارا راہ تکت
جدا پھر ہو رہا ہے کون
یہ لمحہ آشنا
اگر ہو تُند صرصر تو
شجر بھی ایک
گھٹن بڑھ جائے تو آندھی
ہوا کا ایک جھ
ہماری رائے میں رُوحی
یہ دنیا اک عجوبہ ہے

شوکت ہاشمی

○

صبح کو ایک مُٹھی ہَوا بھیج کر، شام کو آنکھ بھر آسماں بھیج کر
اپنا گھر، اپنی بستی بچاؤں گا میَں زندگی کی سپاہِ اماں بھیج کر
لشکرِ روشنی کی کمک کے لیے شب کے اگلے محاذوں پہ رکھتا مجھے
پھر اُسی نے مجھے سُرخرو بھی کیا، فجر کے وقت تیغِ اذاں بھیج کر
مَیں تہی دَست دشمن سے لڑتا نہیں، سو، یہی کچھ ہُوا آج کی شام بھی
اپنے دُشمن کو شاباش دیتا رہا اپنے تیر اور اپنی کماں بھیج کر
میرے لشکر کے پہلے جواں کی جبیں جس پہ گردِ غم و بے یقینی نہیں
میرا ایمان ہے، جنگ جیتوں گا مَیں، اپنے لشکر کا پہلا جواں بھیج کر
اُس نے خوشبو کی بے حُرمتی بھی تو کی، وہ فقط دشمنِ رنگ ہی تو نہ تھا
کاغذی پھُول بھی بانٹنے آگیا، میری بستی میں خوفِ خزاں بھیج کر
جنگِ ایمان میں، جنگِ ایقان میں، جنگِ وجدان میں، جنگِ عرفان میں
مجھ سے ہارے گا وہ عین مَیدان میں، اپنی بے کار فوجِ گُماں بھیج کر
اِک نیا شہر تعمیر کر دوں گا مَیں، اِک نیا شخص تصویر کر دوں گا مَیں
وقت پھر اِک دفعہ آزمالے مجھے، آگ اور خُون کے درمیاں بھیج کر
اس مسافت میں ناکام ہونے کا غم، اک بڑا راز ہے، سو، بتائیں گے ہم
اِک سفیرِ ہَوا جو مددگار تھا، سو گیا اَن کھُلے بادباں بھیج کر
اے زمانوں کی بھیدوں بھری وسعتوں میں ہُمکتے کُرو! جاگتے منطقو!
میں نیا حرفِ کُن وِرد کرتا ہوا آگیا نقشِ سیّارگان بھیج کر
خُوشنما خُوشنما مسکراتے ہوئے لوگ اچھے لگے، پھر بھی ایسے لگے
جیسے معصوم بچے ہنسیں ہاشمیؔ، جھیل میں کاغذی کشتیاں بھیج کر
کوئی سوغاتِ اَبر و ہَوا بھیجتے، ہم سے واماندگانِ سفر کے لیے
مطمئن ہو گئے آپ بھی ہاشمیؔ، دھوپ کے شہر میں سائباں بھیج کر

کاوش بٹ

○

زمانہ آج بھی اس کی مثال دیتا ہے
وہ جس کا ذکر اچھوتے خیال دیتا ہے

عجیب مزاج کا مالک ہے وہ پری پیکر
جو بات آج کی ہے، کل پہ ٹال دیتا ہے

وہ خوش خرام ملے جب وفا کے رستے میں
محبتوں کے سمندر اچھال دیتا ہے

اداسیوں کا سبب جب بھی پوچھنا چاہا
وہ مسکراتا ہے، الجھن میں ڈال دیتا ہے

اسے پسند نہیں ہے کسی کی دل شکنی
کہ نا اُمید کو عہدِ وصال دیتا ہے

وہ بے نیاز ہے بارش کے موسموں کی طرح
خوشی کسی کو، کسی کو ملال دیتا ہے

○

ہم اداس لوگوں کی زندگی حوالہ ہے
تیرگی مقدر ہے، روشنی حوالہ ہے

ان کی بزم عشرت میں ایسے لوگ ملتے ہیں
معترف وفا کے ہیں، دشمنی حوالہ ہے

یہ دلیل کافی ہے اپنے گھر ہے سناٹا
جگمگاتے کمروں کی خامشی حوالہ ہے

کل بھی تیری الفت کا اعتراف کرتے تھے
آج بھی کرم تیرا، دائمی حوالہ ہے

منفرد ہیں بستی میں ہم سخن حوالے سے
کاغذوں کی زینت میں شاعری حوالہ ہے

افتخار مغل

○

ہمارے بس میں نہیں یہ مضاربہ کرنا
ٹھن ہے، زندگی! تجھ سے معاملہ کرنا

ہی کہ اُس نے مرا اعتماد توڑ دیا
س اتنی بات پہ اب اُس سے کیا گلہ کرنا

جو وہ نہ ہوتا کوئی اور بے وفا ہوتا
ہ سہل بات نہیں پیار مشغلہ کرنا

نہیں، کہ تم کو سبھی چاند ہی بتائیں گے
جو خود کو دیکھنا تو مجھ کو آئنہ کرنا

ہر ایک شخص نہیں ہوتا افتخار مغل
کبھی جو لوٹنا تو مجھ سے رابطہ کرنا

○

نہیں، یوں بھی نہیں ہے، ہم اُسے سوچا نہیں کرتے
مگر، یادوں کے پرچم دھوپ میں کھولا نہیں کرتے

مرے سب چاند، سُورج اور زمینیں بک کے بھی کم ہیں
تم اپنی آنکھ کا چانن ذرا سستا نہیں کرتے

کہ تم نے خود مجھے بھی مجھ سے منہا کر دیا جا کر
بچھڑتے سب ہیں لیکن اس قدر تنہا نہیں کرتے

تمہارے شہر میں ہر ایک شے کی ایک قیمت ہے
ہمارے گاؤں میں ناموس کا سودا نہیں کرتے

وہ کچی نیند میں ٹوٹے ہوئے اک خواب کا ٹکڑا
اُسے ہم دل بنا کر رکھتے ہیں میلا نہیں کرتے

(آزاد کشمیر)

ایوب خاور

○

نوسوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مر جائے گا
اند اک قبر کے سینے میں اتر جائے گا

جو اک خواب سا پلکوں سے بندھا رکھا ہے
نکھ نم ہو گی تو دامن میں بکھر جائے گا

بحر کی ریگِ رواں ساتھ لیے پھرتی ہے
س خرابے میں بھلا کون، کدھر جائے گا

حُسن اور عشق کے مابین ٹھنی ہے اب کے
س لڑائی میں کسی ایک کا سر جائے گا

تجھ کو دیکھا ہے کچھ اس طرح کہ اے صورتِ ماہ
ہاتھ دل پر جو نہ رکھا تو ٹھہر جائے گا

دیکھنا! ایک نہ اک دن تری خوشبو کا جمال
درد کی طرح رگِ جاں سے گزر جائے گا

یہ مری عمر کا صحرا، مرے دجلوں کا سراب
تہہِ مژگاں نہ رہے گا تو کدھر جائے گا

○

بات یہ تیرے سوا اور بھلا کس سے کریں
تو جفا کار ہوا ہے تو وفا کس سے کریں

آئینہ سامنے رکھیں تو نظر تو آئے
تجھ سے جو بات چھپانی ہو کہا کس سے کریں

زلف سے، چشم و لب و رُخ سے کہ تیرے غم سے
بات یہ ہے کہ دل و جاں کو رہا کس سے کریں

تُو نہیں ہے تو پھر اے حُسنِ سخن ساز! بتا
اِس بھرے شہر میں ہم جیسے ملا کس سے کریں

ہاتھ اُلجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب بتا، کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں

تُو نے تو اپنی سی کرنی تھی سو کر دی خاورؔ
مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس کا گلا کس سے کریں

عباس تابش

○

پسِ غبار مدد مانگتے ہیں پانی سے
یہ لوگ تنگ ہیں مٹی کی حکمرانی سے

یہ ہاتھ سوکھ کے جھڑنے کو ہو گئے لیکن
میں دست کش نہ ہوا تیری مہربانی سے

پھر اُس کے بعد پھلوں میں مٹھاس آئی نہیں
شجر نے کام لیا تھا غلط بیانی سے

کسی جزیرے پہ شاید کھلا ہے باغ کوئی
مہک گلاب کی آتی ہے بہتے پانی سے

میں تیرے وصل کا لمحہ بچا سکوں شاید
مرا تعلقِ خاطر ہے رائیگانی سے

پہنچ چکے ہیں محبت میں اُس جگہ ہم لوگ
جہاں یقیں نہیں آتا یقیں دہانی سے

یہ داغِ عشق کہ اب دل سے مٹ نہیں سکتا
کہیں یہ نقش بنایا تھا میں نے پانی سے

ترے وصال کے موسم میں اُستوار ہُوا
کوئی عجب سا تعلق جہانِ فانی سے

○

یونہی نہیں یہ راستے پھولوں سے ڈھک گئے
سُنتے ہیں رفتگاں یہاں دامن جھٹک گئے

کس رات دن چڑھا تھا، ہمیں کچھ پتہ نہیں
یہ اُن سے پُوچھ جو ترے ہجراں میں تھک گئے

میں دنگ رہ گیا اُنہیں اک ساتھ دیکھ کر
ہائے یہ لوگ عشق میں اظہار تک گئے

تُو کیوں پڑا ہے میرے مقدر کے کھیل میں
یہ وہ سفر ہے جس میں ستارے بھٹک گئے

یہ غم ہیں یا شرارتی لڑکے ہیں شہر کے
جو شاخ پھلنے آئی، یہ اُس سے لٹک گئے

افتخار بخاری

○

میشہ تو زمانے میں کوئی رشتہ نہیں رہتا
سی سے کیا گلہ، خود آدمی اپنا نہیں رہتا

پھر ایسے حادثے بھی زندگی میں ہوتے دیکھے ہیں
لہ انساں بچ تو جاتا ہے مگر زندہ نہیں رہتا

سرابوں کی حقیقت شام ہو جانے پہ کُھلتی ہے
مگر تب لوٹ جانے کا کوئی رستہ نہیں رہتا

عجب ساتھی ہے، دکھ کی دھوپ ہی میں ساتھ چلتا ہے
کہیں چھاؤں ذرا آئے تو پھر سایہ نہیں رہتا

پھر اپنے آپ سے اک گفتگو سی چل نکلتی ہے
کوئی انساں زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہتا

میں اپنے دل کے دروازے پہ اکثر اب بھی جاتا ہوں
مگر اِس گھر میں اب کوئی مرے جیسا نہیں رہتا

○

کچھ اور ہو، تجدیدِ محبت نہیں ہوتی
دوبارہ جو ہوتی ہے وہ بیعت نہیں ہوتی

ملتے ہیں ہم اُن سے بھی ترے نام پہ، دنیا!
جن سے ہمیں ملنے کی ضرورت نہیں ہوتی

ایسا غمِ ہجراں کا نشہ ہم کو لگا ہے
موقع بھی ہو، ملنے کی طبیعت نہیں ہوتی

بے فکر یہاں راج کر اے خوابِ تمنّا!
یہ دل ہے، یہاں کوئی بغاوت نہیں ہوتی

خود اپنا کفن بُننے پہ مامور ہوئے ہیں
زندہ ہیں مگر جینے کی فرصت نہیں ہوتی

یہ کون سے موسم کا اشارہ ہے خدایا!
کچھ دن سے کسی آنکھ میں حیرت نہیں ہوتی

ڈاکٹر اشرف عدیل

○

رہِ سفر پہ کہاں ہوں نقوش پاؤں کے
ہمارے ساتھ تھے کچھ سلسلے ہواؤں کے

میں کشتِ وقت میں پھیلا اُداس جنگل ہوں
مرے وجود سے منظر ہیں دھوپ چھاؤں کے

وہ مسکرائے تو یوں خد و خال روشن ہوں
نکلتے چاند میں جیسے مکان گاؤں کے

ابھی فقط سرِ دہلیز خوں کے چھینٹے ہیں
ابھی تو صاف ہیں دامن سبھی قباؤں کے

عدیلؔ دور سے بارش کی سمت پہچانیں
مزاج داں تھے ہم ایسے کہاں، فضاؤں کے

ارشاد شاکر اعوان

○

کام آئے مرے، گردشِ ایام کبھی تو
چمکے ترا خورشید لبِ بام کبھی تو

سر سے یہ کڑی شام ٹلے بھی کسی صورت
وہ صبحِ درخشاں ہو مرے نام کبھی تو

پھیلے ترے چہرے کی شفق بن کے سحر بھی
مہکے تری زلفوں کی خنک شام کبھی تو

اک نشترِ غم یوں، کہ رگِ جاں میں اُتر جائے
اے راحتِ جاں! عیش کا پیغام کبھی تو

دیکھیں گے کبھی تو ترے محبوبؐ کا روضہ
پہنیں گے حرم والے! ہم احرام کبھی تو

چمکے گا کسی روز نصیب اپنا بھی شاکرؔ
ہونا ہے اس آغاز کا انجام کبھی تو

سعید احمد

○

بچھڑی ہوئی اک روح سے رشتہ نہیں ٹوٹا
دن بیت گئے شہر کا سکتہ نہیں ٹوٹا

کس طور سے بستی ہوئی مسمار، اے دریا!
ٹوٹے ہوئے خوابوں کا گھروندا نہیں ٹوٹا

روئے تو ذرا نرم سی آواز میں رونا
گھر ٹوٹ گیا، کانچ کا پیالہ نہیں ٹوٹا

پھر شام کے چوپال میں دکھ درد ہوئے جمع
پھر صبح تلک ہیر کا قصّہ نہیں ٹوٹا

تابوت اٹھائے ہیں جواں مرگ ہوا نے
کیسے کہیں، بوڑھوں کا بڑھاپا نہیں ٹوٹا

اس بار تو مدفون ہوئی کہکشاں ساری
اس بار کوئی ایک ستارہ نہیں ٹوٹا

دیکھے ہیں بہت وار، دسمبر! ترے لیکن
ذی ہوش کوئی پہلے تو ایسا نہیں ٹوٹا

سگرٹ بھی بہت، چائے بھی باتیں بھی بہت ہیں
لیکن وہ جو اک درد کا دھارا نہیں ٹوٹا

○

کیسی لہو لکیر کو ہاتھ سے دھو رہی تھی ش
ابر کی اوٹ میں کہیں، صبح سے رو رہی تھی ش

پل میں خیال کے بھنور پار وہ کر گئی اُدھ
ساحلِ چشم پر اِدھر خون بلو رہی تھی ش

اس کی نمو ابد تلک ہر کسی دل کے صحن پ
تازہ ہوا کے کھیت میں درد جو بو رہی تھی ش

اس نے فنا کے ہاتھ پر ثبت کیے ہیں دست
ظلمتِ دشتِ خواب میں تارے جو ڈھو رہی تھی ش

اس کے بیاں کے پیڑ پر پات بھی سو طرح کے
کوئے فراق میں امر آج جو ہو رہی تھی شا

کیسے وہ ہڑبڑا کے آج جاگ اٹھی ہے ناگہا
ایک ازل کے روز سے مجھ میں جو سو رہی تھی شا

گھر نہ پلٹ کے آسکا دھیان جنازہ گاہ
صبح کھلی تھی قبر میں، شہر میں ہو رہی تھی شا

اشرف جاوید

○

بہر سو حبس کا موسم بہت ہے
پرندوں میں مگر دم خم بہت ہے

ابھی ممکن نہیں ہے قحط سالی
ابھی بطنِ زمیں میں نم بہت ہے

سوا نیزے پہ سورج ہے، تو کیا ہے
تمھارے ہاتھ کا پرچم بہت ہے

کھلا ہے بادباں تو رُک گئے ہیں
سمندر کا سفر مبہم بہت ہے

سرِ آفاق جاں کِھلتا ستارا
اشارہ ہے مگر مدھم بہت ہے

تہی الفاظ ہیں جذبے لبوں پر
ابھی شہرِ نظر میں دم بہت ہے

دریچوں میں سحر کِھلنے لگی ہے
ہوائے شب کا لمحہ کم بہت ہے

○

خواب سوچوں، خواب کی تعبیر لکھوں
زخم ناپوں، زخم کی تاثیر لکھوں

چشمِ نم کے آئینے میں لمحہ لمحہ
خود کو دیکھوں اور تری تصویر لکھوں

تیری نسبت سے دھنک کے رنگ روشن
موسموں کو بھی تری جاگیر لکھوں

پھر پسِ خوشبو کھلے ہیں نقش تیرے
پھر نگاہِ لمس کو تعزیر لکھوں

خود کو توڑوں ریزہ ریزہ اپنے ہاتھوں
اور اس تخریب کو تعمیر لکھوں

محمد فیروز شاہ

○

تو کیا بیٹوں سے مائیں دور ہوتی جا رہی ہیں!
کہ ماؤں سے دُعائیں دور ہوتی جا رہی ہیں!

یہ دُکھ پیڑوں کی شاخوں میں اترتا جا رہا ہے
پرندوں کی صدائیں دور ہوتی جا رہی ہیں

قیامت کی ہراول ساعتوں میں جی رہے ہیں
تمدن سے وفائیں دور ہوتی جا رہی ہیں

یہ کیسا موسمِ ہجراں ہُوا رشتوں پہ طاری
کہ خوشبو سے ہوائیں دور ہوتی جا رہی ہیں

یہ آبِ چشم کے بے آب ہونے کا ثمر ہے
سروں پر سے ردائیں دور ہوتی جا رہی ہیں

زمیں، فیروزؔ، مالا مال ہو جاتی تھی جن سے
وہ برکھا کی ادائیں دور ہوتی جا رہی ہیں

○

فنا کے شہر میں مقتول بن کر زندہ رہتی۔
انا، فیروزؔ، اک معمول بن کر زندہ رہتی۔

محبت اِک اُجالا ہے، محبت ایک خوشبو۔
نظر میں نور، دل میں پھول بن کر زندہ رہتی

فلک آباد رستوں پر گواہی کہکشاں کی۔
کسی کی چاپ روشن دھول بن کر زندہ ر

گذرتی راکھ ہوتی ساعتوں میں بھی ہے چ
تمنا حرفِ نامقبول بن کر زندہ رہتی۔

جوازِ ناز بن جاتے تھے جس کے لمس سے
وہ ساعت دل میں اب اِک پھول بن کر زندہ ر

خزاں کے جبر سے بے حال ہوتے زرد پیڑوا
ہری رت خواہشِ معقول بن کر زندہ رہتی۔

یاسمین گل

○

تو اُس کے لہجے پر گماں کچھ اور ہی تھا
ت میں وہ آیا تو بیاں کچھ اور ہی تھا

شوق کا ہر رنگ اُڑ جاتا نہ کیسے
کچھ اور سوچا تھا، وہاں کچھ اور ہی تھا

پنی آنکھ میں منظر سجا کر چل پڑے تھے
رے پار تو دیکھا، سماں کچھ اور ہی تھا

، سے خوش کلاموں سے ملے، تب ہم نے جانا
حرف میں وہ کم زباں کچھ اور ہی تھا

کیا کیا فسانے موسموں کی چپ کے لیکن
بولی تو رنگِ داستاں کچھ اور ہی تھا

بھی شخص کی ہم پر نہ کھل پائی حقیقت
ا پہ اور کچھ، زیرِ زباں کچھ اور ہی تھا

○

وہی تو یہ راز جانتا ہے کہ شرحِ اصلِ جمال کیا ہے
میں سات رنگوں میں بھیگتی ہُوں تو اِس میں میرا کمال کیا ہے

عجیب نشے میں جُھومتی ہے پہاڑ کی سربلند چوٹی
زمیں نے بادل کو چھُو لیا ہے، نہ بھیگنے کا سوال کیا ہے

وہ دُور جنگل میں ایک غنچہ لچکتی شاخوں پہ کیوں کھلا ہے
جو پیشِ حُسنِ نظر نہیں ہے تو خوبیٔ خدوخال کیا ہے

یہ چاند کی اتنی پوری نظروں میں، گہری نظروں میں کیا کشش ہے کیونکہ ان
سمندروں کی ہتھیلیوں پر یہ پانیوں کا اُچھلنی کی بھی تحریر میں
تحریر پڑھی ہی نہیں۔ وہ نیٹشے
اُسے خبر ہے تو یہ، کہ جیسے کا بھی صرف اردو ترجمہ پڑھا ہے۔ اسی
مگر کسی کو رہے؟ "ابواب کی درجہ بندی" سے متصف اور "غیر

ثروت محی الدین

○

زمانے میں وفاؤں کے قرینے اب نئے ہوں گے
نباہی جائیں گی رسمیں پرانی، ڈھب نئے ہوں گے

وفورِ عشق والفت میں، جنونِ شوق ومستی میں
وہی انداز ہوں گے، پر سلیقے سب نئے ہوں گے

نئی نسلیں وہی دیرینہ شکوے لے کے آئیں گی
بزرگوں کے دعائیں دینے والے لب نئے ہوں گے

گزرنا وقت کو ہر طور ہے، موسم تو بدلے گا
مگر اشجار پر کھلتے شگوفے تب نئے ہوں گے

مسافت گو کٹھن تھی، جانی پہچانی تو تھی، لیکن
گزر جن راستوں پر اب کے ہوگا، سب نئے ہوں گے

سکھائیں مصلحت اندیشیاں خوفِ عقوبت نے
نہ جانے ڈھنگ میرے سوچنے کے کب نئے ہوں گے

تصدق شعار

○

تصوف کی طرف کچھ لکھنے والے ہو
کہ اب اُن کے برابر اُن کے بچے ہو

نہیں کر پائے اپنی بیٹیوں کے ہا
مگر محنت کشوں کے رنگ پیلے ہو

نجانے کتنی اُمیدوں سے میرا گھ
مرے ماں باپ اب یکسر اکیلے ہو

خدارا، اب تو اپنے چٹکلوں سے با
کہ سائل بیٹھے بیٹھے رونے والے ہو

اگرچہ آئینہ خانوں پہ آئی ہیں خزا
مگر شیشہ گروں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو

بہت دشوار ہے ان کی صفوں کا ایک
کہ اب سارے مسلماں ایک جیسے ہو

ابرار احمد

○

رنج ہے، زندگی ہے، مہلت ہے
اور کس چیز کی ضرورت ہے

تُو غمِ دستِ نارسا مت کر
راحتِ دید بھی غنیمت ہے

ہم تہی دست ہیں سراپا طلب
اور ہر شے کی ایک قیمت ہے

تم جہاں ہم سے مل رہے ہو، وہاں
دور تک عرصۂ قیامت ہے

تم جہاں پھول چننے آئے ہو
خوشبوؤں کی وہاں سے ہجرت ہے

ہم طلسمِ نگاہ کے ہیں اسیر
ورنہ مٹی کی ایک رنگت ہے

کم نظر ہم نہ تھے مگر یوں ہے
یہ جو دنیا ہے، اس میں رغبت ہے

دل نہیں، دل میں اب وہ غم بھی نہیں
پھر بھی کہنے کی اک حکایت ہے

زحمتِ پرسش و کرم اب کیا
اب تکلّف کی کیا ضرورت ہے

ہم نہیں تیرے بندگاں میں تو کیا
تیرے قبضے میں ایک خلقت ہے

یہ اسیری نہیں، رہائی نہیں
یہ تو کچھ اور ہی مصیبت ہے

کھول دے آنکھ، دیکھ لے تو بھی
جو تری نیند میں کرامت ہے

ہم تو اب یہ بھی کہہ نہیں سکتے
ہم کو تیری بہت ضرورت ہے

سید عباس احمد

○

اب ہمیں خیالوں کے سلسلے ستاتے ہیں
موج موج اکثر ہم خود میں ڈوب جاتے ہیں

پھول پھول منڈلا کر تتلیاں ٹھٹھرتی ہیں
خوشبوؤں کی بارش میں پنکھ بھیگ جاتے ہیں

ریت کا اُچھلنا کیا موج کا لپکنا ہے!
دشتِ تشنگی میں ہم کیوں فریب کھاتے ہیں

مانجھیوں کے گیتوں سے دور کس طرح جائیں
ہم قریبِ ساحل ہی کشتیاں چلاتے ہیں

ہم غبارِ جادہ میں، تھوڑی دور تک اکثر
ایک اک مسافر کے ساتھ ساتھ جاتے ہیں

جمشید چشتی

○

اُجالا روح تک پھیلا ہوا ہے
ابھی سورج کا دم اٹکا ہوا ہے
پلٹ کر دیکھ عکسِ رنگِ فردا!
پسِ گُل، آئینہ رکھا ہوا ہے
ستارے ہیں کہ فطرت نے فلک پر
ہمارا زائچہ کھینچا ہوا ہے
پرندوں کی اُڑانیں کہہ رہی ہیں
ہوا نے پھر سے رُخ بدلا ہوا ہے
جہاں پہنچا نہیں کوئی، وہاں بھی
خیالِ نارسا پہنچا ہوا ہے
لکیروں میں کوئی سا رنگ بھر دو!
ابھی دستِ گدا پھیلا ہوا ہے
خدایا! کون محرومِ جزا تھا
سزا سے کون مستثنیٰ ہوا ہے
سمجھ لی ہے کسی نے بات میری
کسی دیوار میں در، وا ہوا ہے
سمندر کیا ڈبوئیں گے اب اس کو
دل اپنے آپ میں ڈوبا ہوا ہے
یہ مجبوری نہیں تو کیا ہے جمشید
دُعا کو ہاتھ پھر اُٹھا ہوا ہے

آصف محمود باسط

◆

گھر سے باہر کہ گھر کے اندر ہو
اِک ٹھکانہ تو گھر سے بہتر ہو

عین ممکن ہے دن قیامت کا
ہجر کی رات کے برابر ہو

تم نہ چہروں کو دیکھتے رہنا
جانے کیا آدمی کے اندر ہو

سب تجھے ہی تلاش کرتے ہیں
بس سے پوچھیں کہ تم کہاں پہ ہو

ل جزیرہ دلوں میں ہوتا ہے
بار جانب اگر سمندر ہو

◆

چہرہ دل کی کتاب ہوتا ہے
آنکھ میں انتساب ہوتا ہے

بیٹھ کر محفلوں میں ہنسنا تو
غم کا اوجِ شباب ہوتا ہے

خامشی جبر کی علامت ہے
لفظ اک انقلاب ہوتا ہے

عالمِ وصل و ہجر دونوں میں
ایک سا اضطراب ہوتا ہے

ایک صحرا ہے زندگی آصف
پیار بھی اِک سراب ہوتا ہے

اختلافات

**محمد ارشاد' شہزاد منظر' خاور نقوی' شعیب آفریدی' آصف ثاقب' رشید ملک'
ارشد عروج' احمد حسین مجاہد' محمد اشفاق' خیرالدین انصاری**

فنون نمبر ۴۵

"مجذوب فرنگی" پر جناب عامر سہیل کے اعتراض کے جواب میں' میں نے خلیل بن احمد (بانی علم عروض) کے اشعار لکھ دیئے تھے۔ ان اشعار سے انہوں نے یہ تاثر ضرورت سے زیادہ سنجیدگی سے لیا کہ انہیں واقعی جاہل سمجھ لیا گیا ہے۔ اس تاثر کو زائل کرنے کے لیے نیطشے کے بارے میں معلومات کی نمائش ضروری تھی اور نمائش معلومات کے لیے بہانہ درکار۔ میں نے نیطشے کی تفہیم میں بعض مشکلات کا ذکر کیا تھا۔ مشکلات کا اظہار عجز کا اظہار تھا۔ میرے اظہار عجز سے انہیں موقع مل گیا۔ نیطشے کے بارے میں مشکلات مجھے کبھی پیش نہ آتیں اگر میں "معروضی انداز نظر اپناتے ہوئے اس مجذوب فلسفی کے افکار کی غواصی کرتا۔" چونکہ اس میں ایسا نہیں کرسکا اس لیے میرے "اخذ کردہ نتائج موضوعیت کا شکار ہیں۔" یہ کام خود انہیں کرنا پڑگیا اور[1] غواصی کے بعد جو موتی انہوں نے برآمد کئے واقعی نادر ہیں۔ مثلاً "نیطشے کی فکر کا محور فوق البشر (سپرمین) ہے۔ وہ مختلف موضوعات پر بات کر کے بالاخر اپنے من پسند موضوع کی جانب لوٹ آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے افکار میں وحدت کا رشتہ تلاش کرنا کچھ ایسا مشکل نہ تھا کہ جنون کی حالت میں لکھنے کے بعد بھی یہ خواہش کرتا کہ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔"

یہ موتی اس لیے نادر ہے کہ نیطشے کے سبھی سوانح نگار آج تک اس غلط فہمی میں ہیں کہ جنون کی حالت (۵ جنوری ۱۸۸۹ء تا ۲۵ اگست ۱۹۰۰ء) میں اس نے کوئی کتاب یا مضمون نہیں لکھا۔ اب "بہتر معلومات فراہم" ہو جانے کے بعد انہیں اپنی معلومات پر نظرثانی کرنی پڑے گی۔ لیکن ہمارے محقق کا مطلب یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ نیطشے شروع ہی سے پاگل تھا۔ یہ مطلب زیادہ نادر ہے۔ اس صورت میں نیطشے کے سوانح نگاروں کا یہ بیان مشکوک اور محل نظر ٹھہرتا ہے کہ اسے پہلی بار جنون کا دورہ ۵ جنوری ۱۸۸۹ء کو پڑا اور تادم آخر قائم رہا۔ بہرحال "نیطشے کے افکار میں وحدت کا رشتہ" موجود ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ "اس نے اپنی دو اہم تصانیف Thus Spoke Zarathustra اور Beyond Good and Evil کو مقدور بھر واضح اور منظم پیرائے میں تحریر کیا ہوا ہے۔ ان کی درجہ بندی باعتبار موضوع کی ہے اور ابواب کی اسی درجہ بندی نے نیطشے کی فکر کو منتشر ہونے سے بچایا ہوا ہے۔"

---

[1] [illegible] میں ' اقبال اور نیطشے ' قسم کے مضامین پڑھ کر بالکل یہی خیال میرا بھی نیطشے کے بارے میں ہوا کرتا تھا' م۔ ا

ہر چند یہی خصوصیات نیطشے کی دیگر تصانیف میں بھی موجود ہیں لیکن انہوں نے انہی دو کا حوالہ مرف اس لیے دیا ہے کہ انہیں یہ پتہ چل ہی گیا ہے کہ میں نے صرف یہی دو کتابیں دیکھی ہیں۔ میری ہولت مد نظر تھی۔ پس:

قصہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود

قصہ کوتاہ یہ کہ "نیطشے نے اپنے غیر مبہم اسلوب کے ذریعے ایک ایسے طرز تحریر کی طرح ڈال دی ہے جو علم فلسفہ میں ابلاغ کے تقاضوں کا امین ہے۔ نیطشے کا اسلوب رنگین اور تلخ ضرور ہے لیکن اس کی وجہ ے اس کے افکار تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی۔"

پھر بھی "واضح اور منظم پیرائے میں تحریر، باعتبار موضوع درجہ بندی" سے متصف اور "غیر مبہم سلوب" کی حامل "ابلاغ کے تقاضوں کی امین" نمایاں ترین مثال کے بارے میں ہائیڈیگر یہ کہہ رہا ہے کہ ج تک کوئی مفکر ایسا پیدا ہی نہیں ہوا جو اس کتاب کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس کے بنیادی فکر تک سائی حاصل کرسکا ہو، اس کا کنہہ کا ادراک رکھتا ہو:

Thus Spoke Zatathustra : A Bookd for Every one and No On
In What uncanny fashion the subtitle has come true in th seventy year of its first appearance __ though precisely in reverse order. It ha bceome a bookf for everyman and to this day no thinker has appeare who is equal to its fundamental thought and able to assess the ful significance of its origin.

لیکن ہائیڈیگر کا بیان آج سے چالیس سال پہلے کا ہے۔ اس وقت عامر سہیل موجود نہیں تھے۔ اب وجود ہیں اور اپنے دعوے کے مطابق اس اہلیت سے محروم نہیں۔ انہیں نیطشے "کے افکار تک رسائی حاصل لرنے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی۔" ہائیڈیگر کے بیان کا جواب انہوں نے پہلے ہی دے دیا ہے کہ چلیں ایک لمحے کے لیے مان لیتے ہیں کہ ہائیڈیگر نیطشے کو سمجھنے میں ناکام رہا لیکن کیا برٹرینڈرسل[۱]، ول یوارں[۲]، ہولنگڈیل[۳]، بٹیلے[۴]، برٹن[۵]، ہیملین[۶]، ٹی مین[۷]، کافمین[۸]، لی[۹]، مارگن[۱۰]، ریبرن[۱۱] (اور) غیرہ[۱۲] (عامر سہیل) بھی اس میدان میں طفل مکتب ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ شکایت نہیں کی کہ اس سفی کی فکر کو سمجھنا دشوار ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں۔"

اور ان میں سے کسی نے دشواری کی شکایت کی بھی ہے تو بھی عامر سہیل صاحب سچے ہیں، کیونکہ ان کے اس بلند بانگ دعوے کی بنیاد اس زیر لب بیان حلفی پر ہے کہ انہوں نے ان میں سے کسی کی بھی تحریر میں شواری کا ذکر نہیں پڑھا--- اس لیے کہ ان میں سے انہوں نے کسی کی کوئی تحریر پڑھی ہی نہیں۔ وہ نیطشے سے ول ڈیوراں کے مضمون کے ذریعے واقف ہیں اور اس مضمون کا بھی صرف اردو ترجمہ پڑھا ہے۔ اسی لیے وہ نیطشے کی جس کتاب کو "واضح اور منظم پیرائے میں تحریر، ابواب کی درجہ بندی" سے متصف اور "غیر

مبہم اسلوب" کی حامل "ابلاغ کے تقاضوں کی امین" نمایاں ترین مثال کے طور پر نشاط اعتماد اور انبساط غرور کے ساتھ پیش کر رہے ہیں، اسی کے بارے میں ول ڈیوراں کہتے ہیں:

Of all Nietzsche's books, Zarathustra is safest from criticism, partly because it is obscure and partly because its inexpugnable merits dwarf all fault-finding.

چونکہ انہوں نے صرف ول ڈیوراں کو پڑھا ہے اور وہ بھی اردو ترجمے کی صورت میں اس لیے ہو سکتا ہے کہ اس فقرے کا ترجمہ کتابت میں آنے سے رہ گیا ہو اور وہ نہ پڑھ سکے ہوں۔ اس لیے ان کا دعویٰ سچوں کا دعویٰ ہے۔ اور چونکہ وہ ول ڈیوراں کو بھی نیطشے شناس سمجھتے ہیں اور فہرست میں اسے دوسرے نمبر پر رکھا ہے، اس لیے قاعدۂ نسبت کا تقاضا ہے کہ درجن بھر نیطشے شناسوں کے نصف اول میں دوسرے (ول ڈیوراں[۴]) کے ساتھ نصف دوم میں دوسرے (کافمین[۸]) کا بیان دشواری بھی سن لیا جائے:

Plato wrote so dramtically that we shall never know for sure What precisely he himself thought about a number of questions. And Nietzsche furnishes a more recent and no less striking example. His philosophy can be determined but his brilliant epigrams and metaphors make it rather difficulf to do so, and to read him solely to reconstruct the world of his ideas would be obtuse[1] pedantry.

گویا کافمین بھی نیطشے کے اسلوب کو Epigramatic اور Metaphorical ہونے کی بنا پر تفہیم کو دشوار (Difficult) بنانے والا اور "اس کے افکار تک باآسانی رسائی" کو احمقانہ ڈینگ (Pedantry Obtuse) کہہ رہے ہیں۔ کافمین کا ذکر نسبت تناسب سے آگیا ہے۔ عامر سہیل صاحب کی فہرست میں اولیت برٹرینڈ رسل کو حاصل ہے اور ظاہر ہے کہ برٹرینڈ رسل کے بغیر پوری بات بھی ادھوری ہے۔ نیطشے کی تفہیم کا "حق" ادا کرتے ہوئے رسل لکھتے ہیں:

His 'noble' man, who is he himself in his day dreams _ is a being devoid of sympathy, ruthless, cunning, cruel, concerned only with his own power. King Lear, on the verge of madness, says: 'I shall do such things_ what they are I know not _ but they shall be the terror of the earth.' This is Nietzsches's philosophy in nutshell.

The Portable Nietzsche, Introduction, -1

برٹرینڈ رسل کے نزدیک نیطشے کے بیانات مخبوط الحواس کی گفتگو ہیں۔ چونکہ برٹرینڈ رسل نے ' عامر ہیل صاحب کی خوش قسمتی سے ' یہ وضاحت ضروری نہیں سمجھی کہ مخبوط الحواس کی گفتگو غیر واضح ' غیر مربوط ر مبہم ہوتی ہے اس لیے یہ بات ان کے لیے تسکین و تسلی کا موجب ہو سکتی ہے۔ مزید برآں وہ ٹرینڈ رسل کے اس بیان کو اپنے اس دعوے کی تائید اور ثبوت کے طور پر بھی پیش کر سکتے ہیں کہ نیطشے نے کچھ لکھا جنون کی حالت میں لکھا تھا۔ یہی طرزول ڈیوراں نے بھی "دی سٹوری آف فلاسفی" میں نیطشے پر کیا ہے جس کا اردو ترجمہ (از سید عابد علی عابد) پڑھ کر انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نیطشے جنون کی حالت میں لکھتا ہا۔ گویا:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا

معروضی انداز اپناتے ہوئے" بالآخر

؎ قد قراھا من لیس یحسن یقرا

(اس نے پڑھ ہی ڈالی جسے اچھی طرح پڑھنا بھی نہیں آتا)

نیطشے کے افکار کی تفہیم میں دشواری کی اصل وجہ یہ ہے کہ "نیطشے نے اپنا فلسفہ چونکہ صرف اص (جن میں عامر سہیل بھی شامل ہیں) کے لیے لکھا ہے اسی لیے وہ اپنی تحریروں میں لاطینی ' فرانسیسی ' اور سکرت (تو گویا عامر سہیل بھی ان پر عبور رکھتے ہیں) کے الفاظ و محاورات (جن کا ترجمہ تراجم میں موجود ہوتا ہے۔ م۔ ا) بھی بے تکلفی سے استعمال کر جاتا ہے۔[۱] شاید انہی وجوہات کی بنا پر ارشاد صاحب کو نیطشے کا لوب مشکل محسوس ہوا ہے۔" -- اور شاید انہی وجوہات کی بنا پر نیطشے کے فرانسیسی مترجم اور شارح Michel Haa کو بھی جو نیطشے کے اسلوب کی "آسانی" اور کثرت تعبیر کی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ں:

> How did all this come about? First of all, the apparent ease with Which he can be read _ an ease due to his seductive style (polemic, poetic, aphoristic) as well as what can pass for a lack of technical vocabulary __ gave rise to the illusion that this philosopher lay within an easy reach of everybody...... Finally if we line up the literary verisions of Nietzsche (in Mann, Musil, Junger, Borges) as well as strictly philosophical commentaries (by Heidegger, Jaspers, Fink, Klossowsky) we are faced with a disconcerting

---

[۱] سب سے زیادہ الفاظ و محاورات تو وہ جرمن زبان کے بے تکلفی سے استعمال کرتا ہے۔ معلوم نہیں اس کا ذکر کیسے رہ گیا۔ حال خواص وہ ہوئے جو لاطینی ' فرانسیسی اور سنسکرت جانتے ہیں۔ م۔ ا

diversity of interpretations testifying all the more how difficult it is to encompass the vast field opened up by Nietz sches's thought.

However, Nietzsche's inaccessibility might well derive from something more fundamental _ namely his strange and ambiguous language vis a vis the traditional language of philosophy.

اور اپنے عامر سہیل فرماتے ہیں۔ "اصل میں نیٹشے نے دانستہ اپنے اسلوب کو تجریدیت (؟) اور ابہام سے دور رکھا تاکہ لوگ (بیچارے لوگ) اس کے قلم کی کاٹ اور گہرائی کو محسوس کر سکیں۔ نیٹشے کی فکر اور اسلوب کے حوالے سے محمد ارشاد نے جن مشکلات کا ذکر کیا ہے وہ سب ان کی اپنی وضع کردہ ہیں۔ نیٹشے کا اسلوب رنگین اور تلخ ضرور ہے لیکن اس کی وجہ سے اس کے افکار تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی۔"

عامر سہیل صاحب کو تو واقعی دقت پیش نہیں آتی کہ وہ ارواح کو حاضر کرنے کا علم "جانتے" ہیں اور نیٹشے کی روح تو مستقل طور پر انہی کے آستانے پر حاضر رہتی ہے اس لیے نیٹشے کے بارے میں ان کا علم براہ راست ہے۔ جب جو چاہتے ہیں پوچھ لیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کا انحصار نیٹشے کے متون پر ہے وہ نیٹشے کے افکار میں وحدت کے فقدان اور ان کے عسیر الفہم ہونے کی شکایت کرتے ہیں۔

جبکہ بجا فرماتے ہیں عامر سہیل کہ "نیٹشے کے افکار میں وحدت کا رشتہ تلاش کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں" لیکن وہ یہ بھی تو سوچیں کہ تثلیث کے پجاری نیٹشے کے افکار میں "وحدت کا رشتہ" تلاش کر بھی کیسے سکتے ہیں۔ نیٹشے کے افکار میں "وحدت کا رشتہ" تو عامر سہیل سا موحد ہی تلاش کر سکتا ہے۔

کور پیوستہ نظر جانب بالا دارد

محمد ارشاد (ہری پور)

فنون کے شمارہ نمبر ۴۵ (جنوری۔ اپریل ۹۵ء) کے مضامین بہت وقیع اور افسانے، غزلیں اور نظمیں بہت معیاری ہیں۔ خلیل جبران کے بارے میں جناب محمد کاظم کا مضمون بہت پسند آیا۔ وہ عربی ادب کے بارے میں خوب لکھتے ہیں۔ میں خلیل جبران کے بارے میں بہت دنوں سے پڑھتا آیا ہوں یعنی جب سے شعور سنبھالا ہے، اس وقت سے۔ لیکن عربی ادب میں ان کی ادبی حیثیت، مقام اور قدروقیمت سے واقف نہ تھا۔ اس کا اندازہ جناب محمد کاظم کے مذکورہ مضمون سے ہوا اور یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اگر عربی ادب میں ان کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے اور وہ زبان و بیان کی بھی کوتاہیاں کرتے ہیں اور نثر بھی بری لکھتے ہیں تو وہ اس قدر مشہور اور مقبول ادیب کس طرح بن گئے؟ اور انہیں بعض حلقوں میں اتنی عظمت کیوں حاصل ہوئی؟

س کا مطلب یہ ہے کہ شہرت اور عزت دو مختلف چیزیں ہیں؟ اور ثقہ ادبی حلقوں اور ناقدوں کی مذمت کے وجود کوئی ادیب شہرت، مقبولیت اور عظمت (؟) کی بلند ترین چوٹی پر متمکن ہو سکتا ہے؟

جناب کاظم نے جدید عربی ادب کے پس منظر میں خلیل جبران کی تحریروں کے محاسن و معائب سے وب بحث کی ہے اور جبران کو صحیح تناظر میں پیش کیا ہے اور اس کی شہرت اور مقبولیت کے اسباب پر روشنی الی ہے۔ ان کی نظر میں جبران کی دیگر جدید عربی ادبا کے مقابلے میں زیادہ اہمیت نہیں ہے لیکن کیا یہ تاریخی سباب نہ تھے، جن کی وجہ سے جبران کو مغرب میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی؟ مثلاً مذہب بیزاری، آزاد یالی اور دنیا کے تمام سماجی اور معاشی مسائل سے بچنے کے لیے فطرت کی طرف لوٹ جانے کی خواہش وغیرہ۔ طرت کی جانب لوٹ جانے کا رجحان جبران کے علاوہ لارنس اور نٹ ہمنن اور دیگر مغربی ادبا میں بھی ملتا ہے۔ ن باتوں نے جبران کو مغرب میں مقبول بنایا۔ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ وہ عربی کے علاوہ انگریزی کا بھی صنف تھا۔ جس کی وجہ سے وہ مغرب کے قارئین اور ناقدین تک بہ آسانی رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ جو ادیب بائی لینگول ہو یعنی اپنی مادری زبان کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی لکھنے کی قدرت رکھتا ہو، اس کے دنیا بھر میں مشہور اور مقبول ہو جانے میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی۔ اگر جبران امریکہ کے بجائے لبنان یں رہتا اور صرف عربی زبان میں لکھتا تو کیا اسے وہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوتی جو امریکہ میں رہنے اور انگریزی میں لکھنے کی وجہ سے حاصل ہوئی؟ میرا خیال ہے، ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ اور پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وہ مذہباً" عیسائی تھا اور اسے اپنے اظہار کے لیے مغرب کا آزاد معاشرہ میسر ہوا تھا۔ وہ اگر مصر یا الجزائر میں پابند مسلم معاشرے میں ہوتا تو کیا اسے اظہار کی اسی قدر آزادی حاصل ہوتی جتنی امریکہ میں تھی؟ جبران کی مقبولیت کی وجہ اس کا مخصوص اسلوب اور زور بیان بھی ہے۔ (خواہ یہ اسلوب انجیل سے مشابہ کیوں نہ ہو) اس اسلوب نے اسے نیم فلسفی بنا دیا۔ اس مضمون سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تخلیقی ادیب نقد و نظر کی ساری پابندیوں اور معائر سے بلند ہوتا ہے اور وہ اگر غیر معمولی صلاحیت کا حامل ہو تو نقادوں کی نکتہ چینیوں کے باوجود اپنی اہمیت منوا لیتا ہے، خواہ اسے عظمت حاصل ہو یا نہ ہو؟ خلیل جبران کی اہم تصانیف کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو میں اس کے اسلوب سے سب سے زیادہ قاضی عبدالغفار متاثر تھے۔ بہرحال! اتنا اچھا مضمون لکھنے پر جناب محمد کاظم مبارک باد کے مستحق ہیں۔

افسانوں میں اطہر شاہ خاں کا افسانہ "بلی کا بچہ" بہت پسند آیا اور انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اچھے اداکار اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اچھے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار بھی اچھے ہیں۔ یہ ان کا پہلا افسانہ ہے جو میری نظروں سے گزرا۔ ان سے میری دعا سلام ہے۔ انہوں نے اس افسانے کی اشاعت کے بارے میں پہلے ہی اطلاع دے دی تھی اور میں ان کے افسانے کا بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہا تھا۔ ان کا افسانہ پڑھ کر مایوسی نہیں ہوئی بلکہ بہت خوشی ہوئی۔ آپ ان سے باقاعدگی سے افسانے لکھوائیے۔ فلم اور ڈرامے کی دنیا کے گلزار کے بعد اطہر شاہ خان کی دریافت آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ گلزار بھی افسانہ خوب لکھ رہے ہیں۔ گلزار کی فلمی اور شاعرانہ حیثیت سے میں پہلے سے واقف تھا لیکن افسانہ نگار کی حیثیت سے

ان کا ظہور بہت خوش آئند ہے "فنون" آتے ہی میں سب سے پہلے گلزار کا افسانہ پڑھتا ہوں۔ اطہر شاہ خان بھی اچھے افسانہ نگار ثابت ہوں گے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنے کیرئر کی ابتدا افسانہ نگاری سے کی تھی۔ بعد میں وہ دوسری جانب نکل گئے۔ ان کے افسانے کا انجام خوب۔ ہے یعنی وہ روایتی' ہیرو کی طرح ہیروئن کو بھگا کر نہیں لے گیا' بلکہ اپنی شکست تسلیم کر لی۔

شہزاد منظر (کراچی)

محمد کاظم کا مضمون "جبران خلیل جبران-- اور اس کے افکار و رومان" ان کے گہرے مطالعے' وسیع معلومات اور عمدہ تجزیئے کا آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کا مضمون "دیوان غالب پر مولانا حامد علی خاں کے حواشی" ان کے محققانہ شعور کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ شعر فہمی کا اس قدر ذوق اور یہ تحقیقی نظر بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ ڈاکٹر منیر الدین احمد کا مضمون "شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی" سادہ اور سلیس انداز میں لکھا ہوا ایک معلوماتی مضمون ہے جس سے ابن عربی کی شخصیت اور متصوفانہ رویوں کا سراغ ملتا ہے۔

ضیاء جالندھری نے اپنے نظم "شوریدہ" میں فنکار کے اضطراب کو مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس نظم میں رواں بحر اور قوافی کے استعمال نے نغمگی کی دلاویز فضا کو جنم دیا ہے۔ زہرا نگاہ نے نظم "سنا ہے" میں اس نکتے کو بڑی عمدگی کے ساتھ واضح کیا ہے کہ جب انسان وحشت اور درندگی پر اترتا ہے تو درندوں کو مات دے دیتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جنگل کے قانون کے نفاذ کی خواہش کتنی بڑی سچائی بن کر سامنے آئی ہے۔ خورشید رضوی نے عمر عزیز کی برق رفتاری کی کربناکی کو سالگرہ جیسی ظاہری مسرت افزا نمائش کے تناظر میں ایک منفرد زاویہ نگاہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دراصل "سال گرہ" کی زہرناکی وجود پر کس قدر گراں ہے:

ہے مری زیست کی تصوید یہی زہر کی مہر
جس سے انکار کی قیمت ہے مرا اپنا وجود

منصورہ احمد نے نظم "لفظ و معنی" میں بے بسی اور مجبوری کے سائے میں سچائی کی منزل تک پہنچنے کی خواہش کو فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نظم "سیمیا" اپنے ہدف تک پہنچنے کی شدید خواہش کی آئینہ دار ہے۔ منصورہ احمد کی نظموں کا کمال یہ ہے کہ تخلیقی جوہر کے ساتھ ساتھ ابلاغ کا وصف بھی رکھتی ہیں۔ قاری ایک لمحے کے لیے بھی ترسیل معنی کی راہ میں پریشان نہیں ہوتا۔ اسلم طارق نے حالات و واقعات کی بے ترتیبی میں فطرت کی طرف لوٹنے کی آرزو کو مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سید مبارک شاہ نے نظم "ڈیفنس کلب کراچی" میں کراچی کے خونچکاں منظر کی المناک تصویر پیش کی ہے۔ اس نظم میں اہل اقتدار کی بے حسی کا پہلو نمایاں ہے۔ نظم "بے عنوان" میں کائنات کے اسرار و رموز کی گنجلک کے بارے میں انسانی ذہن کی نارسائی اور بے بسی کی تصویر' بھرپور فنکاری کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ رخشندہ نوید نے نظم "گڑیا کی گڑیا" میں کمر توڑ مہنگائی کی تیز دھوپ میں پگھلتے ارمانوں کو بھرپور تاثر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی

نے نظم "حواس خمسہ" میں انسان کے فطری جذبوں کو حقیقت پسندی اور سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ قیقت یہ ہے کہ ندیم صاحب کی ہر نئی تخلیق کو پڑھ کر ایک خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ ان کے فن نے کسی نزل کو آخری منزل نہیں سمجھا۔

ضیاء جالندھری کی موجودہ دور کی غزلیں نظم کے تسلسل کے وصف کے ساتھ فکر و فن کی بلندیوں کو ھوتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی غزل میں حیات و کائنات کے مسائل اور روحانیت کے عناصر گہرے شعور کے اتھ سامنے آتے ہیں:

وہ غریب مجھ کو عزیز ہے، وہ فقیر میرا امام ہے
جسے خاک ہونے پہ ناز ہے، جسے چشم تر پہ غرور ہے

ظفر اقبال پرگو ہونے کے باوجود شعر میں تازگی اور نیا پن پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ شعر لاہر سادہ، بباطن دل نشین، داخلی کیفیات کی پیشکش قاری کے دامن دل کو کھینچتی ہے۔ افتخار عارف کی غزلیں لاسیکی رچاؤ کی عمدہ مثالیں پیش کرتی ہیں۔ یعقوب تصور، سلیم کوثر، غلام حسین ساجد، عباس تابش اور قمر رضا ہزاد کی غزلوں نے متاثر کیا۔ احمد ندیم قاسمی کی غزل فکر و فن کی آفاق پیمائیوں کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ نہوں نے خاص طور پر امکانات کی لامحدودیت کو بھرپور تخلیقی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ام عمارہ کا افسانہ "یہ اسی صدی کا قصہ ہے" جینٹک کے حوالے سے پھیلنے والی بیماریوں کے خوف لو سامنے لاتا ہے۔ اس اچھوتے موضوع کو دو ڈاکٹروں راحیل اور بشریٰ کے کرداروں کے ذریعے فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ راحیل اور بشریٰ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور نکاح کے بندھن میں ندھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں خوبصورت ہیں اور ایک دوسرے کو چاہتے ہیں لیکن راحیل کے ذہن پر یہ خوف ری طرح مسلط ہے کہ ان کی شادی کے بعد موروثی بیماری ان کی اولاد میں نہ در آئے اور اس طرح ان کی ولاد ان کے لیے عذاب کی صورت اختیار نہ کر لے۔ اس قسم کا ایک المیہ ان کے خاندان میں "بشارت" کی ورت میں رونما ہو چکا ہے۔ اس شدید خوف کی بنا پر آخر کار راحیل فارغ خطی لکھنے اور حق مہر ادا کرنے کا نتہ ارادہ کرتے ہوئے بشریٰ سے دوری اختیار کر لیتا ہے۔

ظہیر بابر نے اپنے افسانے "بت کدہ" میں علامتی انداز میں، تیسری دنیا کے عوام کے استحصال، اص طور پر استعماری طاقتوں کے زیر اثر مسلمانوں کے انحطاط کی موثر تصویر کشی کی ہے۔ یہ افسانہ خصوصاً صغیر کے مسلمانوں کے حوالے سے اس تاریخی المیہ کو سامنے لاتا ہے کہ کس طرح سات سمندر پار سے اجروں کے روپ میں آنے والی قوم نے مسلمانوں کی تہذیبی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی کو تاخت و اراج کیا۔ اور سب سے بڑا المیہ یہ کہ اسلاف کی قیمتی میراث کو بھی ان سے چھین لیا۔ گویا ایک طرح سے ن کے آباء و اجداد کی قیمت لگائی گئی اور انہیں ذلیل و رسوا کیا گیا۔ یوں ظہیر بابر نے ایک تاریخی وضوع کو گہری سوچ اور تخلیقی مہارت کی بدولت جدت اور انفرادیت سے ہمکنار کیا ہے۔ سلطان جمیل یم کا افسانہ "ذمہ دار" اس المیہ کو سامنے لاتا ہے کہ فتح شیر نامی ایک غیرت مند انسان جیل کاٹنے کے بعد،

معذوری اور مفلسی کی صعوبتوں میں مبتلا ہو کر کس طرح اپنی غیرت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ یہ افسانہ حالات کی ابتری کی بنا پر غیرت کا جنازہ نکلنے کی المناک تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ افسانہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی بھرپور تاثر رکھتا ہے۔

(i) سڑک کے کنارے گڑے ہوئے بجلی کے کھمبے نے اپنی یرقان زدہ آنکھ سے دیکھا۔

(ii) دشمن کی فوج کے مانند سعیدہ پر جوانی ٹوٹ پڑی اور سارا بچپن تہس نہس کر ڈالا۔

اطہر شاہ خان کے افسانے "بلی کا بچہ" کا ابتدائی حصہ قاری کو اپنی گرفت میں لیتا ہے لیکن آگے چلتے چلتے طوالت کی وجہ سے یہ افسانہ اپنی گرفت ڈھیلی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ایک عمدہ افسانہ بنتے بنتے رہ گیا۔ مصطفیٰ کریم کا افسانہ "مری میں ایک دن" سعیدہ اور اس کے خاوند کے ماضی کی یادوں کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ وہ شادی کے موقع پر ہنی مون منانے کے بعد، ادھیڑ عمری میں دوبارہ مری آتے ہیں تو اس زمانے کی یادوں کو عمارتوں، دکانوں اور ہوٹلوں کے حوالے سے تازہ کرتے ہیں۔ اس موقع پر ان کا ایک دیرینہ واقف کار نفیس انہیں رہ رہ کر یاد آتا ہے جو مری ہی میں فوج میں کیپٹن تھا۔ یہ افسانہ رومانوی فضا میں آگے بڑھتے ہوئے اس دکھ کے ساتھ ختم ہوتا ہے کہ سعیدہ اور اس کا شوہر، نفیس کے بنگلے پر اسے ملنے جاتے ہیں تو انہیں پتہ چلتا ہے کہ وہ چٹاگانگ کے پاس، اپنوں کے ہاتھوں، ۷۰ء کی جنگ میں مارا گیا۔ اس طرح مصطفیٰ کریم نے ایک غیر متوقع انجام پر، ایک المناک صورت حال کے ساتھ، افسانے کا اختتام کر کے بھرپور فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ عطیہ سید کا افسانہ "جلوہ" اساطیری عناصر کے ساتھ، قصہ در قصہ کی تکنیک میں، پراسراریت اور تجسس کی فضا میں آگے بڑھتا ہے اور اختتام تک قاری کو ایک سحر آگیں کیفیت میں رکھتا ہے۔ فرحت پروین نے افسانہ "ماما لوچیا" میں بدحال اور خوشحال عورت کے تضاد کے ساتھ ایک دکھی عورت کی بدحالی اور خودداری کی موثر تصویر کشی کی ہے۔ افسانے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاتون افسانہ نگار ہی صحیح معنوں میں عورت کے دکھوں کو پیش کر سکتی ہے۔ گلزار جاوید نے اپنے افسانے "شیطان کی موت" میں جنسی جذبے کی شدت کو فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ افسانے کا آخری حصہ معمولی کو غیر معمولی سطح پر لانے کی ایک عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔

خاور نقوی (اسلام آباد)

"اختلافات" میں آصف ثاقب کے جملے پڑھے۔ علم عروض و لغات میں اچھی نظر رکھتے ہیں۔ ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے، لیکن ایوب خاور کی نظم پر انکی تنقید سے متفق نہیں ہوں۔ "قدمچہ" لفظ جسے فارسی کہا جاتا ہے، جہاں تک مجھے علم ہے ان معنوں میں فارسی میں مستعمل نہیں ہے۔ "قدم" اور "چہ" حسب ترتیب عربی اور فارسی اجزا ہیں۔ لیکن انکا مرکب فارسیوں نے استعمال نہیں کیا۔ یہ اردو والوں کی ایجاد ہے اور اردو میں اسکا ورود کسی اصول کے تحت نہیں، عادتاً" مروج ہو گیا ہے۔ لہٰذا اصولی بحث کا جواز نہیں۔ اسکا ایک معنی تو وہی ہے جو محترم آصف ثاقب نے بیان فرمایا۔ دوسرا معنی "کھڈی میں پاؤں رکھنے کی

ہے۔ “پاؤں رکھنے کی جگہ” دونوں معانی میں مشترک ہوئی۔ شاعر کو اجازت ہے کہ معنی کا یہ شیڈ کسی لہ سلیقے سے برتے۔ صوت کے حوالے سے یہ خوبصورت لفظ ہے۔ اور خاور کی نظم میں جچتا ہے۔

شعیب آفریدی (ایبٹ آباد)

اداریئے میں آپ نے خالص ادبی پرچوں کی حالت زار کی جو تصویر کھینچی ہے اس کا تصور تک ذوق بار تھا۔ جب یہ افتاد در پیش ہو جائے تو پھر سچی ادبیت کا خدا ہی حافظ ہے۔ ڈر لگتا ہے اس وقت سے مساعد حالات ادبی پرچوں کا گلا گھونٹ ڈالیں گے اور “قلمی دہشت گرد” دندناتے پھریں گے۔ گھٹیا لٹریچر ملے ہی ادبی ذوق کا برا حال کر رکھا ہے۔ کاغذ کی گرانی اور ترسیل کی کٹھنائی کا مسئلہ جلد حل نہ ہوا تو آجائے گی۔ نازک احساسات، ارفع خیالات کی بربادی کا راستہ روکنا انتہائی ضروری ہے۔

“فنون” نظم و غزل کے معیارات کی خاطرداری میں دل و جاں سے مصروف ہے۔ نظم “تلاش” رہ احمد) کی پہلی دو سطریں کتنی پر اثر ہیں۔ دیکھئے:

چلو پھر زندگی کو کھوجنے نکلیں
وہ شاید دائی ماں کے پوپلے چہرے کی شکنوں میں چھپی ہے

احمد نے ہماری خوبصورت روایتوں کی پامالی کو جذبے کی انتہاؤں میں متشکل کر دیا ہے۔ یہ سب کچھ اسی ہے۔ شعیب آفریدی تنقید کی طرح نظم میں بھی ہاتھ دکھا گیا۔ معمول کی بات ہے بچہ جب عقل جتانے بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے “چشم بدور”۔ یہ اور بات ہے کہ شعیب آفریدی اتنا بچہ نہیں۔ دعا ہے پڑھے قلموں کھیلے۔

ایوب خاور کے نظمیہ پیٹرن مثال بن کر رہ گئے ہیں۔ دوستوں کی محفل میں جب نظم کی بات ہے ایوب خاور درمیان آجاتا ہے۔ سید مبارک شاہ کے قدم نظم کے لیے مبارک ہیں۔ شاہ جی غزل کہتے ہیں نظم اچھی کہتا ہے۔ یہ آج کا مفروضہ ہے جانے کل کیا ہو۔ “کائنات” کی ایسی نظم ڈاکٹر عدیل کے منہ ہی سے بھلی لگتی ہے۔ امید ہے وہ آئندہ بھی بزم میں آئے گا۔ محفل نظم میں یوسف یس بدل کر آیا ہے۔ اس نے “خیال” کو لفظوں کا جو لباس پہنایا وہ انوکھا ہی تو ہے۔ صد شکر کہ احمد زار اور احسان اکبر کو ایک ساتھ دیکھا۔ ازاں بعد شاہین اور افتخار عارف مزا دے رہے ہیں۔ نظموں کا ’ایک یاد کا روزن” پر ختم ہوا۔ اس اختتام نے سب محفل کو ناقابل فراموش بنا دیا ہے۔

کشمیر کے تناظر میں چار نظمیں یاد وطن کی اداسی اور دلگیری پر استوار ہوتی ہیں۔ جذبات کی روانی ون نظموں کو ایک کر دیا ہے سانحہ حضرت بل والا ٹکڑا اتنا شدید کہ درد دل کے قابو میں نہیں آپاتا۔ ل نے بڑی محنت سے لفظی پیکروں کا یہ کارخانہ لگایا ہے۔ یہاں فکر، غم، انداز سب خوش ادا ٹھہرتے تخار مغل کی نظم میں ساٹھیانی عشق طرازی بھی نئی ہے وہ “موج” میں کوڑی بھی دور کی لایا ہے۔ سید ار رونا اپنے وطن کشمیر کے لیے بے حد اداس ہے۔ بے حد رنجیدہ ہے۔ پیڑوں، کوہساروں، ستاروں،

موسموں، مسافروں کی باتیں کرنے والی آمنہ بہار کشمیر کی بہاروں کے لیے روتی ہے۔ اس کے آنسو نظموں میں مزین ہو ہو جاتے ہیں۔

آزاد کشمیر کے شاعر و ادیب اظہار و بیان کا اپنا طریقہ واردات رکھتے ہیں۔ ان کی دردمندی ایسی وارداتی ہے کہ آنکھوں کو پرنم کئے بغیر نہیں چھوڑتی۔ تعجب ہے کہ ادبیات پاکستان کی اہل قلم کانفرنس میں آزاد کشمیر کو مناسب نمائندگی نہ مل سکی۔ پھر مقتدرہ نے دوستوں کی جو محفل سجائی تھی اس میں اہل کشمیر کو گول کر دیا گیا۔ کشمیر کے تناظر میں ثمینہ راجہ کی نظم دیکھنے کے لائق ہے۔

ہمیشہ کی طرح اب بھی "فنون"، "ہزارہ رقم" ہو رہا ہے۔ عامر سہیل کا خط واقعی خط ہے۔ اس میں علمیت کے رجحانات حوصلہ افزا ہیں۔ بہر طور محمد ارشاد تک پہنچنے میں ابھی دیر لگے گی۔ محمد ارشاد کی ساری زندگی کتابوں کی الماریوں میں گزری ہے۔ اس نے "پڑھے لکھے" کو خوب ہضم کیا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے مطالعے کی جس بدہضمی کا تذکرہ کیا تھا ہمارا فلسفی اس سے صاف بچا ہوا ہے۔ محمد ارشاد کے مضامین پائے کے ہیں، مسئلہ تفہیم کے حامل ہیں۔ عامر سہیل غور کر لے۔ عامر سہیل اچھی نثر لکھتا ہے اچھی تنقید کرتا ہے۔ وہ امکانات کی گٹھڑی اٹھائے ادب کے بازار میں آنکلا ہے۔ خوش آمدید۔ ہزارے کی شاعری کا ڈنکا بجنے لگا ہے۔ پرانے تو جانے پہچانے ہیں نئے بھی رنگ جما رہے ہیں۔ محمد حنیف، امتیاز الحق امتیاز، واحد سراج، احمد حسین مجاہد فنون میں آچکے ہیں خدا کرے ابرار سالک رستم نامی، توقیر فراغ بھی آجائیں۔

احمد حسین مجاہد مجموعہ کلام کی ترتیب میں لگا ہے۔ اس کی تمنائیں خدا پوری کرے گا۔ ایک نام رہ جاتا ہے۔ نسیم عباسی، یہ نام فنون میں آگئے تو دھومیں ہی نہ مچ جائیں۔ اس موقع پر وحید قریشی اور ابو سفیان صفی بھی یاد آگئے۔ ڈاکٹر اشرف عدیل ہزارہ سے پشاور گیا ہوا شخص ہے۔

غزل کے حصے میں احمد ندیم قاسمی کی غزل حسب معمول آگے آگے ہے۔ بڑی غزل ہی بڑے شاعر ا بڑا بناتی ہے۔ عباس نجمی کی دو غزلوں میں سے پہلی نجمی کی غزل کو کسی نازنین کی صورت مجلہ تاریخ میر بٹھاتی نظر آتی ہے۔ انور شعور کی خدمت میں سلام۔

حرف علت "الف" کے احتمال پر لفظوں کے شروع سے "ع، ح، اور ہ" کے سقوط کا رواج عام ر رہا ہے۔ جیسے "مفاعلن" کے وزن میں "اب عاشق" کی صورت ہے۔ میرے خیال میں قافیہ کی خصوص رعایت کی طرح یہ عمل بھی شعوری ہے۔ "ا، و، ی" (حروف علت) اپنی آدھی آوازیں حرکات زبر زیر پیش کی حیثیت سے رکھتے ہیں۔ زبر زیر پیش کی حرکات لے تو مرتب کرتی ہیں مگر تقطیع میں شمار نہیں ہوتیں کہ کبھی "ا، و، ی" لفظ کے آخر میں ساقط ہو کر حرکات میں بدل جاتے ہیں۔ الف تو کچھ مقام پر لفظ کے آغاز بھی ساقط ہو کر زبر زیر پیش کی حرکت میں ڈھل جاتا ہے۔ گویا حروف علت اور حرکات ثلاثہ ایک آوازوں تکمیل و تخفیف کے روادار ہیں۔ اس مصرع میں الف کا تماشا دیکھئے۔

؎ لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

"اتنا" کا الف گر کر "لیکن" کے "ن" کی حرکت بن چکا ہے۔ اس قسم کی مثالیں اساتذہ کے کا

بے شمار ہیں۔ اس عمل کو فنی خوبی سمجھا جاتا ہے۔ لفظ کے شروع میں الف ساقط ہو کر زبر زیر پیش بنتا رہتا
مگر "ع‘ ح اور ہ" حروف اصلی ہیں۔ یہ کوئی تخفیفی آواز یا لہجہ نہیں رکھتے اس لیے لفظ کے شروع اور
ن کا سقوط جائز نہیں۔

آصف ثاقب (بوئی تحصیل و ضلع ایبٹ آباد‘ ہزارہ)

نالطے‘ دو وضاحتیں

دوسروں کے متعلق بات کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانکنا اچھا ہوتا ہے۔ وادئ سندھ کی
کے ریگزار میں راقم کی رہنمائی فرمانے والی محترمہ مس حمیرا عالم‘ ریسرچ آفیسر‘ لاہور میوزیم نے راقم
کیا تھا کہ کاربن 14 کی تاریخوں والی جدول کو انڈالوجی کی قسط 13 (فنون‘ شمارہ نمبر 45) میں شامل نہ کیا
ان کا خیال تھا کہ یہ قدرے ٹیکنیکل معاملہ ہے اس لیے اس سے گریز بہتر ہے۔ لیکن اپنی ہٹ دھری
نے اس قسط میں یہ جدول شامل کر دی۔ کتابت کرتے وقت کمپیوٹر نے محترمہ کی رائے کو ترجیح دی
کی کتابت میں غلطیاں در آئیں۔ وادئ سندھ پر اس تحریر کو پڑھنے والے نے (اگر کوئی ہے تو) اپنا سر
ہو گا اور راقم کی جہالت کا پردہ فاش ہو گیا ہو گا۔ افسوس ہے کہ راقم اپنے ممکنہ قاری کے لیے پریشانی
بنا۔

کاربن 14 کی مدد سے تاریخوں کے تعین کے طریق کار کی اپنی کمزوریاں ہیں۔ چونکہ یہ تاریخیں حتمی
تیں اور ان میں چند سو برسوں کے ادھر یا ادھر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے اس کے ازالے کے
تفریق کی علامتوں کو اوپر نیچے لکھ کر وہ عدد لکھ دیئے جاتے ہیں جو معینہ تاریخ میں کچھ برسوں کے ادھر
و جانے کی گنجائش کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یوں اس طریق کار سے طے شدہ تاریخوں میں امکانی گنجائش
کا تعین ہو جاتا ہے۔

اس قسط کی کتابت کمپیوٹر پر ہوئی ہے۔ کمپیوٹر بڑی ہمہ جہتی مشین ہے۔ یہ بڑی خدمت گزار ہے
ت بجا لانے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ مگر اس صلاحیت کے ساتھ اس مشین میں حماقت کا عنصر
ہے۔ ہر خدمت گزار کے لیے یہ ایک لازمی شرط ہے۔ خدمت گزاروں کی طرح یہ حکم تو مانتی ہے
کے پیچھے نیت کو نہیں بھانپتی۔ یہ صرف واضح ہدایات ہی پر کام کرتی ہے۔ یہ ہدایات سوفٹ وئر
ں۔

پاکستانی سوفٹ وئر انجینئرز نے اردو کتابت کے لیے قلم کار‘ کتابدار‘ تابعدار‘ سقراط‘ بقراط‘ جالینوس
فیثا غورث بھی اور مہکار‘ شاہکار اور قلم کار اور نظامی‘ بسطامی اور سمرقندی جیسے ناموں سے اردو
ز تیار کیے ہیں اور بڑے مہنگے داموں بیچے ہیں لیکن یہ سب خامیوں کوتاہیوں اور کمزوریوں سے پر
کی وجہ یہ ہے کہ ہم کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ ترقی نہیں کر رہے۔ جٹ ہوائی جہاز کو آج بھی

ہم بیل گاڑی کی طرح ہی چلانا چاہتے ہیں۔ نتیجہ قارئین "فنون" کے سامنے ہے۔ جس سوفٹ وئر پر اس تحریر کی کتابت ہوئی ہے اس میں جمع اور نفی کی علامتیں اوپر نیچے لکھنے کا کوئی التزام ہی نہیں تھا اور اس وجہ سے کمپیوٹر کی ماری ہوئی جھک راقم کے کھاتے میں پڑ گئی ہے۔

کمپیوٹر کی دوسری مسامحت اس جدول کا حوالہ تھا جسے یوں ہونا چاہیے تھا: آنچل، 1973:10- یہ غلطی نہ تو راقم کے اور نہ ہی کمپیوٹر سوفٹ وئر کے کھاتے میں جاتی ہے۔ یہ کمپیوٹر آپریٹر کا شاہکار ہے۔

البتہ سنگین ترین "گناہ" جبران خلیل جبران کو کمپیوٹر کا حیران خلیل حیران لکھنا ہے اور آفرین ہ کمپیوٹر کی استواری پر کہ اس موقر مقالے کے آغاز سے اختتام تک وہ جبران کو حیران ہی لکھتا چلا گیا۔ راقم یقین ہے کہ جہاں یہ مجلہ "فنون" کے قارئین کرام کے لیے پریشانی کا سبب بنا ہوگا، وہاں محترم سید محمد کاظ جیسے سلیقہ مند، نستعلیق اور حساس مصنف کے لیے بھی صدمے کا باعث بنا ہوگا۔

لیکن اگر کمپیوٹر سید محمد کاظم کے لیے صدمے کا باعث بنا ہے تو انہوں نے بھی اپنے قاری کے سا انصاف نہیں کیا۔ ان کے مقالے کے حاشئے میں یہ عبارت درج ہے:

> پچھلے دنوں جبران کے فن اور شخصیت پر ہندوستان کی ایک یونیورسٹی (علی گڑھ نہیں) میں تیار ہونے والا پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا ایک ایڈیشن حال ہی میں پاکستان میں بھی شائع ہوا ہے۔ اس پر ہمارے ایک محترم پروفیسر اور دو قابل ڈاکٹروں کی تعریفی آراء کے باوجود مقالہ بہت مایوس کن ہے اور بچگانہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ جس یونیورسٹی نے اس مقالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری مرحمت فرمائی ہے اس کی جانچ پرکھ کا اگر یہی معیار ہے تو اس کے لیے دعائے خیر ہی کی جاسکتی ہے۔ (فنون 18:45)

یعنی نہ یونیورسٹی کا نام، نہ مصنف کا نام، نہ مقالے کا نام، نہ تعریفی آرا والے محترم پروفیسر کا نام دو قابل ڈاکٹروں کا نام اور نہ اشاعت کرنے والے ادارے کا نام، تو پھر دعائے خیر کس کے لیے؟ مجھے ہے کہ "فنون" کے مدیر محترم نے بھی اس طرف توجہ نہیں فرمائی اور یقین ہے کہ "فنون" کے وہ قار جناب سید محمد کاظم کے مقالات / تحریروں کو پڑھنے کے عادی ہیں یقیناً پریشان ہوئے ہوں گے۔

علمی ادبی معاملات میں "سچائی، صرف سچائی اور سچائی کے سوا کچھ نہیں" کے فارمولے پر عمل ک والے، اعتدال پسند اور متوازن طرز تحریر کے مالک سید محمد کاظم سے جو اسم بامسمی ہیں اور اپنے " تبصروں" کے لیے مشہور ہیں، کمپیوٹر کی طرح یہ "کوتاہی" کیسے سرزد ہوئی، کیا کمپیوٹر کی طرح وہ بھی قاری سے ہاتھ کر گئے ہیں؟ راقم کا قیاس ہے کہ یہ اجمال دانستہ اور بالعمد ہے اور اس کے پس پر واقعات یا حادثات کار فرما ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

سید محمد کاظم نے جس مقالے کا نام لینے سے اجتناب کیا ہے وہ ہے "جبران خلیل جبران ــــ شخ اور فن" ریاض اکیڈمی 195 بلاک سی گلشن راوی، لاہور۔ تاریخ اشاعت واضح نہیں۔ دو تاریخیں درج 1987ء اور 1993ء۔ غالباً 1993ء ہی تاریخ اشاعت ہے۔

پی ایچ ڈی حاصل کرنے والے اس کے مصنف جناب ڈاکٹر اشفاق احمد ندوی ہیں جو "شہنشاہ ت" سید ریاض خیر آبادی کے نواسے ہیں اور لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں استاد ہیں۔ پی ایچ ڈی ند اب آپ ڈی لٹ کی تیاری کر رہے ہیں۔ اللھم زد فزد۔ یہ روایت ابھی ہمارے ہاں نہیں چلی کیونکہ چ ڈی کے ساتھ ہمارے ہاں تو مبلغ پندرہ سو روپیہ چہرہ شاہی کی اجرت وابستہ ہے مگر ڈی لٹ کے لیے ں ایسا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

تعریفی رائے کا اظہار کرنے والے پروفیسر، ہمارے مشہور و معروف پروفیسر مرزا محمد منور، سابق ٹر اقبال اکیڈمی ہیں۔ انہوں نے پی ایچ ڈی کو درخور اعتنا خیال نہیں کیا مگر یہ اختصاص انہیں حاصل ہے ہ مصور فطرت، حکیم الامت، مفکر پاکستان حضرت علامہ سر محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے والہ و شیدا ہیں لام اقبال کے مسلمہ حافظ۔ ہندوؤں کے ویدوں کے حفاظ (لغوی معنوں میں) کی طرح جن کے سامنے کسی کوئی لفظ بول دیں تو وہ کمپیوٹر کی طرح فورا بتا دیں گے کہ مذکورہ لفظ کس وید کے کون سے حصے کی کس کے کونسے شعر کا کونساواں لفظ ہے۔ اسی طرح پروفیسر صاحب کے سامنے کلام اقبال میں واقع ہونے والے لفظ کے متعلق پوچھ لیں، پروفیسر صاحب کتاب اور اس نظم کا عنوان یا غزل کا مطلع اور شعر کا نمبر بھی بتا گے اور وہ شعر اور اس سے چند پہلے اور چند آخری شعر بھی پڑھ کر سنا دیں گے جس میں مذکورہ لفظ ل ہوا ہوگا۔ اس سیاق و سباق کے علاوہ اس نظم / غزل سے چند پہلی اور چند بعد کی نظمیں یا غزلیں بھی ںا گے۔

پروفیسر صاحب کے پہلے قریبی دوست راجہ حسن اختر پی سی ایس تھے۔ وہ 1947ء میں ضلع منٹگمری ساہیوال) میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ اس زمانے میں ڈپٹی کمشنر واقعی ڈپٹی کمشنر ہوتے تھے اور ان کو قریبی ں کی ضرورت ہوتی تھی۔ آخر کوئی تو چاہیے تھا جس کے سامنے ڈپٹی کمشنر دل کی بات کہہ سکتا۔ راجہ ب بھی مصور فطرت، حکیم الامت، مفکر پاکستان حضرت علامہ سر محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے عاشقان زار ے تھے۔ پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب بعنوان "میزان اقبال" (یونیورسٹی بک ایجنسی، انارکلی، لاہور، 1ء) راجہ صاحب کے نام ان الفاظ کے ساتھ معنون کی ہے:

مرحوم دوست راجہ حسن اختر کے نام

اے غایب از نظر شدی و ہم نشین دل   می بینمت عیان و دعامی فرستمت

راجہ صاحب کا انتقال ہو گیا اور پروفیسر صاحب کی دوستی ریٹائرڈ چیف جسٹس ایس اے رحمان سے ۔ ان کی وفات کے بعد پروفیسر صاحب گلبرگ کی مین بولیوارڈ کی دوسری طرف میاں امیرالدین کے ہاں لئے جو علامہ سر محمد اقبالؒ کے سمدھی تھے۔

بات یہ ہے کہ اقبال کا یہ کہنا کہ "وہ اک مرد تن آسان تھا تن آسانوں کے کام آیا" اپنے اندر ایک نہ بصیرت لیے ہوئے ہے اور اس سے آشکار ہوتا ہے کہ "اس کا ہاتھ واقعی اس قوم کی نبض پر" تھا۔ اس قوم کے مجاوری ذہن سے بخوبی آگاہ تھا۔ اسے غائبانہ علم تھا کہ اس کے اس خیال کو کہ:

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

یہ مردہ پرست قوم مکمل طور پر اپنے تاریخی نسیان کے حوالے کر دے گی۔ اقبال یہ بھی جانتا تھا کہ اس ملک کے ٹیلیویژن اور ریڈیو پر وہ شجر ممنوع سمجھا جائے گا اور یہ لوگ اس کو "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" تک محدود کر دیں گے اور بھول جائیں گے کہ اس نے "سود خوار و والی و ملا و پیر" کا گلہ کرنے کے بعد ہمارے عوام کے متعلق یہ بتایا تھا کہ:

دہقاں ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیر زمین ہے

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اسے کاروباری مال بنا کر ایک بڑی انڈسٹری کی صورت دے دی جائے گی۔ پھر اس نے خود فرمایا تھا:

چو رخت خویش را بستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس نداند این مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

پروفیسر مرزا منور نے الدینوری کی "الاخبار الطوال" کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ شومئ قسمت ک اس پر جناب محمد کاظم نے تبصرہ کر دیا۔ (فنون' لاہور' جلد 10 شمارہ 4' فروری 1970ء' ص 115 تا 120) او اس میں اردو ترجمے کی دل کھول کر تعریف کی۔ توازن کاظم صاحب کی شخصیت کا نمایاں پہلو ہے اور علمی او ادبی معاملات میں وہ لگی لپٹی کے قائل نہیں۔ چنانچہ تعریفوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے ترجمے میں لغوی اغلا کی نشاندہی بھی کر دی۔ پھر جب شاہ فیصل کی لاہور آمد پر پروفیسر مرزا محمد منور نے ان کی شان میں لسانی اغلا سے بھرپور ایک عربی قصیدہ مقامی روزنامے میں شائع کرایا تو کاظم صاحب نے مزید بگاڑ سے بچنے کے لـ خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ شاید ان کو پتہ چل گیا ہو گا کہ پروفیسر مرزا محمد منور جبران خلیل جبران ـ مقولے کہ "لکم لغتکم ولی لغتی" یعنی "تم جانو اور تمہاری زبان' مجھے میری زبان تک رہنے دو" عمل پیرا ہیں۔ اور بقول اقبال "انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیادہ۔"

اس کتاب پر پروفیسر صاحب کی رائے اپنی نہیں۔ یہ مصنف کی آراء کا ہی عکس ہے۔ صرف الفا پروفیسر صاحب کے اپنے ہیں۔ پروفیسر صاحب کی یہ امید کہ "یہ کتاب قبول عام کی خلعت سے مشرف ہو گی اس ملک میں شاید بر آئے مگر کتاب کو جانچنے کا یہ کوئی معیار نہیں۔

رہ گئے دو قابل ڈاکٹر صاحبان تو ان میں سے ایک تو ہیں جناب ڈاکٹر سجاد باقر رضوی جن کا تعلق شا اردو' اورینٹل کالج' لاہور سے تھا اور دوسرے ہیں جناب طارق عزیز جو ایف سی کالج لاہور میں ہیں۔

جناب ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کا تعارف جناب ممتاز لیاقت اپنی کتاب "بجھ چراغ دارد" میں بڑ

سے کرا چکے ہیں۔ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں البتہ اردو دائرۃ المعارف میں ڈاکٹر صاحب کی کا ان کی اصل سے موازنہ شاید ان کا زیادہ دلچسپ تعارف ہو۔

جناب ڈاکٹر طارق عزیز سے تعارف کا شرف راقم کو حاصل نہیں۔ صرف دور سے دیکھنے ہی کی حاصل ہوئی ہے۔

ہمارے ہاں ڈاکٹر (دونوں معنوں میں) ایک اذیت ناک موضوع ہے اور فرصت اور فراغت کا ہے۔ اس موضوع پر لاہور کا ایک انگریزی روزنامہ ایڈیٹوریل شائع کر چکا ہے۔ اس کے ساتھ ڈاکٹری کی ہائی جیکنگ کا لائسنس بھی ہے۔ حال ہی میں دلی کے شری پرتھوی چند کی ایک کاوش بعنوان "جاگیر ایک ڈاکٹر صاحب ہائی جیک کر کے لاہور لے آئے ہیں۔ بک پائریسی تو اب پرانی روایت ہوگئی ہے۔ بہادر خواہ مخواہ آنسو بہا رہا ہے۔

جناب سید محمد کاظم نے فٹ نوٹ لکھنے کا تردد فرمایا اور مصنف اور ناشرین اور اس کتاب پر ایک پروفیسر اور دو قابل" ڈاکٹروں کو کلاشنکوف کے زمانے میں ناراض کرنے کا خطرہ تو مول لیا لیکن ان نام خدا جانے کس مصلحت سے گول کر گئے۔ بقول ڈاکٹر طارق عزیز جبران خلیل جبران کے "سلسلے میں گئی کتب میں سب سے اہم دستاویز قرار پانے کی امیدوار کتاب پر جناب محمد رضوان علوی' پروفیسر و بہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی و چیئرمین اردو اکادمی اترپردیش' لکھنؤ کا یہ ارشاد اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا

> "میری دلی دعا ہے کہ پروردگار انہیں (یعنی جبران خلیل جبران کے مصنف کو) اس سے کہیں بہتر اور اعلیٰ علمی کام کی صلاحیت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین!"

کیا اس فقرے کے بعد جناب سید محمد کاظم کے فٹ نوٹ کی کوئی ضرورت رہتی ہے؟

رشید ملک (لاہور)

44

شمارہ نمبر 44 پر تبصرے کا آغاز سرورق سے ہونا چاہیے۔ بلا ریب سرورق موجد کے موقر قلم کا ہے۔ سرورق پر کھنچے ہوئے رنگوں اور روشنیوں کے لہریئے صاحبان حرف و صوت کے لیے کسی نعمت ے کم نہیں۔ "فنون" کا اچٹتی نگاہ سے جائزہ لیا تو "رفتگان" کے بچھڑنے کے غم کی بیل احساس کے شجر ڈ لپٹی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ شیلے (Shelley) نے سچ کہا ہے کہ موت کی گاڑی روزانہ پراسرار ے میں سے آتی ہے اور پراسرار اندھیرے میں گم ہو جاتی ہے۔ اور روزانہ نہ جانے کتنے مسافر چپ ں میں سوار ہو جاتے ہیں اور اس گاڑی کے ہر ڈبے پر لکھا ہے کہ مسافر اپنے سامان کی حفاظت خود ۔ بہرحال وفیات کا جتنا ماتم "فنون" کرتا ہے' اتنا شاید ہی کوئی ادبی جریدہ کرتا ہوگا۔

متذکرہ شمارے کے اداریئے میں ادارہ "فنون" نے کاغذ کی گرانی اور بیرون ملک ڈاک کے محصولات میں اضافے پر جو احتجاج کیا ہے وہ بجا ہے اور اس سے ہر باشعور پاکستانی کو اظہار یکجہتی ہونا چاہیے۔ موجودہ حکومت ادب و ثقافت کی ترویج و تشہیر کی دعوے دار ہے۔ اس کے باوصف ڈاک کے محصولات اور اخباروں اور کتابوں میں لگنے والے کاغذوں کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے۔ چھپا ہوا لفظ اتنا مہنگا ہو گیا ہے کہ عام قاری کتابوں کی دکان پر کتاب پر چھپی ہوئی قیمت دیکھ کر کتاب کو یوں پھینک دیتا ہے جیسے اس نے کتاب کی بجائے انگارہ تھام لیا ہو۔

جناب احمد ندیم قاسمی کی نظم "یاد کا روزن" بلا مبالغہ 95ء کی بہترین نظموں میں سے ایک قرار پائے گی۔ اس نظم میں ایک کہانی مقید ہے۔ کہانی کا دھارا فراز کوہ سے وادی نشیب کی طرف بہہ رہا ہے۔ اس نظم میں تختی پر پھیلتی ہوئی گاچنی مٹی اور پھر اس گاچنی مٹی کے بطون سے حرف و صوت کے پھیلتے ہوئے سفر کو (جسکا تعلق صرف شاعر کی ذات سے ہے) ساری کائنات پر پھیلتا بکھرتا دکھایا گیا ہے۔ دراصل یہی وہ عمل ہے جو جمود کو مسترد کرتا ہے اور تسخیر کائنات کا باعث بنتا ہے۔ دوسری طرف روحانی ترفع کی سطح پر ایک ای کو ورفعنا لک ذکرک کی منزل پر پہنچاتا ہے۔ منصورہ احمد کی نظم "تلاش" میں ماضی کی گپھا میں گم ہوتے ہوئے نسیان کے جلتے بجھتے جگنو کو پکڑنے کی کاوش کی گئی ہے۔ شاعرہ کا کمال فن یہ ہے کہ قاری بھی شاعرہ کے ساتھ دور تک اور دیر تک چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شعیب آفریدی نے اپنی نظموں میں فلسفے اور جذبے کی آمیزش سے کام لیا ہے۔ دیگر تمام شعراء خاص طور پر --- افتخار مغل، ڈاکٹر اشرف عدیل، سیدہ آمنہ بہار رونا، ریحانہ روحی، احمد ظفر، شاہانہ ایلیا اور ادیب سہیل نے آنسوؤں کے پگھلتے نیلم کو مستجر احساس کی صورت قلمبند کیا ہے۔ سلیم کوثر کی نظم "ہاں ابھی نہیں" ہماری سماجی بے چینی اور سیاسی ان ریسٹ کا مترنم اظہار ہے۔

غزل ہماری تہذیب کی سادہ و پرکار تصویر بھی ہے اور غزل ہمارے اجتماعی لاشعور اور ہمارے باطن کی سرگوشی بھی ہے۔ اس شمارے میں غزلیات کا جو شاندار انتخاب شامل ہے اس میں عصری حسیت اور لے کی چاپ بڑی واضح سنائی دیتی ہے۔

"فنون" میں شامل غزلوں کے بعض منفرد اشعار پر نظر دوڑائیں تو یہ اشعار صرف مضامین نو کے انبار ہی نہیں بلکہ عصر کے شجر کا ثمر بھی ہیں۔ ان اشعار میں نئی علامتیں نئے مفاہیم کے ساتھ طلوع ہو رہی ہی اور یوں اس شمارے میں غزلوں کا پلہ نظموں سے بھاری نظر آرہا ہے۔

افسانہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس کی تازہ کاری اور تہہ داری کبھی نہیں ختم ہوسکتی کیونک افسانے کا تعلق زندگی سے ہے۔ زندگی کی گوناں گونی اور بوقلمونی کی کوئی تھاہ اور حد نہیں۔ اس سلسلے می لکھنے والوں کو ایک بات علی الخصوص یاد رکھنی چاہیے کہ ہر افسانے میں کہانی موجود ہوتی ہے مگر ہر کہانی می افسانے کا ہونا ضروری نہیں۔ کہانی اور افسانے کے فرق کو ہم بھٹہ خشت میں پکی ہوئی اینٹ اور کمہار آوے میں پکے ہوئے ظروف کی مثال سے سمجھ سکتے کہ دونوں میں مٹی استعمال ہوئی ہے۔ اسی طرح افسا

نگار اپنی تیکنیکی اپج سے کہانی سے افسانہ تراشتا ہے۔ "فنون" میں شامل چند افسانے ایسے بھی تھے جو جمالیاتی اصول اور فنی مقتضیات پر پورا نہیں اترتے۔ مسعود مفتی کا افسانہ "ٹائم ایکسپریس" افسانہ کم اور تمثیل زیادہ ہے۔ بہت سے احباب کا خیال ہوگا کہ یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ علامت اور تمثیل کے فرق کو واضح رہنا چاہیے۔ اس قصے میں ماضی قریب کی تاریخ کو "ٹائم ایکسپریس" کی تمثیل سے پیش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ ہم قصہ پڑھتے جاتے ہیں اور سب کچھ ہماری سمجھ میں آتا جاتا ہے۔ قصے کے انجام پر پہنچ کر ہم بہت کچھ سوچنے پر مجبور نہیں ہوتے کیونکہ اس قصے کے مصنف نے افسانے کے فنی مقتضیات کو اپنے قصے میں نہیں برتا۔ اس کے باوصف مصنف نے تاریخ اور تاریخیت سے گہری دلچسپی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ نگہت مرزا کا افسانہ "تار العنکبوت" اپنے عنوان کی تختی کے حوالے سے گہری معنویت کا حامل افسانہ ہے۔ یہ افسانہ 'تیکنیک' بنت اور مواد کی پیشکش کے حوالے سے ایک بھرپور اور جل تھل افسانہ ہے۔ حیاتیاتی جبلتوں کی عدم تسکین فرد کو ٹیڑھی لکیر کا مسافر بنا دیتی ہے اور گھر' فرد' خاندانی اکائی "تار العنکبوت" کی طرح بکھر جاتی ہے۔ اس افسانے میں اعلیٰ طبقے کی میاں بیوی کی بے راہ روی کو ایک Oversexed شوہر کی خواہشوں کے Miscarriage کے طور پر پیش کیا ہے۔ مصنفہ کی فنی چابکدستی یہ ہے کہ برہنہ بات کو بھی کپڑے پہنا کر پیش کیا ہے جو ان کے تہذیبی شعور کی علامت ہے۔ نیلم احمد بشیر کا افسانہ "چائے کی پیاس" خوبصورت اور بے حد خوبصورت افسانہ ہے۔ انگریزی ادبیات میں ہارڈی ایک ایسا افسانہ نگار ہے۔ (افسانہ نگاری سے مراد ناول نگاری بھی ہو سکتی ہے) جس کے قصے کہانیوں کا خمیر اکثر ڈرائنگ روموں سے اٹھایا جاتا ہے۔ "چائے کی پیاس" افسانے کا "لینڈ سکیپ" ___ گلبرگ' ماڈل ٹاؤن یا ڈیفنس کے بنگلوں کی اندرونی فضا سے لیا گیا ہے۔ شازی اور خالد انجم کے رومانس کی Indoor Game چپ چاپ کھیلی جاتی رہی اور (چائے کی) پیاس بجھتی رہی۔ سانپ اور سیڑھی کے کھیل کی طرح یہ کہانی ایک دم کروٹ لیتی ہے تو اس کے اختتام پر پہنچ کر ایک دھماکے کے ساتھ ہم کچھ وچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور شازی جو شادی شدہ اور بچوں کی ماں بھی ہے وہ خالد انجم کی چوری پر تو سٹپٹا ٹھتی ہے لیکن جو چوری وہ اپنے ضمیر' اخلاق اور شوہر کی کر رہی ہوتی ہے اسے چوری نہیں سمجھتی۔ یہ افسانہ راصل مراعات یافتہ طبقے کی تاریخ کا وہ حصہ ہے جسے مورخ یا صحافی روایتی رواروی میں ہمیشہ نظر انداز کر تے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "عاجز بندہ" موجودہ شمارے کے ماتھے پر جھومر کی طرح نظر آتا ہے۔ قاسمی احب کے افسانے پر تبصرہ کرنا مجھ ایسے کم مایہ لوگوں کے بس کی بات نہیں بہرحال اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ر کوئی فن افسانہ نگاری کا نو آموز یہ سوال اٹھائے کہ افسانہ کسے کہتے ہیں؟ افسانہ کیسا ہونا چاہیے۔ افسانے ر کہانی میں فرق کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام سوالوں کا جواب یہ ہوگا کہ آپ احمد ندیم قاسمی کا "عاجز ہ" پڑھ لیجیے--- یہ افسانہ ایک کرداری افسانہ ہے۔ اور "محشرستان اضطراب" سے عاری شخصیت کو دہ اور پرکار انداز سے اس افسانے میں Depict کیا گیا ہے۔

محمد الیاس کا افسانہ "قفس" ہمارے مذہبی رویوں پر گہرا طنز ہے۔ افسانے کے اختتام پر قاری کے ن میں تین سوال ابھرتے ہیں کہ منیر الدین کی بیوی کی موت کا باعث منیر الدین کی Ridgedness تھی! یا

پردے کا حامی ہونا یا اس کے پیرو مرشد کا تضاد! ہمارے نزدیک منیر الدین کی سکڑی ہوئی ذہنیت اور روح دین سے عدم واقفیت ہی اس کی اہلیہ کی موت کا سبب تھا۔ جو لوگ افکار تازہ سے اپنے اذہان کو خالی کر لیتے ہیں ان کا انجام "ققنس" جیسا ہوتا ہے جو خود اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔ گلزار کا افسانہ "راوی پار" تقسیم اور ہجرت کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ محمد سعید شیخ کا افسانہ "سولی" موضوعاتی حوالے سے اردو ادب کا ایک اچھوتا افسانہ ہے۔ جبکہ سیما پرویز کا افسانہ "امانت" ڈائجسٹوں میں چھپنے والی کہانیوں کی طرح تھا۔ ایک انگریزی نقاد Josehp-T-Shiply کی افسانے کی تعریف جو کہ اردو میں بھی مستند مانی جاتی ہے:

ocussing of A Single Aspect of Many Elements is A Short Story.

___ اس تعریف کے مطابق ہم سیما پرویز کے افسانے "امانت" کو افسانہ نہیں بلکہ کہانی کا نام دیں گے کیونکہ اس میں زندگی کی ایک قاش کو بیان کرنے کی بجائے پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا گیا ہے۔ اور موضو بھی عمومی دلچسپی پر مبنی ہے۔ زندگی کا کوئی اسرار اور انسانی نفسیات کا کوئی گوشہ اس کہانی سے سامنے نہیں آتا۔ ہاں ایک حرماں نصیب اور محرومیوں کی ماری ہوئی عورت کی اچھی Depiction اس کہانی میں موجو ہے۔

مقالات میں غافر شہزاد، عرش صدیقی، ڈاکٹر شارب ردولوی، اور ڈاکٹر سلیم اختر کے مقالے اچ لگے۔ خاص طور پر جناب عرش صدیقی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ جو دوہا نگاری کے بارے میں بڑے پتے باتیں بتاتا ہے۔ خط کافی طویل ہو گیا ہے اس لیے مقالات پر تبصرے سے شعوری گریز کر رہا ہوں۔

ارشد عروج (ایبٹ آبا

اختلافات میں فاروق خالد صاحب کا خط پڑھ کر ان کی روشن خیالی کی بے سمتی کا ادراک ہوا۔ جہ تک آپ کی ذات کا تعلق ہے تو میں اس کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ:

میری پہچان یہی ہے ثاقب
مجھ کو دیکھو تو خدا یاد آئے

زندہ رہنے والا یہ شعر آصف ثاقب کی تخلیق ہے۔ شخصی اور شعری وجاہتوں نے اپنے اظہار لیے آصف ثاقب کا انتخاب کیا ہے۔ قافیے کے ضمن میں انہوں نے جن بے قاعدگیوں کی نشاندہی کی۔ اور لیس بابر نے آفاق، اعماق کے ساتھ خاک، افلاک اور پوشاک وغیرہ کے قافیے باندھ کر اس کا ثبوت مہ دیا ہے۔

پروین کمار اشک کی غزل کے مصرع "میں صحرا ہوں نفی کی ذات والا" میں لفظ "نفی" کا و "کمی" کے وزن پر ہوا ہے، جو درست نہیں، سند کے طور پر غالب اور اقبال کا ایک ایک شعر ملاحظہ فرمائ

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا

دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجاد نہیں (غالب)

نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الااللہ کا (اقبال)

دو پہلو بحر میں شکست ناروا سے تو آئے روز واسطہ پڑتا رہتا ہے مگر اب "ع" کے ساتھ بھی شعرا کا رویہ سوتیلی ماں کا سا ہو گیا ہے۔ عامر سہیل کے تنقیدی شعور سے خاصی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ فیصل عجمی کی غیرحاضری کھٹکنے لگی ہے۔ ان کا لہجہ نہ صرف یہ کہ جدید ہے بلکہ اس میں روایت کا احترام بھی رچا بسا ہے۔ (اگر میں غلط نہیں کہہ رہا تو وہ "فنون" کے علاوہ کسی ادبی جریدے کو اپنی غزلیں نہیں بھیجتے)

عباس تابش کی غزل روز بروز نکھرتی جا رہی ہے۔ ان کا تعلق شعراء کے اس قبیلے سے ہے جو جدیدیت کی رو میں بھٹک نہیں جاتا۔ یہاں صرف دو اشعار پر اکتفا کروں گا۔

بے تعلق نہ ہمیں جان کہ ہم جانتے ہیں
کتنا کچھ جان کے یہ بے خبری آتی ہے
کتنا رکھتے ہیں وہ اس شہر خموشاں کا خیال
روز اک ناؤ گلابوں سے بھری آتی ہے

سلطان سکون کی مسلسل خاموشی نے "فنون" سے ایک خوبصورت شاعر چھین لیا ہے۔ انہوں نے اپنی صلاحیتیں ہندکو ادب کے لیے وقف کر دی ہیں۔ (شاید)

حال ہی میں ان کی کتاب "کاری دل گل" منصہ شہود پر آئی ہے۔ ہندکو کے نثری ادب کو نئی توانائیوں سے سرشار کرنے میں کتاب ممد و معاون ہو گی۔

احمد حسین مجاہد (بالاکوٹ)

"فنون" میں "اختلافات" کے ضمن میں پہلی دفعہ شرکت کی جسارت کر رہا ہوں۔ میں ابھی مزید ایک عرصے تک آپ کو مخاطب کرنے کی جرات نہ کرتا اگر "فنون" کے شمارہ نمبر 44 میں فاروقی خالد صاحب کا خط شائع نہ ہوتا۔ اس خط میں محترم فاروق خالد صاحب لکھتے ہیں:

> "آپ کا اداریہ "حرف اول" پڑھ کر میں چونکا۔ میرے نزدیک آپ کا میدان ادب یعنی لٹریچر ہے، مذہب نہیں اور مذہب کی چھری سے ادب کا جھٹکا کرنا یا اس کی کانٹ چھانٹ کترنت بیونت کر کے اس سے ایک اور ہی قسم کے نرالے پودے کو متعارف کرانا ناجائز و قبیح فعل ہے۔ آپ ایسے شخص سے جس کا ادب کے حوالے سے ایک درخشندہ جچا تلا اور کسی حد تک کو منڈ ماضی و حال ہے، مجھے ایسی توقع

نہ تھی۔"

اس عبارت کے علاوہ بھی انکی تحریر سے مجھے اختلاف ہے لیکن تحریر کا جو حصہ میں نے اوپر نقل ہے اس سلسلے میں فاروق خالد صاحب کی غلط فہمی دور کرنا ضروری ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ فاروق خالد صاحب، ندیم صاحب کی زندگی اور نظریے کے بارے بالکل اندھیرے میں ہیں کیونکہ اگر وہ "جلال و جمال" کا دیباچہ پڑھ لیتے تو کبھی ایسی باتیں نہ کرتے۔ دو بات یہ کہ ندیم صاحب کے اداریے سے ادب کا جھٹکا کیسے ہوگیا جبکہ اس میں نہ تو ادب کی راہیں متعین کی ہیں اور نہ ہی ادب کے مذہبی اصول بتائے گئے ہیں، بلکہ اس میں تو انتہائی سیدھے سادے انداز میں ہما بنیادی عقائد پر بات کی گئی ہے اور ہماری تہذیب کی باطنی قوت کو زیر بحث لایا گیا ہے، اور جن مقاصد کے ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا انکی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس میں ادب کی کانٹ چھ اور کترنت بیونت کیسے ہوگئی اور ویسے بھی مذہب ادب کی راہ میں کسی طریقے سے بھی رکاوٹ نہیں بنتا۔ کے ثبوت میں تاریخ ادبیات کا جائزہ لیں تو کئی نام ایسے ملیں گے جو مذہب کی پوری پوری پابندی کرنے و لوگ تھے لیکن انہوں نے اعلیٰ ترین ادب تخلیق کیا۔ ان میں رومی، حافظ، اور شیخ سعدی کا نام خاص ط نمایاں ہے۔ اگر برصغیر کے ادب کا جائزہ لیں تو علامہ اقبال کی مذہب پسندی کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے انہوں نے ایسا اعلیٰ ادب تخلیق کیا کہ آج ادبیات عالم میں ان کو ممتاز مقام حاصل ہے۔

اگر عالمی ادب کا جائزہ لیں تو ان میں بھی بے شمار نام ایسے ہیں جو مذہب پسندی کے باوجود اعلیٰ تخلیق کر گئے۔ ان میں سے دانتے اور ٹی۔ ایس ایلیٹ کا نام خاص طور پر لیا جاسکتا ہے۔ فاروق خالد ص سے مودبانہ گزارش ہے کہ وہ کسی بھی چیز پر اعتراض کرنے سے پہلے اس چیز کا ہر پہلو سے جائزہ لے لیا تاکہ اس قسم کی الجھنیں پیدا ہونے کا امکان نہ رہے۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ مضامین سبھی اچھے ہیں مگر میں صرف ایک مضمون کا ذکر کروں گا ج شارب ردولوی کا ہے۔ میں انہیں خراج تحسین پیش کروں گا کہ انہوں نے جذبی جیسے اہم شاعر کو اس کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو جذبی سے صرف نام کی حد تک شناسا ہے۔

محمد اشفاق (اسلا

ماہنامہ "فنون" کا شمارہ بابت مئی تا اکتوبر 1994ء کو منظر عام پر آئے ہوئے ایک عرصہ گزر گ میں نے اس کا مطالعہ کر لیا ہے۔ اس کے مندرجات سے ذہن کو سکون، دل کو راحت اور دماغ کو ت ہے لیکن افسوس کہ اس شمارے کے بارے میں اپنی رائے ارسال کرنے میں بہت سستی کا مظاہرہ ک میں اس میں شامل افسانوں کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

کسی ادبی رسالے کا سب سے بڑا کمال یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سر تا پا ادبی ہو۔ ماشاء اللہ فنون ا پر مکمل طور پر پورا اترتا ہے۔ میں ادبی رسائل میں "نقوش"، "فنون" اور "اوراق" کو بہت ا

ہوں۔ جب تک کوئی شاعر، ادیب، افسانہ نگار یا انشائیہ نگار ان پرچوں میں سے کسی میں نہیں چھپتا اسے خود کو فنکار کہلوانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جہاں تک انشائیہ نگاری کا تعلق ہے آپ کا بیشتر انشائیہ نگاروں سے سخت اختلاف ہے۔ میں اسے معاصرانہ چشمک سمجھتا ہوں۔ مجھے آپ کی اس رائے سے ہرگز اتفاق نہیں ہے کہ انشائیہ صرف مشکور حسین یاد ہی لکھتے ہیں۔ اب کے آپ نے فنون میں ڈاکٹر حسرت کا سگنجوی کا انشائیہ "حسد" شامل کر کے اپنی رائے میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کر لی ہے۔ جو ایک اچھی بات ہے۔ ڈاکٹر حسرت کا سگنجوی اوراق میں بھی انشائیہ لکھتے ہیں۔ آپ نے انہیں فنون میں شامل کر کے اپنے عمل سے ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دیا ہے۔ مجھے یہ انشائیہ پسند آیا ہے۔

میری یہ ہمیشہ سے عادت رہی ہے کہ جو بھی کتاب یا رسالہ میرے ہاتھ لگ جائے میں اسے اول سے آخر تک پڑھتا ہوں۔ لیکن میں نے تازہ "فنون" میں اپنی اس عادت میں تبدیلی پیدا کر لی۔ میں نے اسلم سراج الدین کی تحریر "سر سامر" کو سب سے آخر میں رکھا۔ دراصل میں اس تحریر کو خصوصی توجہ اور پورے انہماک سے پڑھنا چاہتا تھا۔ جیسا کہ آپ نے بھی لکھا ہے کہ یہ ایک طویل نثری نظم ہے۔ میں اسے کہانی کی قسم کی ایسی تحریر سمجھتا ہوں جس میں مصنف اپنے خیالات اور وسیع مطالعہ کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ وہ باتوں باتوں میں حکمت و دانائی کی باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ کسی اچھے انشائیہ کی خوبی ہو سکتی ہے لیکن زیر نظر تحریر ہرگز انشائیہ نہیں ہے۔ اس تحریر کو کس زمرے میں شمار کیا جائے میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ نے بھی اس تحریر کو اردو ادب میں اپنی نوعیت کی اولین تحریر قرار دیا ہے جو اپنے بازوؤں میں مستقبل کو بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ میرے نزدیک یہ تحریر کہانیوں کی کہانی ہے۔ یعنی اس تحریر کے بطن سے کئی کہانیاں جنم لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور مستقبل میں اس کی کوکھ سے بہت سی کہانیاں جنم لیں گی۔ اسلم سراج الدین نے اس تجربہ سے ایک انوکھا کام کر دکھایا ہے۔ اس تحریر کے بل بوتے پر اس کا نام دوام حاصل کرے گا۔

سجاد حیدر کی وجہ شہرت اس کی پنجابی زبان میں ڈرامہ نگاری ہے۔ لیکن اب کے وہ بطور اردو کے افسانہ نگار سامنے آئے ہیں۔ ان کے افسانہ "تیک" میں وہ سبھی کچھ موجود ہے جنہیں افسانہ نگاری کے لوازمات کہا جاتا ہے۔ البتہ افسانے میں طوالت کا رجحان کھٹکتا ہے جس نے افسانے کے مجموعی تاثر کو مجروح کیا ہے۔ تاہم افسانہ کامیاب ہے۔ افسانہ نگار نے خوشحال خٹک اور وارث شاہ کے اشعار کا سہارا لے کر اس کی معنویت میں اضافہ کر دکھایا ہے۔ پرے کا موسم، آج کی کراچی کا افسانہ ہے جس میں دکھ ہی دکھ ہیں۔ گلزار نے بھی "سانجھ" میں اپنا بھرم قائم رکھا ہے۔ سید منوچہر، "روپ بہروپ" میں تقدیر کا شکوہ کرنے کی بجائے تقدیر پرستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر وہ افسانے کے انجام کو منطقی بنا دیتے۔ مرزا حامد بیگ نے "کاتک کا ادھار" میں تقسیم ہند کے بعد رونما ہونے والے واقعات کو آواز دی ہے۔ افسانے کا تاثر اتنا بھرپور ہے کہ اسے پڑھتے وقت قاری دنیا و مافیہا سے یکسر بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ افسانہ اس نسل کے لیے کچھ زیادہ ہی جاذب نظر بن جاتا ہے جس نے تقسیم کے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ حقیقت کسی کی نگاہوں

سے اوجھل نہیں ہے کہ اس وقت دونوں ممالک میں بہیمیت کا دور دورہ تھا لیکن اس تاریک دور میں بھی ایسے حیران کن واقعات دیکھنے کو ملے جنہیں یاد کر کے انسانیت اپنا سر اونچا کرنے کے قابل ہو سکے گی جیسے اس افسانے میں بھی ادھار پر مذہبی کتابیں فروخت کرنیوالے شخص اور اس کے خریداروں کا کردار ہے۔

فرحت پروین کا "منجمد" بغیر کسی جذبہ خاص کے پڑھنا شروع کیا تھا۔ شروع شروع میں تو افسانے میں کسی قسم کی دلچسپی کا سامان نہ پایا۔ پھر کہانی آگے بڑھی تو اس میں سے ایک نئی کہانی نے جنم لے لیا بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ اس کہانی میں حقیقت کا رنگ بھرنا شروع ہوا تو غلط نہ ہوگا۔ یہ افسانہ مغرب کے ماحول، وہاں کی معاشرتی اور سماجی زندگی کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اس طرح اس افسانے میں ایک ایسے دکھ نے جنم لیا ہے جس کے تدارک کے لیے بیکراں جذبہ ہمدردی درکار ہے۔ شکر ہے کہ افسانہ نگار اپنی اس کاوش میں کامیاب رہی ہیں۔ افسانے کی سطور میں جگہ جگہ انسانی اوصاف کی رنگینی جھلکیاں دکھا رہی ہے۔ اور یہ دنیا جو دکھوں سے بھری ہوئی ہے اس میں زیادہ دیر تک جیتے رہنے کا عزم ابھرتا ہے کیونکہ ابھی یہاں بے مروتی اور بے مہری کی یخ بستگی کے مقابلے میں محبت اور پیار کی گرمی موجود ہے جس سے نظام حیات چل رہا ہے، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ نظام حیات بدستور چل ہی نہیں رہا بلکہ اور آگے بڑھ رہا ہے۔ محمد جمیل آفاقی کا سٹیریو ٹائپ حقیقی زندگی سے قریب تر ہو گیا ہے۔ خالد طور، "سائیں موسم" لے کر بزم فنون میں شامل ہوا تھا۔ اب بھی اس کی ایک جھلک "تقدیر" میں دیکھنے کو ملی ہے۔ وہ اس طبقہ کو طبقہ اناس کہنے کی بجائے طبقہ خناس کہنے پر مجبور ہے۔ ارجمند شاہین نے "آسیب زدہ" میں کہانی کو جس طرح آگے بڑھایا ہے وہ اس کی فن افسانہ نگاری سے خصوصی دلچسپی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کی زبان و بیان قابل داد ہے۔ جس نفسیاتی نکتے پر اس کہانی کا ڈھانچہ کھڑا کیا گیا ہے وہ اپنے اندر خاصی جاذبیت رکھتا ہے۔ پیروز بخت قاضی کا "پیارے اللہ میاں" پڑھ کر مجھے یوں لگا جیسے میں نے اس کہانی کو پہلے بھی کہیں پڑھا ہو۔ تاہم میں نے لذت مکرر کے لیے اسے دوبارہ ذوق و شوق سے پڑھا۔

خیرالدین انصاری (جھنگ)

منفرد اور صاحب اسلوب شاعر و مصنف دل نواز دل
کا دوسرا مجموعۂ غزلیات "سخن دلنواز"
انتہائی دیدہ زیب طباعت، مرقع صادقین، غزل کی آبرو اور اعتبار
غزل میں وہ حیرت انگیز تنوع جس کی مثال اردو شاعری میں کم دستیاب ہو سکے گی
التحریر۔ کبیر سٹریٹ اردو بازار لاہور

تبصرے

ڈاکٹر ممتاز احمد خان' شفیق الرحمٰن' مشکور حسین یاد' ڈاکٹر عطش درانی' محمد اسعدی' احمد ندیم قاسمی' محمد انور' داؤد رضوان' ڈاکٹر توصیف تبسم۔

اشاریئے (مضامین)

مصنفہ: ڈاکٹر محمد علی صدیقی
قیمت: ۱۲۰ روپے
ناشر: مکتبہ افکار' مارسٹن روڈ' کراچی

"اشاریئے" ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے ان اکیاون مختصر مضامین کا مجموعہ ہے جنہیں انہوں نے ماہنامہ "افکار" کراچی کے لیے بطور مہمان مدیر تحریر کیا اور جو نومبر ۱۹۷۶ء سے مارچ ۱۹۹۳ء کے دوران بحیثیت اشاریئے شائع ہوئے۔ اس کتاب کو "افکار" کی گولڈن جوبلی کے موقع پر شائع کیا گیا ہے۔۔

"افکار" میں مہمان مدیر کی حیثیت سے معروف ادیبوں اور شعرا سے اشاریے یا اداریئے لکھوانے کا سلسلہ تقریباً دو عشروں سے جاری ہے اور یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ ہر اداریئے میں ادب کے تعلق سے کوئی نہ کوئی سماجی' معاشرتی' علمی' تہذیبی اور اقتصادی مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔ "ابتدائیہ" کے تحت ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے لکھا ہے کہ ان کے "افکار" کی یہ اشاریہ نویسی مضمون نویسی سے زیادہ دلچسپ مشغلہ رہی ہے' اس لیے کہ سنجیدہ مسائل پر ان میں قارئین کے ساتھ بے تکلفی سے بات کرنے کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ آخر میں انہوں نے تحریر کیا ہے کہ یہ اشاریئے اتنا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود دعوت غور و فکر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے اس خیال سے غالباً سب ہی لوگ اتفاق کریں گے کہ جن سنجیدہ مسائل پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے وہ آج بھی لائق توجہ ہیں' اس لیے کہ وہ مسائل جوں کے توں ہیں اور ان کی شدت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر ان اکیاون اشاریوں کی فہرست میں سے چند عنوانات دیکھئے۔ یہ عنوانات آج بھی ہمارے ذہن میں ترو تازہ ہیں اور ادب پڑھنے اور ادب لکھنے والے ان پر آج بھی غور و فکر کرتے ہیں۔ ان میں ضمیر کا بحران' وقت عظمت اور سپاٹ ڈھلوانیں' روشنی اور اندھیروں کے خوگر' انسان اور آدمی' ادبی اقدار کے ساتھ مذاق کیوں؟ انشائیہ کثرت تعبیر کا افسانہ' اقبال اور فیض' حسن و بصیرت کے داعی--- ادب انانیت اور نرگسیت' ثقافت' لوک ورثہ' حقیقت اور سراب' ادب تاریخ کا بہاؤ' حب

الوطنی۔ حزن و ملال اور دنیا بے زاری کے داعیوں سے ایک سوال۔ روشن خیالی بے وقت کی راگنی؟
-----شامل ہیں۔

ان اشاریوں میں جو قابل قدر خوبی ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی مسئلے پر ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے حقیقت سے نظریں چرانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اور جو بات یا جو بھی خیال پیش کیا ہے اسے بے باک انداز سے اور مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ غالباً جناب صہبا لکھنوی مدیر "افکار" نے "مہمان اداریہ" کے کالموں کے پیچھے جہاں یہ مقصد روا رکھا تھا کہ قارئین کو سنجیدہ مسائل کے ادراک میں شریک رکھا جائے، وہاں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ پڑھنے والے ان پر حمایت یا مخالفت دونوں پیراؤں میں اظہار خیال کریں۔ "افکار" کے قارئین جانتے ہیں کہ ان اشاریوں پر جو کہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے علاوہ دیگر معروف ادیبوں اور شعرا حضرات نے تحریر کئے ہیں، ردعمل بھی ایک علیحدہ کالم "انجمن" کے تحت شائع ہوتا رہا ہے لہٰذا یہ سلسلہ ہر لحاظ سے سودمند ثابت ہوا ہے۔ ادب کی دنیا میں ذہن میں اٹھنے والے سوالات پر سوچ بچار کے دروازے بند کرنے کے بجائے ان پر کھل کر بحث کرانے میں سراسر فائدہ ہی ہے۔ ویسے بھی ادب پڑھنا اور تحریر کرنا دونوں ہی ذہنی و تہذیبی عمل ہیں۔ جہاں تک تنقیدی مضامین کا تعلق ہے، ان کی تخلیق میں نسبتاً زیادہ وقت صرف ہوتا ہے، اور ان کے شائع ہونے میں بھی خاصا وقت لگتا ہے، لیکن مہمان مدیر کی حیثیت سے چھوٹے چھوٹے مضامین بطور اشاریئے یا اداریئے تحریر کرنے میں ایک سلگتا ہوا مسئلہ اپنے صحیح وقت پر ادب کے شائقین کے سامنے آجاتا ہے۔ اور اس پر ردعمل سے بھی ہم فوراً آگاہ ہو جاتے ہیں۔ یوں مسلسل و متواتر مکالمہ کی فضا جاری رہتی ہے۔

ان اشاریوں میں خاص بات یہ ہے کہ ان کے مطالعے سے ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا ادبی نظریہ، جسے ہم روشن خیالی سے تعبیر کرتے ہیں، سامنے آجاتا ہے۔ ان کے نزدیک، پارلیمانی جمہوریت کی اسپرٹ یا جذبے کے تحت ہر مسئلے پر بحث ممکن ہے اور چاہتے ہیں کہ جو Synthesis سامنے آئے اسے قبول کیا جائے۔ دوسری طرف وہ نراجیت اور آمریت کے مخالف ہیں۔ وہ ایسی مثبت تبدیلی کے قائل ہیں جس میں انسان کا احترام ہو، بوسیدہ سماجی ڈھانچہ ایک ترقی پذیر ڈھانچے میں ڈھل کر عوام الناس کو تہذیبی، علمی، معاشی اور سماجی میدانوں میں کامرانی عطا کرے--- وہ ادب اور زندگی دونوں میں وابستگی کے قائل ہیں، وہ ایسے ادب کے مخالف ہیں جو عدم ابلاغ کو فروغ دے اور پڑھنے والوں کے ذہن میں انتشار و افتراق برپا کرے اور اسے زندگی سے اور زمانے سے بالکل ہی مایوس کردے۔ ان اداریوں میں اس سے بھی زیادہ کچھ موجود ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان

۱۔ برگ و شبنم
۲۔ بہ زیرِ شاخِ گل (شعری مجموعے)

مصنف: سید منیر
قیمت: (۱) ۸۰ روپے (۲) ۷۵ روپے
ناشر: اساطیر۔ ۴۵۔ اے مزنگ روڈ، لاہور

سید منیر کی شعری تصنیف "برگ و شبنم" حالات زمانہ کی عکاسی ہے۔ ان کی شاعری انسان کے ضمیر کی آواز ہے اور انسانیت کے رنج و آلام کا احاطہ کرتی ہے۔ سماج، سیاست، تہذیب و ثقافت کے نشیب و فراز کا اظہار انکی غزلوں اور نظموں میں خوش اسلوبی سے ہوا ہے۔ انکے شعر انبساط کی لہریں بھی پیدا کرتے ہیں، تفکر کا احساس جگاتے ہیں اور تحیر کی فضا بناتے ہیں۔

سید منیر کا مجموعہ کلام "بہ زیرِ شاخِ گل" وطن کے لیے درد مندی کے جذبات کے تحت تخلیق ہوا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کے المیے کے پس منظر میں انکی یہ نظمیں بظاہر موضوعاتی ہیں لیکن اپنے اندر لازوال انسانی قدروں کی پاسداری کا سبق دیتی ہیں۔

سید منیر اپنے جذبہ اظہار میں سچے اور کھرے ہیں۔ ان کا طرزِ بیان سادہ مگر پر اثر ہے۔ زبان میں سلاست ہے اور کلام میں دل پذیری ہے۔

شفیق الرحمٰن

فسانہ کہیں جسے (افسانوں کا مجموعہ)

ئولف: سید عاشور کاظمی
اشر: انسٹیٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ ونڈر ویر روڈ لندن

"فسانہ کہیں جسے" ایک تالیف ہے جس میں سید عاشور کاظمی نے ۳۴ افسانے یکجا کر دیئے ہیں۔ یہ سانے ان افسانہ نگاروں کے ہیں جو اپنے اپنے وطن سے باہر رہتے ہیں یعنی برطانیہ، امریکہ، اٹلی، ڈنمارک، روے، کینیڈا وغیرہ میں جنھوں نے رہائش اختیار کر لی---- ظاہر ہے ان افسانہ نگاروں پر نئے ممالک کی ما اور ماحول کا اثر بھی ہوا ہوگا اور انہیں اپنے اصل وطن کی یاد بھی آتی ہوگی۔ لہٰذا ان ہر دو تاثرات سے لکھنے والوں کے افسانوں میں کیا کیا رنگ پیدا ہوئے یہ اپنی جگہ ایک دلچسپی کی چیز ہے۔

ویسے عاشور کاظمی نے محض بھانت بھانت کے افسانے ہی جمع نہیں کئے بلکہ فن افسانہ نگاری پر بھی ایک مبسوط دیباچہ لکھا ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ دیباچہ کہانی کے فن پر ہے جس نے داستان ناول اور افسانے کی صورت اختیار کی---- یہاں بھی عاشور کاظمی نے کہانی کو صرف ایک یا دو ملکوں میں نہیں دیکھا پوری دنیا کی کہانی کا جائزہ لیا ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ اگر افسانہ نگار جان دار ہو تو وہ اپنے پڑھنے والوں کو زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔ افسانے کی وساطت سے ہم زندگی کو اس کے وسیع ترین تناظر میں دیکھ سکتے ہیں۔ اور پھر کہانی میں دیگر اصناف ادب سے ہٹ کر ایک بڑی کشش یہ ہے کہ یہ اپنے قاری کو زندگی کے ٹھوس حقائق سے کسی تکلف کے بغیر براہ راست ملا دیتی ہے۔ ایک پڑھنے والے کو زندگی جس قدر قریب ایک افسانے میں نظر آتی ہے دوسری کسی صنف میں نظر نہیں آتی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کہانی کو ہر قسم قاری شوق سے پڑھنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ آدمی کے مدنی الطبع ہونے کا ثبوت اصناف ادب میں سے اگر کوئ صنف بہم پہنچاتی ہے تو صحیح معنوں میں وہ صنف افسانہ نگاری ہی ہے۔ افسانہ پڑھتے ہوئے آدمی خود کو کبھی تن محسوس نہیں کرتا۔ اسے افسانہ پڑھتے وقت ہر لمحے یوں لگتا ہے جیسے وہ بہت مصروف ہے اور اس کی مصروفیت نہ تو بے معنی ہے اور نہ ہی کسی خیر اور نیکی کے جذبے سے خالی---- افسانہ کا قاری افسانہ کے کردارو کے دکھ سکھ میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں دوسروں کے غم و مسرت کی شرکت سے بڑھ دنیا میں کوئی دوسری بھلائی کیا ہو سکتی ہے۔ مگر یہ ساری باتیں اسی وقت معیار پر پوری اترتی ہیں۔ جب خو افسانہ معیار پر پورا اتر رہا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ افسانہ نگار کا افسانہ نگار ہونا بہت ضروری ہے۔

ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خواہ آپ دوسرے لوگوں کے لکھے ہوئے افسانے ہی جمع کیوں نہ رہے ہوں اس کے لیے ایک سلیقہ اور شعور کی ضرورت ہے۔ افسانوں کے انتخاب میں آپ کو بڑی ذ داری کے ساتھ کام لینا پڑتا ہے۔ مسرت کا مقام ہے کہ عاشور کاظمی نے یہ فرض ذمہ داری سے ادا کیا ہے لیکن ٹھہریئے یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر آپ اپنے ملک میں بیٹھ کر اپنی زبان کے افسانہ نگاروں افسانے منتخب کر رہے ہیں تو یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں کہلائے گا۔ آپ کو اپنے ملک کے لکھنے ولوں کے بار میں معلوم ہے کہ کون بڑا افسانہ نگار ہے اور کون ابھی اس فن کے میدان میں قدم رکھ رہا ہے اور کون مح اس فن کو بدنام کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو ایسی صورت حال میں معیار افسانوں کے انتخاب میں کوئی زیادہ دقت پیش نہیں آتی۔ عاشور کاظمی کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ کہ وطن سے دور لکھنے والوں کو ہم کتنا بھی معیاری تسلیم کریں پھر بھی ان میں معیاری لکھنے والے کتنے آئیں گے۔ اس کے علاوہ عموماً معیاری لکھنے والے اپنے وطن سے باہر نکلتے ہی کم ہیں اور نکلتے ہیں تو یوں ملک کو جلدی سے اپنا وطن نہیں بنا لیتے۔ دیکھ لیجئے نہ کرشن چندر نے اپنا ملک چھوڑا نہ راجندر سنگھ بیدی اور نہ ہی سعادت حسن منٹو نے---- یہ تو خیر مرحومین کی بات تھی۔ ماشاء اللہ زندوں میں بھی کون باہر کر رہ گیا ہے۔ ہمارے احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین بھی خیر سے اپنے ملک میں ہیں، اشفاق احمد اور قدسیہ کا بھی یہی مضمون ہے اور یہی دوسرے معروف لکھنے والوں کا---- یہ درست ہے کہ باہر کے

والوں میں بھی کئی ایک معروف نام ہیں، لیکن پھر بھی عاشور کاظمی کا کام خاصا دشوار تھا جس کو انہوں نے پوری جرات اور ذمہ داری سے سرانجام دیا ہے۔

“فسانہ کہیں جسے” کے ۳۴ افسانے گویا ہمیں زندگی کے کم از کم ۳۴ روپ ضرور دکھاتے ہیں۔ کم از کم میں نے احتیاط کے طور پر کہا ہے ورنہ سچی بات یہ ہے کہ ان افسانوں میں ایسے افسانے بھی ہیں جو ایک روپ نہیں زندگی کے بہت سے روپ ہماری فکری صلاحیتوں کے لیے پیش کرتے ہیں۔ پھر سب سے نمایاں خصوصیت ان افسانوں کی یہ ہے کہ ان میں اکثر افسانے وطن سے دور رہنے والوں کے بہت سے مسائل کا ذکر اس انداز کے ساتھ کرتے ہیں کہ ہم سوچتے رہ جاتے ہیں۔ اس تالیف کا پہلا افسانہ ہی “بعد کی خبر” انسانی غم و مسرت کے ایک اچھوتے پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔ اچھوتا اس اعتبار سے کہ ہمیں یہ افسانہ پڑھ کر شدت کے ساتھ یہ احساس ہوتا ہے کہ آدمی کی اکثر خوشیاں بڑی ناپائدار اور بودی ہوتی ہیں۔ قیصر تمکین نے اپنے اس افسانے میں بڑی چابکدستی کے ساتھ ہم پر اس حقیقت کو روشن کیا ہے کہ ہمارے اکثر غم اور اکثر خوشیاں ہماری ذات تک محدود ہوتی ہیں۔ اور کاروباری قسم کی خوشیوں کی تو بنیاد ہی اکثر انسان کی خود غرضی اور تنگ نظری پر ہوتی ہے۔ ایک ہوائی جہاز کے حادثے میں جتنے زیادہ لوگ لقمہ اجل بنے اتنی ہی یہ خبر اخبار والوں کے لیے باعث مسرت تھی۔ اور آپس میں مٹھائی تقسیم ہونے والی تھی کہ صحافی جان ہمفرے کو پتا تھا کہ حادثہ کے شکار ہوئی جہاز میں مرنے والوں میں تو ایک اس کی لڑکی بھی تھی۔ چشم زدن میں یہی خوشی غم و اندوہ میں بدل جاتی ہے۔ قیصر تمکین کا یہ افسانہ پوری انسانی زندگی کے دکھ سکھ پر ایک بھرپور طنز ہے۔ سیکس ہمارے افسانوں کا ایک زمانہ میں خاص موضوع رہا ہے۔ یہ موضوع نہ صرف دلچسپ اور مسحور کن ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی خطرناک بھی ہے، لہٰذا سیکس کو موضوع بنا کر افسانہ لکھنا کوئی معمولی کام نہیں۔ اس کے لیے بڑے چابکدست فن کار کی ضرورت ہے چنانچہ ہمارے اکثر افسانے اس ضمن میں لذت کوشی سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ ہمارے خیال میں سعادت حسن منٹو نے اس موضوع کے ساتھ پہلی بار انصاف کیا اگرچہ وہ غریب پھر بھی مطعون ہوا۔ بہرحال “افسانہ کہیں جسے” میں شامل سیکس کے موضوع پر افسانے باقاعدہ اس موضوع کا کوئی نہ کوئی معاشرتی پہلو دکھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم اس مجموعے کے تین افسانے لیتے ہیں ضمیر الدین احمد کا “نیویارک کی شام” ڈاکٹر فیروز مکرجی کا “رعنائی خیال” اور جمشید مسرور کا “رات ہمسائی انگوٹھا” تینوں افسانوں کا موضوع سیکس ہے۔ “نیویارک کی شام” میں بتایا گیا ہے کہ وہاں کس طرح سیکس کے معاملہ میں ایک شوہر بیوی کی طرف سے آنکھیں بند کر کے کاروباری بن جاتا ہے جبکہ “رعنائی خیال” میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم اہل مشرق مغربی ممالک میں جا کر سیکس کے ضمن میں کس طرح اپنے آپ کو وسیع المشرب بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ ادھر جمشید مسرور کے افسانے “رات ہمسائی انگوٹھا” میں سیکس کے ضمن میں کس طرح بھول چوک کے باوجود ایک مشرقی خاوند آپے سے باہر ہو جاتا ہے---- اگرچہ جمشید مسرور کا افسانہ پڑھتے وقت بار بار ہمیں راجہ مہدی علی خاں کی وہ تحریر یاد آتی رہی جس میں گرمی کی رات میں بھاگتے وقت وہ زمین پر چادر اوڑھے لیٹی ہوئی ایک خاتون کے ساتھ لیٹ گئے تھے اور خود کو چھپا لیا تھا---- افسانہ “ذلیل” میں ش صغیر

ادیب نے والدین کو وطن میں بے یار و مددگار چھوڑ کر باہر جانے والے کی بے حسی کا ذکر کیا ہے جبکہ "تمنا کے سر" میں ہرچرن چاولہ نے باہر جا کر وطن واپس لوٹنے کی تمنا کرنے والوں کی حالت بے چارگی دکھائی ہے۔ غرض "فسانہ کہیں جسے" عاشور کاظمی کی ایک ایسی تالیف ہے جس کو پڑھ کر نہ صرف ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ وطن سے دور ہمارے اردو افسانہ نے کہاں تک ترقی کی ہے بلکہ ہمارے معاشرتی اور تہذیبی شعور میں بھی گوناگوں اضافہ ہوتا ہے۔

مشکور حسین یاد

گھر کی تلاش

مصنف: سجاول خان رانجھا
قیمت: ۸۰ روپے
ناشر: بک پروموٹرز بلاک نمبر۱۹ مرکز ایف سیون۔ اسلام آباد

میں سجاول خان رانجھا کو نہیں جانتا۔ معلوم نہیں اچھے ہیں یا برے۔ خبر نہیں زندہ ہیں یا مرحوم۔ نہیں ملک میں ہیں یا باہر۔ مجھ جیسے گوشہ گیر اور گمنام شخص کو ویسے بھی انسانوں کے اس جنگل میں شجر شماری کیا ضرورت ہے۔ راہ چلتے کوئی درخت سامنے آگیا تو "معاف کیجئے" کہہ کر راستہ بدل لیا۔ یا پھر علیک سلیک لی اور اسے غیبت کا موقع فراہم کر کے آگے بڑھ گیا۔ زندگی کے اوائل ہی سے پڑھنے لکھنے کی لت ایسی پڑ کہ بہت سے نام نہ چاہتے ہوئے بھی حافظے میں گھس گئے۔ انہیں محو کرنے کی شعوری کوششوں کے باوج ایک بھیڑ ہے کہ دماغ میں ٹھہر گئی ہے۔ چنانچہ ہر شخصیت کو اس کی تحریر کے آئینے میں ہی دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ نتیجہ اس سے ملنے اور اسے دیکھنے کی خواہش ہی پیدا نہیں ہوتی۔ اگر شخصیت اچھی ہے تو تحریر۔ ظاہر ہے اور اگر خدانخواستہ ـــــ' تو ملنا بیکار ہے۔ لوگوں کو پرکھنے کا یہ ہی ایک پیمانہ ابھی تک بنا سکا ہو کہ یہ نہ دیکھو کہ کون کیا ہے' یہ دیکھو کہ کس نے کیا لکھا ہے۔ یہی باعث ہے کہ زندگی کے گوناگوں متنو میدانوں میں انسان شناسی کے فن سے ناآشنا ہی رہا۔

جب رانجھا صاحب کی کتاب "گھر کی تلاش" ملی تو اسے اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا اور یوں مصنّ سے تعارف ہوتا چلا گیا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ میں کتاب ایک نشست میں نہیں پ سکتا۔ "لندن لندن" جیسا سفرنامہ کئی روز میں ذہن پر اپنا نقش جما سکا تھا۔ دراصل میرے لیے کتاب پڑ سے پہلے اس کی خفی رو' فکری زاویے اور تحریری بہاؤ کی سمت کا تعین کر لینا ضروری ہوتا ہے۔ اور پھر ا طرح سے پڑھتے چلے جانے سے مطالعہ کا صحیح لطف میسر آسکتا ہے۔ اپنے اس تعینی اکھاڑ پچھاڑ کی ایک جھ دکھانا ضروری سمجھتا ہوں۔ کتاب اٹھائی تو پتہ چلا کہ یہ سفرنامہ ہے۔ چنانچہ اس صنف کے ہتھیار لے کر

بلکہ لیٹا کہ زیادہ تر مطالعہ لیٹ کر کرتا ہوں۔ کچھ آگے بڑھا تو لوڈ شیڈنگ شروع ہو گئی۔ کبھی سفر حاضر، کبھی غائب، راہ میں کئی موڑ آئے۔ سوچا اسے رپوتاژ قرار دے دوں۔ مگر فکر و تخیل آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔ کبھی منظر آن، کبھی آف۔ منظر نامہ سے بڑھ کر حکایت و تذکرہ کے خار زار سے بھی گزرا۔ راہ میں تحریکی بیان اور تنظیمی احوال بھی آئے۔ ایک جگہ اور نظر ورق گیر ہوئی، چونکا، ٹھہرا دیکھا تو آپ بیتی کا دل نشیں مرقع سامنے تھا۔ کچھ دیر بعد ایک جھٹکا سا لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے زلزلہ سا آگیا ہو۔ ہر چیز تلپٹ ہو گئی اور پھر پرواز شروع۔ شاید سویڈن پر لینڈ کر پائے تھے کہ اچانک روشنی گل ہو گئی۔

ذہن پر جو منظر نامے متحرک تھے، سب سفید اوراق میں تحلیل ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ کتاب ختم ہو گئی ہے۔ حیرت ہوئی کہ کتاب پڑھ بھی ڈالی۔ ایک بار پھر اس پر غور شروع کیا۔ دیکھوں تو یہ کس صنف سے متعلق تھی۔ یہ بھاؤ کیونکر ہوا۔ پروفیسر محمد منور صاحب فرما رہے تھے کہ یہ ناکامیوں کا تذکرہ ہے۔ حسرت تعمیر ہے کہ ترفع پا کر کتاب بن گئی ہے۔ حضرت ضمیر جعفری کا ارشاد تھا کہ طرز تحریر کی شگفتگی اور تازگی نے تجربات آراستہ کر رکھے ہیں۔ بات کچھ اور بھی تھی، سفر میں کہیں کہیں سیر اور سفر سے بڑھ کر جہد کے مناظر بھی ایزاد تھے اور شگفتگی سے زیادہ روانی۔ بلکہ کچھ اور بھی شدید تھا جو پڑھنے والے کو بہائے لیے جا رہا تھا۔ یہ سفر نامہ نہیں تو یہ سیر بینی بھی تو نہیں تھا۔ بیان حضر نہیں تو داستان جہد بھی نہیں تھا۔ اگر ہم اسے داستان نامہ نہیں کہہ سکتے تو شاید بیان بینی جیسی کوئی اصطلاح وضع کرنا ہو گی۔ یہ بیان بینی، مصنف نے اس صداقت اور دیانت سے ادا کیا ہے، بلکہ سادگی اور بھولپن سے ادا کیا ہے کہ اپنی شخصیت کی مثبت و منفی سب شعاعیں منعکس کرتے چلے جاتے ہیں۔ تلاش معاش، حصول تعلیم اور خدمت تحریک کی ایک مسلسل کشمکش میں وہ ہمیں اپنی مرضی سے بعض منظر دکھاتے اور آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن کچھ اس طرح کہ محض منظر نگاری پر تکیہ ہے اور نہ خود بیانی کا مبالغہ، مگر ان کے عزم جواں یا ہمت مرداں کے تقاضے، ہر منظر کی چلمن اٹھا کر جھانکتے نظر آ جاتے ہیں۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ کتاب کا اسلوب روانی کے تحت آتا ہے۔ یعنی منظر نامے۔ رپور تاژ، مکالمے، بیانیہ، طنز و مزاح، لطافتیں اور فکری تجزیئے، سب کچھ اس طرح ایک حسین توازن کے ساتھ بہتے چلے جاتے ہیں کہ بعض جملوں کی کاٹ اور فکری ماحصل سے اختلاف کے باوجود ہم اسے ایک عمدہ ادب پارہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مصنف ملکوں ملکوں پھرتے ہیں۔ ثقافتی جھٹکے برداشت کرتے اور بیان کرتے ہیں۔ اپنا ردعمل کسی خشک پوست اور نک چڑھے فلسفی، خشک مغز اور تنگ نظر ملا یا تنگ مزاج اور ہم چوں ماقسم کے نقاد کی طرح ظاہر نہیں کرتے اور نہ ہی محض ایک خوش مزاج صحافی کی طرح اسے چٹخارے لے کر رپورٹ کرتے ہیں، بلکہ ایک سچے ادیب کی طرح زمان و مکاں سے ماورا ہو کر اپنے تاثرات کی شدت کو خوبصورت جملوں میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی یہی خوبی کتاب کو شہ پارہ بنا دیتی ہے۔ ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

> "خدا حافظ" مردوں نے عورتوں اور عورتوں نے مردوں کو کہا۔ شاید
> یہ ہراول دستے کے لوگ تھے۔ اور یہ کیا؟ وہ ایک دوسرے کے گال

> چوم رہے تھے۔
> "خدا حافظ"
> "تبدیلی ناگزیر ہے۔" اس نے کہا تھا۔
> "تبدیلی ناگزیر ہے۔" میں نے سوچا۔ میرے سامنے ایک نئے افغانستان کے آثار ابھر رہے تھے۔

ایک اور پیراگراف:

> "بڑے بے شرم ہیں۔ اصل نسل خنزیر کی ہیں" میں ایک نظر ان پر ڈالتا اور ان کے آباو اجداد کو پنجابی میں یاد کرتا، اور نظریں ہٹا لیتا۔ یورپ میں داخلے کے بعد ہر نیا آدمی ایسی ہی سنسنی محسوس کرتا ہے وہ دیکھتا ہے۔ نہیں دیکھتا ہے، پھر دیکھتا اور پھر نہیں دیکھتا، کہ اس کے بعد برائی بدنما نہیں رہتی۔ وہ کلچر کا حصہ قرار پاتی ہے۔ اور میں اس کلچر کے عین مرکز میں تھا۔"

ڈاکٹر عطش درا

تعلیمی مثلثیں

مصنف: ڈاکٹر انعام الحق کوثر
ناشر: مکتبہ شال، سیٹلائٹ ٹاؤن، کوئٹہ
قیمت: ٦٠ روپے (مجلد)

آج کی دنیا سائنس، ٹیکنالوجی، ترقی، ایجادات اور کام میں تیز رفتاری کی دنیا ہے۔ دنیا میں گزرنے والے لمحے میں جدید وسائل ایجاد اور نئے راستے دریافت ہوتے ہیں اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اور سائنس کے کارواں سے پیچھے نہ رہیں تو ہمیں بھی علم و سائنس، فن و ہنر اور دوسرے شعبوں ایجادات کی طرف توجہ دینا پڑے گی۔ وقت بہت کم ہے اور کارواں بھی آگے جا رہا ہے۔ اور یہ وہی کام جو ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے مختلف موضوعات خاص طور پر تعلیم و تربیت کے شعبے میں سرانجام دیا ہے۔

مختلف مذہبی، سیاسی، ثقافتی اور معاشرتی موضوعات .عبارت دیگر تمام انسانی ضروریات کی تشریح توضیح کے سلسلے میں ان کا ذوق سلیم اس بات کا باعث ہے کہ وہ مثلثات کی شکل میں طویل پیچیدہ اور تھکا د والی بحث کو مختصر کر کے موضوعات کی شیرینی کو بھی بڑھا سکے ہیں۔ کتاب "تعلیمی مثلثیں" اس بات کی د ہے کہ استاد تدریس کے دوران بچوں کے تربیتی اور نفسیاتی قوانین پر پورا عبور رکھتے تھے۔ اور اس پر

کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ ایک بچے یا نوجوان (۱۸ سال سے کم فرد) کی تربیت کے دوران صرف علمی مسائل پر واقفیت کافی نہیں ہے۔ بلکہ بچے کی مختلف روحانی، نفسیاتی اور ذہنی پہلوؤں میں تربیت اور پرورش ہی غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے، جو کہ نشوونما میں ہم آہنگی نہ ہونے کی صورت میں بڑی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

جدید اور قدیم دانشوروں نے تعلیم و تربیت کی جو روشیں بیان کی ہیں ان میں ایک تقریری روش ہے، دوسری استفہامی روش ہے اور تیسری مخلوط روش و شیوۂ تعلیم ہے۔

تقریری روش وہ قدیمی روش ہے جس میں کلاس کو تقریری محفل میں بتدیل کیا جاتا ہے۔ اور شاگردوں کو تھکاوٹ سے دوچار کر دیا جاتا ہے اور یہ بات باعث افسوس ہے کہ ہمارے بعض معلمین آج بھی اس روش سے استفادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

دوسری روش استفہامی روش ہے جس کو سقراطی روش تعلیم سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس روش میں درس، استاد اور شاگرد کے درمیان مکالمے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور استاد شاگردوں کو ایک سوال دے دیتا ہے اور ان کو حقیقت دریافت کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ آخرکار استاد کی مدد اور ترغیب سے وہ حقیقت دریافت کر لیتے ہیں۔ یہ روش بہت سے دروس میں قابل عمل اور مفید ہے۔ اور اس روش کا اہم ترین فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے شاگردوں کی قابلیت کو ابھارا جا سکتا ہے اور ان کی ذہنی اور فکری سرگرمیوں کی سطح کو بلند کر دیا جاتا ہے۔

سب سے بہتر روش تعلیم مخلوط روش ہے۔ یعنی استاد ضروری مسائل کے بیان کے ضمن میں شاگردوں سے ان ہی مسائل کے سلسلے میں سوال کرتا ہے اور ان سوالات کے ذریعے سے شاگردوں کی تھکاوٹ دور کر کے انہیں مجہولات تک پہنچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ تاہم اس کتاب "تعلیمی مثلثیں" میں استاد ڈاکٹر کوثر کی روش تدریس غیر معمولی ہے۔ انہوں نے تدریس کے موضوعات کو ریاضیات کی زبان میں بیان کیا ہے جو کہ مناسب ترین علمی زبان ہے۔ اور اس مفید زبان کے ذریعے انہوں نے یہ سب کچھ محققین اور اساتذہ کے سامنے پیش کیا ہے۔ مثلثات کے تین زاویوں کے موضوعات اس طرح سے ترتیب دیئے گئے ہیں کہ غیر محسوس طور پر قارئین کے سامنے سوال پیدا ہوتا ہے اور قارئین اس طرف راغب ہو جاتے ہیں کہ وہ ان تین موضوعات کے درمیان اور درمیان میں واقع مرکزی حیثیت کے حامل موضوع کے ساتھ بقیہ دو موضوعات کا ارتباط ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ روش گوناگوں فوائد کی حامل ہے، مثلاً شاگرد اس روش تعلیم میں تھکاوٹ سے دوچار نہیں ہوتے۔ اس روش تعلیم سے شاگردوں کا ذہن فعال ہو جاتا ہے اور مسائل تیزی سے ان کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ استاد ڈاکٹر انعام الحق کوثر اپنی تعلیمات کو خداوند عالم سے شروع کرتے ہیں۔ اور شاگردوں کو گوناگوں دینی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور تاریخی مسائل کے درمیان سے گزار دیتے ہیں۔ اور پھر بھی خدائے بزرگ و برتر تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ مکمل طور پر وہی ارتقائی سفر ہے کہ توحیدی عرفان مریدوں کے حرکت و سلوک کے لیے بیان کرتا ہے کہ سیر و سلوک ابتداء میں خدا سے لوگوں کی طرف

اور آسمان سے زمین کی طرف ہوتا ہے۔ اور سیر کا آخری مرحلہ لوگوں سے خدا کی طرف اور زمین سے آسم کی طرف ہوتا ہے یعنی ابتداء اور انتہا اللہ جل جلالہ کی ذات ہے۔ اور بیچ میں انسانی معاشرے اور ان ضروریات اور احتیاجات واقع ہیں۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگرچہ انسان مادی موجودات کا حصہ۔ لیکن ایک الٰہی اور توحیدی حقیقت کا حامل ہے۔ بقول شاعر:

مرغ باغ ملکوتم نیم از عالم خاک
چندری روزی قفسی ساختہ اند از بدنم

(ترجمہ: میں باغ ملکوت کا پرندہ ہوں۔ اور عالم خاک میں سے نہیں ہوں۔ صرف چند دن کے۔ میرے بدن کو میرے وجود کا پنجرہ بنا دیا گیا ہے۔)

اور حضرت امام علی السلام فرماتے ہیں: "اے انسان کیا تو یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ تو ایک معمولی ا سستی سی ہستی کے سوا کچھ نہیں؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ تیرے وجود میں ایک بڑی دنیا بسی ہوئی ہے اور تو پو خدائی کے برابر بڑا ہے۔" البتہ یہ انسان ہی ہے کہ پوری ہنرمندی سے اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرے۔ ا کے علاوہ مصنف نے بڑی ظرافت و لطافت سے شاگردوں کو ایمان' قانون کے تقدس' ایمان کی اہمیت' ا چیزوں کے بارے میں جن کو خدا نے جائز قرار دیا ہے' تشدد اور جارحیت سے پرہیز' فرض کی ادائیگی' اور ع و پیمان کا پاس رکھنے' شجاعت اور دلیری کے حصول' عزت نفس' پاکدامنی' طہارت و اخلاص' حب الوطنی ا بہت سے دیگر اخلاقی پہلوؤں اور معاشرتی فرائض کی طرف متوجہ کرایا ہے۔ اور جو بچہ اس روش کے تح تعلیم حاصل کرے وہ فطری طور پر بغیر کسی حساسیت کے' فضائل اور کمالات سیکھ لیتا ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی روش بہت ہی دلچسپ تعلیمی روش ہے اور یہ روش اس قابل ہے کہ ت مفکرین کے لیے نمونہ اور مث [illegible] قرار پائے۔ بعبارت دیگر ان کی روش سب مفکرین کے لیے قابل اتبا تقلید ہے۔ خصوصاً یہ کہ سرور کونین حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم' امیرالمومنین حضرت کرم اللہ وجہہ اور دین اسلام کے دوسرے بزرگوں کی سیرت اس روش کا سرچشمہ ہے۔ اور بہت سی روایا اور احادیث بھی اس باب مین موجود ہیں جن کے ذریعے موضوعات کو بڑے منظم انداز سے تقسیم کیا گیا ہے

مجھے امید ہے کہ اس سرزمین کے مفکرین اور دانشور استاد محترم ڈاکٹر انعام الحق کوثر کے گرا وجود سے بہرہ ور ہوں گے۔

محمد اسعد

(ڈائریکٹر جنرل فرہنگ اسلامی جمہوری ایران' کوئٹہ

پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشبو

ڈاکٹر انعام الحق کوثر
۸۰ روپے
سیرت اکادمی بلوچستان

قرآن حکیم کا فرمان ہے: کہ اے نبی، ہم نے تم کو گواہ اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور
م کی طرف دعوت دینے والا ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

چنانچہ دور نبویؐ میں اسلامی معاشرے کا ہر فرد اپنے ہر دینی، معاشرتی اور معاشی مشکل کے حل کے
ر پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے براہ راست رہنمائی حاصل کرنے کا عادی ہو چکا تھا کیونکہ قرآنی احکام کی رو
کی حیثیت سراج منیر کی تھی اور آپ نے اپنی عملی زندگی کے ذریعے یہ ثابت فرما دیا تھا کہ وہ مدبر
ق ترین انسان، ہمدرد ساتھی اور انتہائی ذہین رہنما ہیں۔ جب نعمتوں کا ایسا بحر بے کنار موجزن ہو تو
نرورت پڑتی کہ وہ اپنے مسائل کے لئے پریشان ہو۔ چنانچہ چراغ نبوت کے پروانے ہر مشکل میں
کے لیے آپ کے پاس جاتے اور گوہر مقصود پاتے۔ دستور زندگی کا بڑا حصہ حدیث کی شکل میں اس
ہوا۔ اسی صورت حال میں آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

”آج میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے
، طریقے کو پسند کیا۔“ اس آیت کریمہ کے نزول نے امت کے ہر فرد کو مغموم و پریشان کر دیا کیونکہ
سمجھ گیا کہ دین کی نعمت کی تکمیل کا مطلب ہے کہ اس نعمت کو لانے والی ہستی اب زیادہ عرصہ ان
ان نہیں رہے گی چنانچہ ہر شخص فکر مند ہوا کہ نبیؐ کریم کی زندگی کے ہر لمحہ کو محفوظ کر لیا جائے تاکہ
ذریعے نہ صرف خود استفادہ کیا جائے بلکہ مستقبل میں بھی امت کی رہنمائی کا اہتمام ہو جائے۔ غالبًا
سیرت النبیؐ پر کام کا آغاز ہوا اور آج تک جاری ہے کیونکہ قرآن نے امت مسلمہ کو جہاں بہترین
ر دیا وہیں آئندہ انسانوں کی ہدایت و اصلاح کا کام بھی اسکے ذمہ لگا دیا۔ ارشاد ربانی ہے کہ ”تم دنیا
ترین امت ہو جسے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان
۔“ ظاہر ہے یہ فریضہ اسی صورت میں انجام پا سکتا ہے جب قرآن و سیرت پاک سے مکمل استفادہ کیا
نانچہ صحاح ستہ کے مرتبین کے علاوہ سیرت النبی پر بے شمار کام کیا گیا اور قیامت تک جاری رہے گا
کی پیچیدگیوں کے ساتھ ہر روز نئے مسائل جنم لے رہے ہیں اور ان کا حل قرآن و سنت سے
نے کی مسلسل کوششیں جاری ہیں اور دنیا نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ یہ کام مکمل
۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کتاب ”سیرت پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشبو“ بھی سیرت النبی کے علمی و ادبی

خزانے کا ایک نیا موتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک مشہور محقق ہیں۔ تاریخ و سوانح مرتب کرنے کے فن میں کم درک رکھتے ہیں اور ان موضوعات پر کئی ایک کتب مرتب کر کے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں اور زیر نظ کتاب اسی تحقیقی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔

آج کے دور میں انسان کئی ایک سماجی مسائل سے دوچار ہے اور ماہرین عمرانیات ان مسائل کا ح تلاش کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں یہ حل انسانی معاشرے کے گہرے مطالعے کا تقاضہ کرتے ہیں۔ ماہر مختلف النوع سروے، اعداد و شمار کی فراہمی اور پھر ان کی مدد سے کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں بعض اوقات تو تیر نشانے پر بیٹھتا ہے اور گاہے یہ کاوشیں رائیگاں جاتی ہیں لیکن اگر ماہرین عمرانیات سیر طیبہ سے روشنی حاصل کریں تو انہیں انسانی زندگی کے جملہ مسائل کے بنیادی اصول آسانی سے سمجھ آجائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی امر کو پیش نظر رکھا ہے اور زندگی کے مسائل کے حل کے لیے سیر طیبہؐ سے روشنی حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ہمارے مشرقی معاشرے میں آج تک بزرگوں کی تعظیم اور احترام کی تعلیم دی جاتی ہے اور والد اور اساتذہ اٹھتے بیٹھتے بچے کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے سے بڑوں کا ادب و احترام چاہیے، ان کی ہر بات مان کر اس پر عمل کرنا چاہیے اور کسی صورت میں ان کی حکم عدولی نہیں کرنی چا چنانچہ بچہ ایک روبوٹ بن کر رہ گیا ہے اس کی اپنی کوئی شخصیت نہیں رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس انسانی کو محسوس کیا اور احترام بچہ کے عنوان سے ایک نہایت عمدہ مقالہ ترتیب دیا جس میں بچے کی ضرورتو اجاگر کیا اور ایک مسلم معاشرے میں بچے کی ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے سیرت طیبہؐ سے بہ رہنمائی فراہم کی اور بزرگوں کو ذہن نشین کرایا کہ بڑی نسل کا ادب ہی ضروری نہیں بلکہ بچے کی شخصی احترام بھی لازمی ہے تاکہ وہ ایک مایوس فرد کی بجائے معاشرے کا ایک کامیاب رکن بن سکے۔ اس مقا نے بڑی شہرت پائی اور اس وقت یہ زیر تبصرہ کتاب میں باب اول کے طور پر شامل ہے۔ اس باب میں ڈ صاحب نے نبی کریم ﷺ کی زندگی سے بے شمار ایسے واقعات یکجا کر دیئے ہیں جن کے ذریعے نہ بچے کی شخصیت کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے بلکہ پیغمبر اسلامؐ نے بچیوں کے ساتھ جس طرح حسن سلوک کا د دیا ہے وہ بھی وضاحت کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتا ہے اور یوں ایک ایسا معاشرہ جس میں بیٹے کو فوقیت دی جاتی ہے اسکی اصلاح کا کافی سامان فراہم کر دیا ہے۔

لیکن دین اور تجارت انسانی معاشرے کے بنیادی تقاضوں کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ یہاں لا دھوکہ وہی انسان کے تجارتی عمل میں شامل ہو سکتی ہے، کم تولنا، گراں فروشی، ذخیرہ اندوزی، وعدہ تجارت کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ ان برائیوں کے تدارک کے لیے لاکھ قوانین بنا لیے جائیں لیکن خوری کو انسانی ذہن سے نکالنا مشکل ہے۔ سزائیں اس جرم میں کمی تو کر سکتی ہیں لیکن اس کا قلع قمع نہیں۔ البتہ اخلاقی تربیت انسان کو اس برائی سے بچا سکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تجارت کے حوالے رسول مقبول ﷺ کی شخصیت کو اجاگر کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے اور سیرت سے ایفائے وعدہ،

ملہ، صدق و امانتداری، ناپ تول میں احتیاط کے بارے میں نہایت مناسب واقعات بیان کر دیئے ہیں اسکے قہ ہی وہ تمام احکامات بھی یکجا کر دیئے ہیں جو تجارت کو ملاوٹ، نفع خوری، جھوٹ، مبالغے اور دھوکہ سے تے ہیں۔ اس مضمون کے ذریعے تجارت کے متعلق حضورؐ کی تعلیمات کو بڑی اچھی طرح اور نہایت موثر یقہ سے بیان کر دیا گیا ہے جو کہ عام انسانوں کے لیے عموماً اور اہل تجارت کے لیے خصوصاً مشعل راہ کا ادے سکتیں ہیں۔

بے رحمی، ظلم و ستم اور انتقام سماج کی بڑی برائیاں ہیں اور ماہرین سماجیات ہمیشہ انسانی معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے کے طریقے تلاش کرتے رہے ہیں تاکہ انسان انسان کے منفی رویوں سے محفوظ رہ ،۔ عفو و درگزر دین حقہ کی وہ بنیادی تعلیمات ہیں جو انسان کی عظمت کو برقرار رکھنے اور بھائی چارہ اور شت کو فروغ دینے کا سبب بنتی ہیں۔ کتاب میں اس موضوع پر ایک نہایت عمدہ اور موثر مضمون شامل ۔ مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے بے شمار مثالیں یکجا کر دی ہیں جن سے پتہ ہے کہ حضور پاک ﷺ نے کس طرح برداشت، بردباری، حسن سلوک، درگزر و عفو اور احترام نیت کا عملی نمونہ پیش کیا اور کس طرح ایک مسلمان کو تعلیم دی کہ اس کے ہاتھ سے دوسرا مسلمان بلکہ ن ہر طرح محفوظ رہنا چاہیے۔

امن عالم ہمیشہ ایک اہم مسئلہ رہا ہے کیونکہ انسان کے ہاتھوں انسانیت کی تباہی کی داستانوں سے یخ عالم بھری پڑی ہے۔ قدیم دور میں چنگیز و ہلاکو جیسے وحشی اور طاقتور مہم جو انسانیت کو اپنی ہوا و ہوس کا ، بناتے رہے لیکن جدید دور میں دنیا کی متمدن ترین قوموں کے ہاتھوں احترام انسانیت کی قبا چاک ہوتی اہے اور ہو رہی ہے۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگیں حربی ادب کا ایک اہم حصہ ہیں ہی لیکن ویت نام اور نستان میں ان متمدن قوموں نے کیا کیا گل نہیں کھلائے۔ کشمیر اور بوسنیا میں آج کیا ہو رہا ہے۔ فرق ـ یہ ہے کہ چنگیز اور ہلاکو کبھی امن عالم کے دعویدار بن کر سامنے نہیں آئے تھے لیکن آج حقوق انسانی علمبردار ہی امن عالم کو پامال کرنے کا سبب ہیں۔ وہ قوموں کو باہم آمادۂ جنگ کرتے ہیں تاکہ وہ ہتھیار نت کر سکیں۔ وہ امن اس لیے قائم نہیں ہونے دیتے کہ یہ ان کی شرائط پر ہونا چاہیے۔ چنانچہ امن عالم جس قدر خطرے میں ہے شاید کبھی نہیں تھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک ایک انسان کو نہ صرف ان انسانیت کے عزائم سے متعارف کرایا جائے بلکہ انہیں صلح و آشتی، امن اور بھائی چارے اور عدل و ف کی تعلیم بھی دی جائے تاکہ وہ کسی کا آلہ کار نہ بن سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس انتہائی اہم ضرورت کو نظر رکھتے ہوئے اپنی کتاب میں امن عالم اور عدل کے موضوع پر تین مضامین شامل کئے ہیں اور تینوں سیرت طیبہؐ سے مختلف واقعات و احادیث جمع کر کے امن عالم اور احترام و تحفظ نسل انسانی کی ضرورت و ت کو بخوبی اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے واقعات کے ذریعے بتایا ہے کہ کس طرح ، وقت میں جب مسلمان اپنے دشمن پر ہر طرح غالب تھے لیکن رحمت عالم نے تلوار کو نیام میں رکھا اور ں کو انسان کے خون سے رنگین ہونے سے بچا کر انسانیت کو امن کا درس دیا۔

فاضل مصنف اسلامی فلاحی مملکت کی خاکہ کشی اور نظام مصطفیٰ کے قیام جیسے موضوعات کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ دو مضامین میں انہوں نے ایک اسلامی مملکت کے خدوخال اجاگر کئے ہیں اور اس کے نظم مملکت کے اصول و قواعد بیان کئے ہیں اور اس سلسلے میں بھی حیات طیبہ سے مختلف واقعات چن چن کر بیان کئے ہیں اور واضح کیا ہے کہ نظام مصطفیٰ کے اصولوں پر قائم ایک اسلامی فلاحی مملکت ہی ایک جدید ریاست کے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے۔

"سیرت پاک ﷺ کی خوشبو" کا انداز بیان نہایت سادہ اور دلنشین ہے۔ قاری کی دلچسپی مسلسل برقرار رہتی ہے کیونکہ موضوعات متنوع ہیں اور معلومات بے شمار۔ اگرچہ یہ مضامین مختلف اوقات میں تحریر ہوئے ہیں لیکن کتاب میں ان کو یوں ترتیب دیا گیا ہے کہ ان کا ایک دوسرے کے ساتھ کافی ربط قائم ہو گیا ہے اور قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ مسلسل اصول و قواعد سے ان کے عملی اطلاق کی جانب بڑھ رہا ہے اور بات اس کی سمجھ میں آ رہی ہے۔ مصنف کی بڑی خوبی اس کی سلامت روی ہے تمام مواد نہایت مستند حوالوں سے حاصل کیا گیا ہے اور کہیں کسی متنازعہ فیہ مسئلہ کو نہیں چھیڑا گیا اور یوں یہ کتاب اس ادب کا ایک حصہ بن جاتی ہے جو اتحاد بین المسلمین کے جذبہ کے تحت تخلیق کیا جا رہا ہے۔

محمد انور

جدائی راستوں کے ساتھ چلتی ہے (نظمیں)

شاعر: نصیر احمد نصیر
قیمت: ۱۲۰ روپے
ناشر: نیو بکس، اسلام آباد

"جدائی راستوں کے ساتھ چلتی ہے" نصیر احمد ناصر کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ نصیر احمد ناصر کا تعلق ۱۹۷۰ء کے بعد ابھرنے والے شعراء کی نسل سے ہے۔ یہ نسل اپنی معروضیت اور ترجیحات کے حوالے سے ایک مجوب نسل کا تاثر دیتی ہے۔ خوابوں اور نظریات کی پے در پے شکست کے تسلسل نے اس دور میں فکری اور محسوساتی سطح پر پروان چڑھنے والی نسل کی نفسیات میں لا ابالی پن، ذاتیت، انانیت اور فنی سطح پر خوبصورت لفظوں کی بازی گری کا مزاج پیدا کیا۔ ترقی پسند تحریک کی غیر فعالیت، آمریت کے ایک طویل دور کے بعد ملک کا دو لخت ہونا، غیر تربیت یافتہ اور غیر منظم جمہوریت کی بحالی اور پھر اسی عشرے میں اپنی نوعیت کے ایک انوکھے نراجی مارشل لاء کا آغاز۔ اس سارے معروض نے ایک ایسا عمومی شعری رویہ جنم دیا جو خوبصورت لفظیات، گہری معنویت سے عاری مناظر اور محبت کے کم گہرے نئے رویوں کی فراوانی سے مملو نظر آتا ہے۔

اس دہائی کی نسل واضح طور پر دو حصوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کا ایک حصہ وہ ہے جو نظری پر ترقی پسند تحریک کے ساتھ اپنی دلچسپی قائم رکھتے ہوئے اس دور کی معروضیت پر کبھی طنز کرتا اور کبھی اس سے ہم آہنگ کرتا دکھائی دیتا ہے، جبکہ دوسرا حصہ لسانی تشکیلات کی تحریک اور جدیدیت پسندی کی لی معنویت کے ساتھ اپنی دلچسپی قائم کرنے کی کوشش اور اپنے معروض سے لا متعلق ہونے کی سعی کے ں ہے۔

نصیر احمد ناصر کی شاعری کا تعلق بھی شعراء کی اس نسل کے دوسرے حصے سے بنتا ہے۔ نصیر کی ں میں کوئی گہرا فکری تجربہ گونجتا دکھائی نہیں دیتا۔ یہاں محض بنت کاری کے فن (Craftman Sl نے انکی شاعری کو خوبصورت لہجہ عطا کیا ہے۔ ان کی شاعری کا مزاج ایسا بنتا ہے کہ ت کو گہرائی میں جا کر کہنے کی بجائے محض سطحی خوبصورتی سے کہنے پر ہی قناعت کرتے ہیں۔

نصیر کی شاعری میں ایک تجربہ جو زیادہ وسعت کے ساتھ آتا ہے وہ ہجرت کا تجربہ ہے۔ نصیر روزگار لسلہ میں کافی عرصہ مشرقِ وسطیٰ میں رہائش پذیر رہے ہیں۔ گھر سے دوری اور بے وطنی کا تجربہ ویسے پنے موضوع میں شدید ہوا کرتا ہے۔ نصیر کے ہاں بھی اس تجربے کی شدت باقی تجربات پر حاوی ہے۔ اظ سے مذکورہ مجموعہ فراقیہ لہجے کی نظموں سے پر ہے جیسا کہ اس مجموعے کے نام سے بھی ظاہر ہے۔ سے واپسی پر وقت کے آگے نکل جانے اور پرانے رشتوں اور تعلقات کی نایافت اس مجموعے کا عمومی بنتا ہے:

تیری نیندوں کے جنگل میں
مرے خوابوں کا رستہ تھا
ترا چہرہ کتابی تھا
مرے ہاتھوں میں بستا تھا
(لڑکپن کتنا اچھا تھا!)

آنکھیں جب
خوابوں سے خالی ہوں
تم لکھنا
میرا نام ہتھیلی پر
اور مٹا دینا......!
(خالی پن مشورہ)

سفر کے خواب میں
آنکھیں کہیں پیچھے ہی رہ جاتی ہیں
چہرے ساتھ چلتے ہیں

(سفر رکتا نہیں)

نصیر احمد ناصر کی پوری شاعری میں خواب کے لفظ کی بہت تکرار ہے۔ ان کے تینوں مجموعوں میں لفظ "خواب" بکثرت استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہ "خواب' کوئی بڑی علامت نہیں بن پایا اور نہ ہی بہت متنوع اور وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ اس پورے عہد میں خواب علامتاً" استعارة" اور تشبیہ کے طور پر بہت زیادہ استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کے استعمال کی اپنی ایک موضوعیت اور نفسیات ہے۔ لیکن نصیر کے ہاں خواب کا لفظ اکثر اوقات ذاتی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

خواب میں پیدا ہوا
خواب میں زندہ رہا
خواب ہی میں مر گیا

داؤد رضوان

تھکن (افسانے)

تصنیف: نزہت زہرا گردیزی
قیمت: ۵۰ روپے
ناشر: گورا پبلشرز، لوئر مال، لاہور۔

"تھکن" زہرا گردیزی کے اردو افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں خواتین افسانہ نگاروں کی ایک بہت مضبوط اور وقیع روایت موجود ہے۔ اردو افسانے کے آغاز سے ہی ہمیں خواتین افسانہ نگاروں کے کئی معتبر نام ملتے ہیں۔ ڈاکٹر رشیدہ جہاں، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور قرۃ العین حیدر وغیرہ۔ موجودہ دور میں بھی خواتین افسانہ نگاروں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ شاعری کے مقابلے میں افسانے کے میدان میں خواتین نے زیادہ نام کمایا ہے۔ چند خواتین کے نام تو رجحان ساز افسانہ نگاروں کے زمرے میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔

چند ایک خواتین کو چھوڑ کر دیگر تمام افسانہ نگار خواتین میں ایک رو جو مرکزی حیثیت رکھتی ہے، وہ ہے مرکزی کردار کا عورت ہونا۔ عورت سے متعلق مسائل کو ان تمام خواتین نے عورت کے نقطہ نظر سے ہی دیکھا اور سمجھا ہے۔

نزہت زہرا کے افسانوں کا سب سے بڑا کمال یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں مرکزی حیثیت صنف یا جنس کی نہیں بلکہ فرد کی ہے۔ مخصوص معاشرتی تناظرات میں محض عورت ہی مجبور و مقہور نہیں ہے۔ مرد بھی اتنا ہی بے بس نظر آتا ہے جتنی کہ عورت۔ ان کے افسانوں میں مخصوص نسائی یا عورت

کے نقطہ نظر سے مردانہ نفسیات کے مطالعے کی بجائے فرد کی فردیت کو معروضی تناظر میں دیکھا اور سمجھا گیا ہے۔

نزہت زہرا کے افسانوں کا بنیادی موضوع معاشرتی تضادات کا المیہ ہے۔ جس کا شکار درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والا فرد ہے۔ اور اس حوالے سے نزہت نے اپنے آپ کو کسی جغرافیے میں قید نہیں کیا۔ ان کے ہاں یہ مطالعہ اور مشاہدہ برصغیر کی حدود سے نکلتا ہوا خلیج کی حدود کو چھو آتا ہے۔ یہ افسانے پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ تیسری دنیا کے باسیوں کی نفسیات ہی کچھ اس طرح مرتب ہو چکی ہے کہ صدیوں کے جبر نے انہیں غصے اور نفرت کا عادی بنا دیا ہے۔ اور اس غصے یا نفرت کا شکار کوئی اجتماعی دشمن نہیں بلکہ اپنے ہی لوگ ہیں۔ ان تمام معاشروں میں محبت کی جگہ نفرت نے لے لی ہے۔

نزہت زہرا نے اپنے افسانوں میں اظہار کے لیے بیانیہ طریقہ کار پسند کیا ہے۔ بیانیہ طریقہ کار کا ایک اپنا ایک حسن ہے۔ خصوصاً" ۱۹۸۰ء کے بعد افسانے میں کہانی پن اور بیانیہ طرز اظہار کی واپسی ہوئی ہے۔ مگر یہ نیا طریقہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے بیانیہ افسانے کی تیکنیک سے مختلف ہے۔ اس جدید بیانیہ افسانے میں پہلے بیانیہ طرز اظہار کے دور اور علامتی اور تجریدی دور کی تخلیقی آمیزش سے ایک نیا انداز وجود پذیر ہوا ہے۔ لیکن نزہت کے افسانوں کا بیانیہ پن پہلے دور کے بیانیہ طرز سے مماثل ہے۔ جو کہیں کہیں اتنا سیدھا ہے کہ اس میں سے تخلیقی عنصر منہا ہو گیا ہے۔ اس تخلیقی عنصر کے منہا ہونے سے یہ افسانے بعض جگہوں پر صحافتی کالم کا سا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ نزہت کے افسانوں کے موضوعات جتنے بھرپور ہیں ان کے اظہار کے پیرائے پر بھی اتنی ہی محنت کی ضرورت ہے۔

اس مجموعے میں دو افسانے "سقوط جاں" اور "تھکن" پاکستان کے دولخت ہونے کے المیے سے متعلق ہیں۔ آج اس موضوع پر کسی نئے افسانہ نگار کا قلم اٹھانا حیرت سے ضرور دوچار کرتا ہے۔ تاہم یہ ایک قرض ہے جو شاید کئی نسلیں بھی نہ اتار سکیں۔ نزہت زہرا نے کسی حد تک اس قرض کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ افسانے اردو ادب کی تاریخ میں یقیناً نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

"تھکن" افسانے کا موضوع دوہری بے وطنیت کے شکار بہاریوں کے اجتماعی المیہ کی کہانی ہے۔ جبکہ "سقوط جان" ایک بنگالی لڑکے اور ایک پنجابی لڑکی کے مابین محبت کے جذبوں میں گندھی کہانی ہے جو اپنی معراج کو پہنچنے سے قبل ہی ۱۶' دسمبر ۱۹۷۱ء کو اپنے غیر منطقی انجام تک پہنچی اور اس محبت کا اظہار چودہ سال بعد ہوا۔ یہ افسانہ اس مجموعے میں سب سے زیادہ بھرپور' تاثر انگیز اور مضبوط بنت کا خوبصورت افسانہ ہے جو زہرا کے فنی سفر کے روشن مستقبل کی واضح ضمانت بنتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

داؤد رضوان

ناصر کاظمی --- شخصیت اور فن

مصنفہ: ناہید قاسمی
قیمت: ۸۵ روپے
ناشر: فضل حق اینڈ سنز، لاہور۔

"ناصر کاظمی -- شخصیت اور فن" ناہید قاسمی کا تحقیقی مقالہ ہے جو انہوں نے ایم اے (اردو) کے لیے لکھا۔ یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ناصر کاظمی کے حالات زندگی کا تفاصیل اور ان کی شخصیت کو ایک خاص آب و رنگ عطا کرنے والے واقعات و محرکات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ناصر کاظمی نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہیں اور نثر بھی لکھی لیکن ان کی ادبی شناخت ان کی غزل ہی سے ہوئی۔ ناصر کاظمی کی غزل کا جائزہ لینے سے قبل ضروری تھا کہ ولی سے قیام پاکستان تک، اردو غزل کے سفر کے ارتقائی مراحل کی داستان اور عہد بہ عہد پیدا ہونے والے تغیرات کو بیان کیا جائے، تاکہ ناصر کی غزل کی تفہیم کے لیے ایک پس منظر قائم ہوسکے، چنانچہ مقالے کے دوسرے باب کا موضوع یہی کچھ ہے۔ ناصر کاظمی کا تعلق شاعروں کے اس گروہ سے ہے جو قیام پاکستان کے فوراً بعد منظر عام پر آیا۔ ۱۹۴۷ء تک، خاص سماجی اور معاشرتی حالات کے سبب نظم کے مقابلہ میں، غزل دبی دبی دکھائی دیتی ہے۔ تحریک آزادی کو آگے بڑھانے اور مخصوص سیاسی اور قومی نقطہ ہائے نظر کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے نظم اپنے وضاحتی پیرائیہ اظہار کے سبب غزل کے مقابلہ میں، جو اشاریت اور ایمائیت کا فن ہے، زیادہ موثر وسیلہ ثابت ہوئی۔ ناصر کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو غزل کو اس کے کھوئے ہوئے مقام مقبولیت پر دوبارہ فائز کیا، گویا ایک اعتبار سے ناصر کاظمی نے اردو غزل کو نئی زندگی عطا کی۔ تیسرے باب میں "غزل کی حیات نو" کے عنوان سے اسی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے--- ناصر کاظمی کی غزل کی مقبولیت میں ان خاص ایام کی جذباتی فضا کا بھی بڑا عمل دخل تھا۔ انسانی تاریخ کی ایک بڑی ہجرت کو رونما ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے، عزیزوں سے بچھڑ جانے اور ہنستے بستے گھروں کے مٹ جانے کا دکھ ہر سینے میں تازہ تھا۔ ناصر خود اس ابتلا سے گزرا، ایسے میں جب ناصر نے ایک دکھ بھری لے میں اپنا غم بیان کیا تو ہر شخص کو اس میں اپنے ہی غم کی ترجمانی محسو ہوئی۔ یہ صورت حال میر کے عہد سے کسقدر مماثلت رکھتی ہے۔ میر کے زمانے میں بھی دلی کے گلی کوچے ج بقول میر، اوراق مصور تھے، احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ کے حملوں کے نتیجے میں حزن میں ڈوب گئے تھے او لوگوں کو اپنے گھر بار چھوڑ کر ان مقامات کی طرف ہجرت کرنی پڑی تھی۔ جو نسبتاً محفوظ تھے۔ ناصر کے یہاں می کے لہجے کی بازگشت، کوئی شعوری کاوش نہیں بلکہ ایک جیسے حالات کا لازمی نتیجہ ہے۔ ناصر کاظمی کے علاو بعض دوسرے شاعروں، مثلاً ابن انشا، مختار صدیقی اور شہرت بخاری وغیرہ نے بھی اسی زمانے میں، میر ک لہجے میں بات کرنے کی کوشش کی۔ اسباب چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہوں، یہ دوسرے شاعر، عام مقبولیت می

کاظمی تک نہیں پہنچ پائے۔

مقالہ کے چوتھے باب میں ناصر کاظمی کی غزل کے منفرد محاسن اور پانچویں باب میں ناصر کی نظم اور کی نثر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اگر یہ باب نہ ہوتا تو ناصر کے فن کا جائزہ نامکمل ہی رہتا۔ چھٹے اور آخری باب ان ممکنہ اثرات سے بحث کی گئی ہے جو مستقبل میں اور غزل پر ناصر کے فکر و فن سے پڑ سکتے ہیں۔

ناہید قاسمی خود شاعرہ ہیں اور ایک بڑے افسانہ نگار اور شاعر' جناب احمد ندیم قاسمی کی صاحب زادی ہیں۔ اسی لیے ناہید قاسمی نے نہ صرف یہ کہ ناصر کاظمی کی شاعری بلکہ دوسرے شعراء کی غزل کا جائزہ بھی ئی پسندانہ نقطہ نظر سے لیا ہے۔ ان کی کچھ آرا سے بعض لوگوں کو اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور تنقید میں یہ ئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ناہید قاسمی اپنے نقطہ نظر کو کن دلائل سے مستحکم بناتی ہیں ر وہ اپنی بات کو کس یقین کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ ناہید قاسمی نے ان آراء کا بھی حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ے جو ان کے مخصوص زاویہ نظر سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ بجائے اس کے کہ وہ خود کوئی فیصلہ اپنی طرف ے صادر کریں تمام معاملہ پڑھنے والے پر چھوڑ دیتی ہیں۔

گزشتہ بیس بائیس برس میں بھی ۱۹۷۲ء میں ناصر کی وفات کے بعد سے اب تک ان کی شخصیت اور ن کے بارے میں اور بھی کئی کتابیں لکھیں اور مرتب کی گئی ہیں' جن میں احمد مشتاق کی تالیف "ہجر کا ستارہ" اص طور پر قابل ذکر ہے۔ ناہید قاسمی کا مقالہ اگرچہ بہت پہلے تحریر کیا گیا مگر اسکی اشاعت بہت بعد میں ل میں آئی۔ اس صورت حال کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مواد اور تحریریں جو اس وقت لک غیر مطبوعہ تھیں' اب کم و بیش شائع ہو چکی ہیں۔ مثلاً ناصر کاظمی کی طویل تجرباتی غزل "پہلی بارش" جس قت مقالہ لکھا گیا' شائع نہیں ہوئی تھی مگر اب کتابی شکل میں آچکی ہے۔ مقالہ نگار کا ان ماخذوں تک پہنچنا' و اس وقت تک ہر شخص کی دسترس میں نہیں تھے' اس اعتبار سے قابل قدر ہے کہ اس نے جہاں تک اس کے اختیار میں تھا' اپنے مقالہ کو جامع بنانے کی کوشش کی۔ اس مقالہ کی اشاعت سے قبل' ناصر کے بارے میں کم از کم تین اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں' لیکن ایک لحاظ سے اس مقالہ کو دوسری کتابوں پر برتری حاصل ہے اور وہ یہ کہ یہ ناظر کاظمی کے بارے میں لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ گویا اس مقالہ سے "ناصر شناسی" کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ جب مستقبل میں ناصر کاظمی کے بارے میں گفتگو ہوگی تو اس اولین تحریر کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

ناہید قاسمی چونکہ خود شاعرہ ہیں اس لیے مقالہ لکھتے ہوئے بعض اوقات وہ ایسی عبارت لکھ جاتی ہیں جن کو شاعرانہ نثر کا نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ اقتباسات دیکھیے:

> "غالب تغیر اور جدت سے خائف نہیں تھے بلکہ دلدادہ تھے' انہیں جب دور دور تک کھنڈروں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا تو انہوں نے ان کھنڈروں میں ہی سے چراغ جلا دیئے اور ان کی اونچی رقصاں لوؤں کی روشنی میں جہاں پرانے پن کی خوبیاں اور خامیاں نمایاں ہوئیں' وہیں نئے پن کی اچھائیاں بھی اجاگر

ہونے لگی۔ل"

> "ناصر کاظمی کو رومانوی شاعر کہا جاتا ہے لیکن اس رومانویت کی دھند کے
> پیچھے حقیقت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ ناصر کے لیے حساس اور باشعور لوگ
> ہی ایسے ہوتے ہیں جو اس سمندر کا شور بھی سن سکیں ورنہ تو رنگ برنگ دھند
> ہے اور کچھ نہیں۔"

ایک اور خوبی جو اس مقالہ میں موجود ہے، وہ یہ ہے کہ اس حوالے سے اس کتاب میں ناصر کلام کے بہترین اجزاء یک جا ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگ جن کو تنقیدی مباحث سے چنداں لگاؤں نہیں، وہ ا چاہیں تو عبارات کو چھوڑ کر، صرف شعروں سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر توصیف تب

آدمی غنیمت ہے (کرداری خاکے)

مصنف: سید انیس شاہ جیلانی
قیمت: ۵۰ روپے
ناشر: مبارک اردو لائبریری، محمد آباد، تحصیل صادق آباد، ضلع رحیم یار خان

بارہ معروف افراد کے مزاج و کردار کے یہ تجزیے ایک گوشہ نشین مگر بے حد سرگرم او شخصیت، سید انیس شاہ جیلانی نے لکھے ہیں اور بڑے جذبے اور جرات سے لکھے ہیں۔ خود مصنف ابتدائیے میں تحریر کیا ہے کہ "اردو خاکے کا مزاج کیا ہے؟ مجھے اس سے بحث نہ یہ میرا منصب، تاہم ا اچھی پیاری پیاری اور روح فرسا اور دلاویز یادوں کو تھوڑا سا را ایکجا کر دینے کا نام بھی خاکہ ہو سکتا ہے ------ "یہ روح فرسا اور دلاویز" والی بات دل کو لگتی ہے کہ یہ خاکے پڑھ کر بعض شخصیات سے ہونے لگتا ہے اور بعض سے شکایت پیدا ہونے لگتی ہے کہ وہ ایسے کیوں تھے جبکہ اس سے مثبت طور پر مختا بھی ہو سکتے تھے۔ ان شخصیات میں سے شاہد احمد دہلوی، نیاز فتحپوری، غلام رسول مہر، رئیس امروہوی، ا القادری، زاہدہ حنا، ڈاکٹر محمد ایوب قادری اور رئیس احمد جعفری سے تو ادب سے دلچسپی رکھنے والے متعارف ہیں مگر تعارف کا جو انداز سید انیس شاہ نے اختیار کیا ہے وہ دلچسپ بھی ہے، منفرد بھی ہے ا انکشاف خیز بھی ہے۔ حیرت شملوی، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، ضیاء الدین برنی اور مصنف کے و گرامی سید مبارک شاہ جیلانی سے قارئین کا تعارف مکمل نہیں ہو گا مگر سید انیس شاہ نے اسے مکمل کر ہے۔ سبھی خاکے دلچسپ اور دلاویز ہیں البتہ زاہدہ حنا کا خاکہ "دلاویز" ہونے کے ساتھ ہی بعض مقامات "روح فرسا" بھی معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ کتاب ہر صاحب ذوق کی لائبریری میں ہونی چاہیے۔

احمد ندیم قا

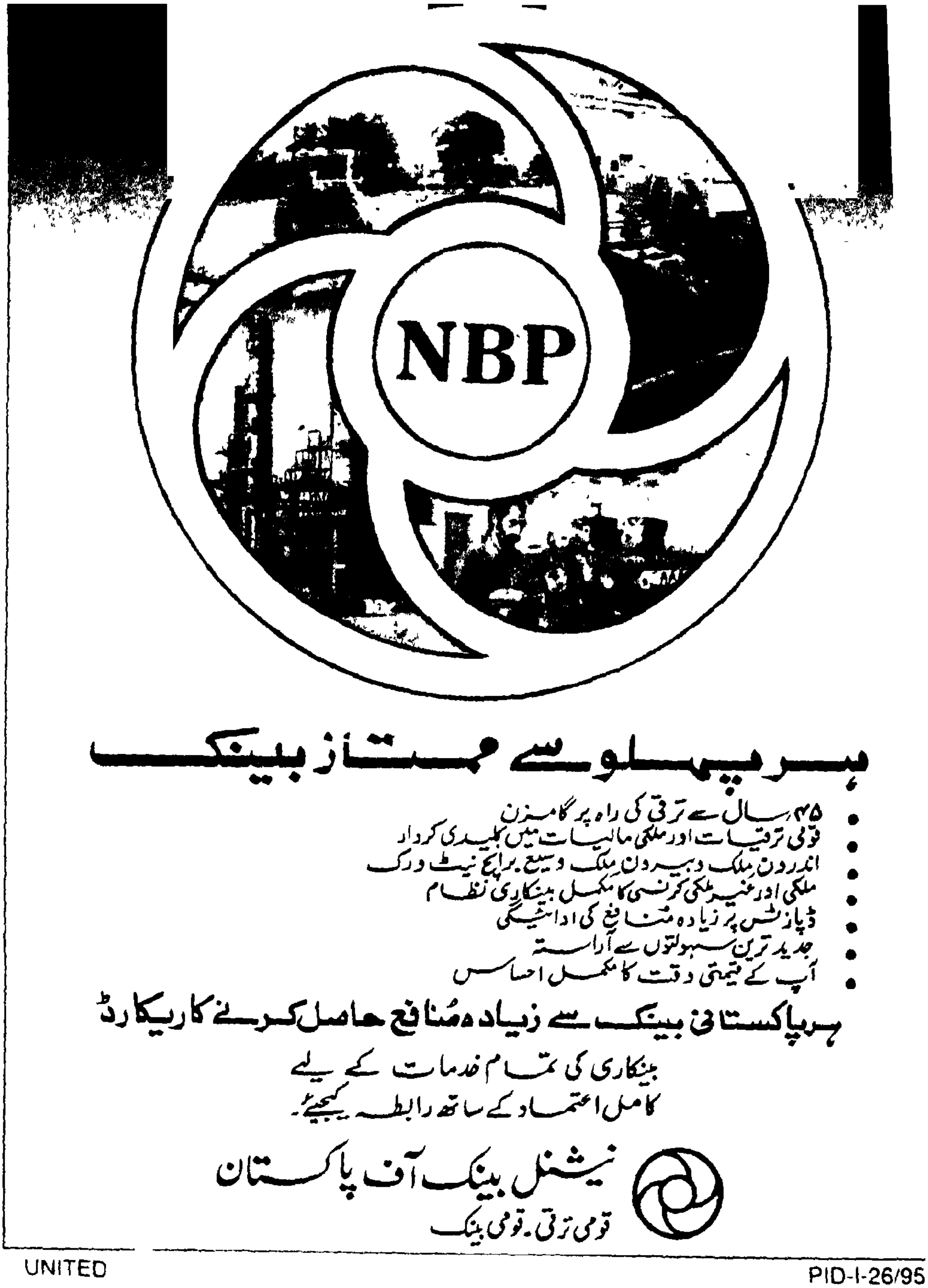

ہر پہلو سے ممتاز بینک

- ۴۵ سال سے ترقی کی راہ پر گامزن
- قومی ترقیات اور ملکی مالیات میں کلیدی کردار
- اندرون ملک و بیرون ملک وسیع برانچ نیٹ ورک
- ملکی اور غیر ملکی کرنسی کا مکمل بینکاری نظام
- ڈپازٹس پر زیادہ منافع کی ادائیگی
- جدید ترین سہولتوں سے آراستہ
- آپ کے قیمتی وقت کا مکمل احساس

ہر پاکستانی بینک سے زیادہ منافع حاصل کرنے کا ریکارڈ

بینکاری کی تمام خدمات کے لیے
کامل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجیے۔

نیشنل بینک آف پاکستان
قومی ترقی۔ قومی بینک

UNITED

PID-I-26/95

نیو ایج

کیبلز

پاکستان میں بجلی کے

بہترین،

قابلِ اعتماد

اور

معیاری

تار بنانے والے

گلبرگ، لاہور

Lift with strength. Lift with Chaudhri Wire Rope.

The leading manufacturers of wire rope in Pakistan

Chaudhri Wire Rope Industries Limited

MANUFACTURERS OF
STEEL WIRE ROPES
STRANDED WIRE
EARTH WIRE
OHGW, GUY WIRES
WIRE ROPE SLINGS ETC.

CHAUDHRI WIRE ROPE
A SYMBOL OF QUALITY

1st Floor 38 Nishtar Brandreth
P.O. Box No. 1505 LAHORE
Factory: G.T. Road Muridke
Lahore Pakistan)
GRAMS: "WIREROPE
TELEX: CWR PK 46[illegible]
PHONES: 56168 312802

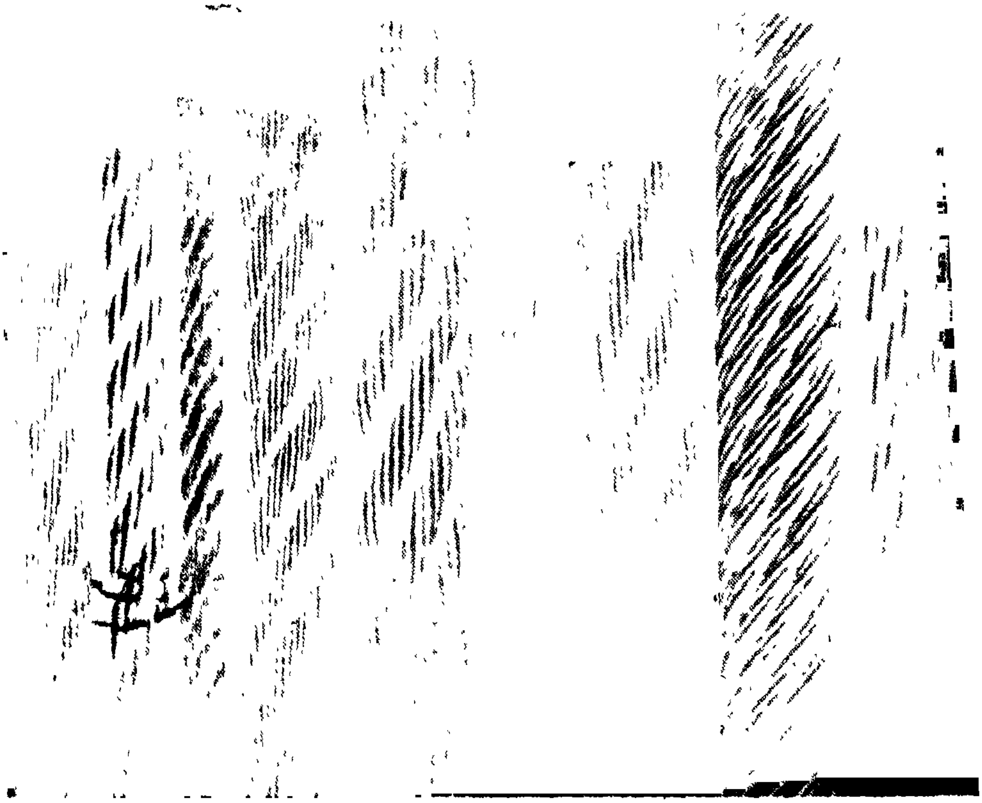

SCA

بجلی کے میٹر

اب
پاکستان میں ہی
تیار ہوتے ہیں

- گھریلو استعمال کے لیے بجلی کے میٹر
- صنعتی مقاصد کے لیے بجلی کے میٹر
- کے وی اے آر ایچ اور میکسیمم ڈیمانڈ میٹر

ان سب کے لیے اور دوسرے ہر طرح کے میٹروں کیلئے رجوع فرمائیں

سیّد بھائیز، فیروزپور روڈ، لاہور

عمدہ کام کی گارنٹی - مفت سروس اور نقص کی صورت میں تبدیلی
کی ضمانت

پاکستان کی تازہ دم غزل گو

یاسمین گل

کی تر و تازہ، منفرد اور بے مثال غزلوں نظموں کا مجموعہ

اعتراف

جو حسن بیان کے علاوہ حسن طباعت کا بھی
لاجواب نمونہ ہے
سرورق خود مصنفہ کے موقلم سے
قیمت: ۱۲۰ روپے

اساطیر پبلشرز۔ ۴۵۔ اے مزنگ روڈ، لاہور

گھنٹی

دور حاضر کی نامور افسانہ نگار

نیلوفر اقبال

کے ان افسانوں کا پہلا مجموعہ
جنہوں نے جدید اردو افسانہ نگاری کا رجحان ہی بدل دیا
نیلوفر اقبال کے یہ افسانے منٹو، کرشن،
بیدی اور غلام عباس کی قائم کردہ روایات
کی بازیافت کی دلفریب مثالیں ہیں
دیدہ زیب سرورق
معیاری طباعت

"اساطیر" کی طرف سے ایک اور تحفہ
قیمت: ۱۶۰
اساطیر، ۴۵۔ اے مزنگ روڈ، لاہور

احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر پبلشر نے محمد شریف کے اہتمام سے طفیل آرٹ پرنٹرز ۱۸ سرکلر روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر "فنون" ۴۵۔ اے مزنگ رو
سے شائع کیا

always count on

KISTAN STEEL

its Expertise and

Quality Products

PAKISTAN STEEL is a plant using modern technology to produce iron and steel products for primary and end-use applications. Not only do we have the facilities but we also have the trained manpower which knows how to use them Our operational staff has invested countless hours in mastering the continually-improving metallurgical technologies We are proud of the professionalism of our people

PAKISTAN STEEL quality is quality you can trust Whether it be Pig Iron, Billets, H R Products, C R. Products, or Galvanized Products, you always get the best buy for your money from PAKISTAN STEEL.

You can count on PAKISTAN STEEL now and in the future also We recognise the customer's needs for products that meet highest worldwide standards at competitive prices We are committed to long term strategies that will make sure you get the products and the services which you demand and deserve, year after year

You can depend on PAKISTAN STEEL to help you build better end-use products

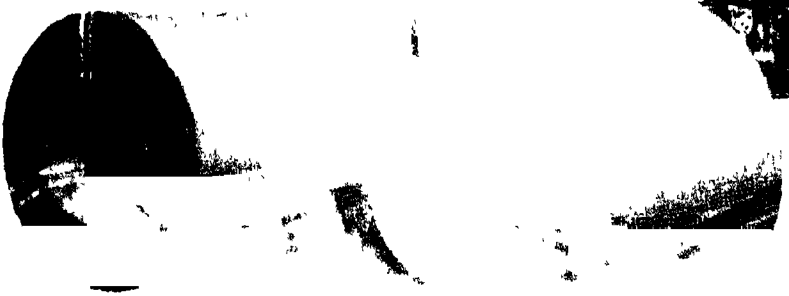

PAKISTAN STEEL

Building the nation - Serving the nation

PID (Islamabad)

REGD. L. No. 7579 THE "FUNOON" QUARTERLY Phone No. 631576

بہترین ذائقے کی عظیم الشّان روایت

رُوح افزا

مشروبِ مشرق

مفرّح پھلوں، مؤثر جڑی بوٹیوں، صحت بخش سبزیوں
اور شاداب پھولوں سے تیار کیا جانے والا
حکمت و مہارت کا شاہ کار، رُوح افزا، جسم و جاں کو گرمی کی
شدّت سے محفوظ رکھتا ہے، تازگی اور توانائی بخشتا ہے۔
مخصوص و منفرد ذائقے اور بے مثال خواص کی
وجہ سے خوش ذوق شائقین کی اوّلین پسند رُوح افزا
- اس صدی کا سب سے بہتر مشروب

رُوحِ ثقافت
رُوح افزا

ہمدرد

مَدینۃُ الحکمۃ، تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ

آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعات ہمدرد خریدتے ہیں جائز منافع سے بین الاقوامی
شہر علم و حکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں